دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جنوری تا جون 2020ء / جمادی الاولیٰ تا ذوقعدہ ۱۴۴۱ھ   جلد نمبر 12   شمارہ نمبر 2-1   رجسٹرڈ نمبر S-370

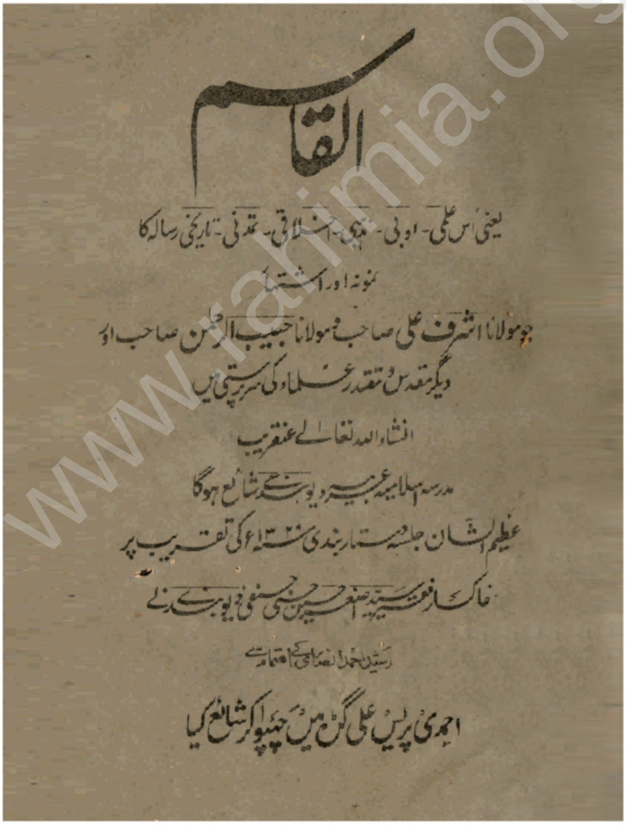

القاسم

یعنی اس علمی - ادبی - مذہبی - اخلاقی - تمدنی - تاریخی رسالہ کا

نمونہ اور اشتہار

جو مولانا اشرف علی صاحب و مولانا حبیب الرحمن صاحب اور

دیگر مقدس و مقتدر علماء کی سرپرستی میں

انشاء اللہ تعالے عنقریب

مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند سے شائع ہوگا

عظیم الشان جلسہ دستار بندی سنہ ۱۳۲۸ھ کی تقریب پر

خاکسار عبد سید اصغر حسین حسینی دیوبندی نے

رشید احمد انصاری کے اہتمام سے

احمدی پریس علی گڑھ میں چھپوا کر شائع کیا

www.rahimia.org

RAHIMIA INSTITUTE OF QURANIC SCIENCES (TRUST) LAHORE PAKISTAN

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی

’’اس وقت تلک جو جو ستم و جفا مدعیانِ اسلام کے ہاتھ سے دینِ اسلام پر ہو چکا ہے، سچے اسلام کی نیست و نابود ہوجانے کے لیے کافی سے بھی زائد ہے۔ چناں چہ ادیانِ صادقہ گزشتہ مردہ سب اس کی زندہ نظیر ہیں۔ مگر اُسی مربیؐ شفیق اور مخبرِ صادقؐ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ:

’’ہر چند اسلام کے اندر اخیر زمانے میں سب ادیانِ سابقہ سے زائد اختلافات و فتنے ظہور پذیر ہوں گے، مگر حق تعالیٰ کی رحمت سے یہ ہوگا کہ ایک جماعت ہر قرن میں ایسی بھی موجود رہے گی کہ اسلام کی حمایت اور اُس کے احکام کی حفاظت سچے ذریعے سے کرتی رہے گی اور دربارہ دینِ اسلام وہ جملہ اہلِ باطل پر غالب رہے گی۔ اُن کی وجہ سے احکامِ الٰہی اور دینِ اسلام اہلِ باطل اور اہلِ فتنہ کے تصرفات سے محفوظ رہیں گے۔ جو جو اختراعات اور غلط باتیں اربابِ جہالت وفتنہ دین میں وقتاً فوقتاً ملاتے رہیں گے، اُن کو وہی جماعت قلیل اپنے اپنے زمانے میں دینِ حق سے ایسے نکالتے رہیں گے، جیسے دودھ سے مکھی یا خمیر سے بال۔ اور اہلِ فتنہ اور اہلِ ضلالت کا اثر اُن کے متبعین ہی تلک محدود رہے گا۔ اسلام کے خط و خال پر اُس کا اثر نہ آنے پائے گا اور اسی غریب جماعت کی حمایت سے بإذن اللہ دینِ اسلام اخیر تلک اپنی اصلی حالت پر محفوظ رہے گا‘‘۔

سو! یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہے، جس کا مشاہدہ برابر ہورہا ہے۔ اور جو کسی دین کو نصیب نہیں ہوا۔ اگر گوشِ حقیقت نیوش ہو تو غریب اسلام آج اپنے دانا دشمن اور نادان دوست کو (یعنی انھیں دونوں قسم کی جماعتوں کو جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے) خطاب کرکے بہ آوازِ بلند کہہ رہا ہے۔ شعر ؂

قتل ایں خستہ بہ شمشیر تو تقدیر نہ بود
ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نہ بود
(تیری تلوار سے قتل ہونا اُس زخمی کے نصیب میں ہی نہیں لکھا تھا
ورنہ تیرے بے رحم دل نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی)‘‘

(دینِ اسلام میں امانت و دیانت کی ضرورت اور اہمیت، ص: 80-81)

www.rahima.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جنوری تا جون 2020ء / جمادی الاولیٰ تا ذوقعدہ ۱۴۴۱ھ | جلد نمبر 12 شمارہ نمبر 1-2 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست	مدیرِ اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
صدر	**مدیر**
مفتی عبدالمتین نعمانی	مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف	لاہور	☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی	سکھر	☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر	جھنگ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر	اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب	☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف	حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ : -/250 روپے

سالانہ زرِ تعاون -/1000 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع وناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ "شعور و آگہی"، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

اداریہ	حرفِ اوّل	مدیرِاعلیٰ	3
مقالاتِ شیخ الہندؒ	وحیٔ الٰہی اور اُس کی عظمت	تحریر: شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ تحقیق وتخریج: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری☆	5
مقالاتِ شیخ الہندؒ	دینِ اسلام میں امانت ودیانت کی ضرورت اوراہمیت	تحریر: شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ تحقیق وتخریج: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری	35
مطالعۂ علومِ قرآنیہ	ترجمہ شیخ الہند ''مُوضحِ فرقانِ حمید'' پر اکابر علما کی تقریظات اورتائیدات	مرتب مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری	89
علمی لیکچرز	''سماجی تشکیلِ نو کے اصول اسوہ حسنہ کی روشنی میں'' خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزادرائے پوری	بہاءالدین زکریا یونیورسٹی کیمپس، لیہ	145
سیاسیات	اسلام کے سیاسی نظام میں عوامی نمائندگی کا تصور	تحریر ڈاکٹر مولانا محمد ناصر☆	171
منظومات	حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کے وصال پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا عربی مرثیہ		229

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسندنشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ ڈاکٹر مولانا محمد ناصر — اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اسلامیات، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، جھنگ

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اوّل

انسانی ترقی کے لیے علوم کی اہمیت سے انکار نہیں۔ علوم و افکار ہی انسانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے آج تک انسانیت کا ارتقا علوم و افکار کا مرہونِ منت رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علوم سے زیادہ اُن کی تفہیم اور تربیت معاشروں کی ساخت کو سنوارتی ہے اور ترقی کی نئی راہیں کھولتی ہے۔ علم کے ذریعے سے انسان چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہے۔ صرف معلومات حاصل کرنا ہی کافی نہیں ہوتا، بلکہ علم کا موقع محل کے مطابق صحیح استعمال اور اُس کی درست تفہیم کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ علمی تفہیم کے ذریعے سے انسان حاصل شدہ علوم کی درجہ بندی کرتا ہے۔ حاصل شدہ علم کی حقیقی نوعیت کیا ہے؟ وہ ظن و تخمین پر مبنی ہے؟ محض اندازہ اور اٹکل ہے؟ وہ عین واقعات کے مطابق ہے؟ اور ان سے کس قدر مطابقت رکھتا ہے؟ پھر کس موقع اور مرحلے پر حاصل شدہ علم کا استعمال کیا جانا چاہیے؟ کس قدر معلومات کا استعمال مفید ہوتا ہے؟ ان تمام سوالات کا صحیح جواب علوم کی تفہیم اور اُس کی اساس پر پیدا شدہ مہارت اور تربیت سے حاصل ہوتا ہے۔

اس لیے دنیا بھر میں انبیا علیہم السلام، حکما، علما، عقلا اور دانش ور علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ اُس کی صحیح تفہیم اور درست تربیتی مہارت کو ضروری قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ علم کے ساتھ ساتھ تفہیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے خود قرآن حکیم کہتا ہے کہ: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ [21- الانبیاء: 69] (ہم نے سلیمانؑ کو فیصلہ کرنا سمجھا دیا، اور دونوں (حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمانؑ) کو ہم نے حکم اور سمجھ عطا کیا تھا)۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''تفہیم'' کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''و حدُّهٗ حالٌ و عزمٌ ينزل من تطابُق الإسم الجامع و النّسمة'' [تفهيماتِ الٰهيه، ج:2،ص:146] (تفہیم انسان کی ایسی حالت اور عزم کو کہتے ہیں کہ جو علوم کے مرکز و منبع پر مشتمل اسمِ جامع اور انسانی وجود کے درمیان نازل ہوتی ہے۔) ایسی تفہیم رکھنے والے حضرات کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''مُفَهَّمِين'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ چناں چہ وہ حضرات انبیا علیہم السلام سے لے کر انسانی معاشروں کے تمام سمجھ دار رہنماؤں کی ''حُجّةُ الله البالِغه'' میں آٹھ اقسام بیان کرتے ہیں۔

انسانی ترقی کے لیے ایسا علم ضروری ہے، جو پُرعزم حالت لیے ہوئے ہو۔ علم کے نتیجے میں ایسی مہارت حاصل ہو، جو انسانی ترقی کے لیے نئی راہیں کھولے۔ ایسی صحیح حالت اور پختہ عزم تبھی حاصل ہوتا ہے، جب حقائق کے مطابق قطعی علم حاصل کیا جائے اور عملی زندگی میں امانت و دیانت کا خُلق بڑی پختگی کے ساتھ موجود ہو۔ اس لیے کہ گرد و پیش میں موجود اشیا کا بڑا گہرا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور انسان اپنے سماج میں قدم قدم پر دوسرے انسانوں کے ساتھ روابط اُستوار کرتا ہے۔ اس طرح گھر کی زندگی سے لے کر بین الاقوامی سماج کی تشکیل تک سیاسی، معاشی اور سماجی معاہدات وجود میں آتے ہیں۔ دیگر انسانوں کے ساتھ خیرخواہی اور اُن کے جان و مال کی دیانت داری سے حفاظت کے بغیر معاشرے ترقی نہیں کرتے۔ علم کی درست تفہیم نہ ہو اور انسانی سماج سے متعلق دیانت داری کا عنصر نہ ہو، بلکہ بددیانتی پائی جاتی ہو تو ایسا معاشرہ کبھی ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتا۔

برطانوی سامراج کے برعظیم پاک و ہند پر تسلط کے بعد اس خطے کی اقوام پر علمی غلامی اور عملی بددیانتی کے فروغ کا جو نظام وجود میں آیا، اس نے خطے کی اقوام کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رُکاوٹ کھڑی کی۔ انسانیت کی ترقی کا قطعی علم انبیا علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحی سے حاصل ہوتا ہے۔ غلامی کے دور میں وحیٔ الٰہی کی عظمت کو دُھندلا دینے کے بہت سے حربے اختیار کیے گئے۔ علم کی تفہیم کے لیے جس دیانت داری اور امانت کی ضرورت تھی، اُس میں شکوک وشبہات پیدا کرنے، بلکہ اُسے سِرے سے ختم کرنے کے اقدامات کیے گئے۔ بددیانتی پر مبنی سیاسی، معاشی، انتظامی اور عدالتی نظام قائم کیے گئے۔

ایسے ماحول میں انبیا علیہم السلام کے سچے جانشین، علمائے ربانیین، بالخصوص ولی اللّٰہی سلسلے کے علما اور مجددینِ ملت نے علومِ نبوت کی حفاظت، وحیٔ الٰہی کی عظمت اور امانت و دیانت کی اساس پر رجالِ کار تیار کرنے کے لیے بڑی جدوجہد اور کوشش کی۔ ان حضرات میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایک جامع، منفرد اور اولوالعزم شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور اُس کے لیے متحرک اور انقلابی شخصیات کو ایک اجتماعیت کی صورت دے کر برعظیم پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کو یقینی بنانے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا تو دوسری طرف غلامی کے پیدا کردہ پیچیدہ علمی اور فکری مسائل کا توڑ کرنے کے لیے انبیا علیہم السلام کے علومِ نبوت کی حفاظت کے لیے بڑا علمی کردار ادا کیا۔

اگر ہم 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد کی صورتِ حال دیکھیں تو اس دور میں انگریز سامراج کی جانب سے دینِ اسلام کی تعلیمات میں شکوک وشبہات اور ظنون واوہام پیدا کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مسلمانوں ہی میں سے ایسے متجدِّدین (خودساختہ مجدد) کو شہرت دی گئی، جنھوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر دینِ اسلام کی تفہیمِ علمی کا جنازہ نکالا۔ مذہب کے نام پر علم کا شور وشغب برپا کیا گیا، لیکن حقیقت میں شکوک وشبہات کے بیج بوئے گئے۔ ظاہری طور پر اسلام کا نعرہ اور عملی طور پر بددیانتی اور دھوکا دہی کے نظام کی مدد کی گئی۔ اس ماحول میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اپنے اشہبِ قلم کو حرکت دی اور دو اہم ترین مقالات آپؒ کے حکمت رقم قلم سے وجود میں آئے، جو حضرتؒ ہی کی سرپرستی میں جاری کردہ ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند میں طبع ہوئے۔

اس شمارے میں حضرت شیخ الہندؒ کا تحریر کردہ پہلا مقالہ ''وحیٔ الٰہی اور اُس کی عظمت''، تحقیق وتخریج اور عناوین کے بعد شاملِ اشاعت ہے۔ اس مقالے میں حضرت شیخ الہندؒ نے وحی کی حقیقت اور اس کی عظمت کو بڑے مدلل انداز میں واضح کیا ہے۔

دوسرا مقالہ ''دینِ اسلام میں امانت و دیانت کی ضرورت اور اہمیت'' بھی حضرت شیخ الہندؒ کا ہی تحریر کردہ ہے۔ حضرتؒ نے اس میں حدیثِ نبوی ﷺ: ''لا إیمان لمن لا أمانة لهٗ'' (جس میں امانت نہیں، اُس کا ایمان نہیں) کے تناظر میں بڑی جامع اور مفصل گفتگو کی ہے۔ اس طرح انسانی ترقی کے لیے وحیٔ الٰہی پر مبنی علوم اور امانت اور دیانت کی ضرورت واہمیت کو واضح کیا ہے۔

تیسرا مقالہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم پر علما کی تقریظات پر مشتمل ہے۔ چوتھا اہم مقالہ ''اسلام کے سیاسی نظام میں عوامی نمائندگی کا تصور'' کے عنوان سے ہے۔ اور پانچواں مقالہ ایک یونیورسٹی میں دیے گئے خطاب پر مشتمل ہے۔ آخر میں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے وصال پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا ایک عربی مرثیہ بمع اردو ترجمہ (از حضرت مولانا اعزاز علیؒ) شاملِ اشاعت ہے۔ یاد رہے کہ زیرِ نظر مجلّہ ''شعور وآگہی'' دو شماروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضخیم ہے۔ (مدیرِ اعلیٰ)

مقالاتِ شیخ الہندؒ

وحیٔ الٰہی اور اُس کی عظمت

تحریر: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ
تحقیق و تخریج: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

حرفِ تعارف

برعظیم پاک و ہند پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی شہنشاہیت اور سامراجیت کے تسلط کے بعد اس خطے میں علومِ نبوت کے خلاف مادہ پرستی پر مبنی افکار و خیالات پھیلانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی طرح انسانی زندگی جس وصفِ امانت سے ممتاز ہو کر عملی طور پر معاشرے کی ترقی کے لیے کردار ادا کرتی ہے، غلامی کی اس سیاہ رات میں اُسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ وحیٔ الٰہی پر مبنی انبیا علیہم السلام کے علوم اور اُن کی سیرت پر مبنی اوصاف؛ امانت اور دیانت کے برخلاف یہاں کا عملی طور پر تعلیمی، سیاسی اور معاشی نظام بنایا گیا۔ خاص طور پر 1835ء میں لارڈ میکالے کے تجویز کردہ نظریۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم میں وحیٔ الٰہی پر مبنی علوم کو سِرے سے نظرانداز کر دیا گیا۔ اور عملی طور پر بددیانتی اور دھوکا دہی پر مبنی سامراجی نظام کے لیے آلۂ کار افراد تیار کرنے کے لیے امانت و دیانت کے خاتمے کی سوچ کو پروان چڑھایا گیا۔ برطانوی سامراج کے برعظیم پاک و ہند پر دوسو سالہ تسلط کا خلاصہ: (۱) علمی طور پر وحیٔ الٰہی سے جہالت اور (۲) عملی طور پر بددیانتی اور دھوکا دہی کے دو اُمور پر مشتمل ہے۔

ولی اللّٰہی جماعت کے علمائے ربانیینؒ نے جہاں سامراج کے سیاسی اور معاشی نظام کے خلاف آزادی اور حریت کے حوالے سے عظیم جدوجہد کی اور اُس کے سیاسی و معاشی حملے کے مقابلے پر رجالِ کار تیار کر کے اجتماعی جدوجہد کی داغ بیل ڈالی، وہیں انسانی آزادی اور حریت کی سوچ اور فکر پیدا کرنے والی انبیا علیہم السلام کی وحیٔ الٰہی پر مبنی حقیقی تعلیمات کی تعلیم و تربیت کے لیے علومِ نبوت پر مشتمل دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ علومِ نبوت کے ساتھ مسلمان جماعت کے تعلق کو مضبوط کرنے کے ساتھ ساتھ دھوکا دہی اور بددیانتی کے مقابلے میں انبیا علیہم السلام اور اُن کے متبعین کے قلوب سے منتقل ہونے والی امانت اور دیانت کے وصف کو اپنے متعلقین کے قلوب میں راسخ کیا۔ اس حوالے سے برطانوی سامراج کی طرف سے جو شکوک و شبہات اور ظلوم و جہول کا نظریۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم قائم کیا گیا، ولی اللّٰہی جماعت نے اُس کی مزاحمت کرتے ہوئے دینی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ نظام قائم کیا، جس کی اَساس؛ شریعت، طریقت اور سیاست پر اُستوار کی گئی۔

اس تعلیم و تربیت اور دارالعلوم دیوبند کے حریت پسندانہ کردار کے نتیجے میں جو فضلا اور علما اور تربیت یافتہ افراد تیار ہوئے، اُن میں مزید تنظیمی اجتماعیت پیدا کرنے کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ۲۷ / رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ / 13 / اکتوبر

www.rahimia.org

1909ء کو ''جمعیت الانصار'' قائم کی۔ جس کے پہلے ناظمِ اعلیٰ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ منتخب ہوئے۔ ''جمعیت الانصار'' کے قیام کا پسِ منظر بیان کرتے ہوئے حضرت سندھیؒ لکھتے ہیں:

''اس وقت مسلمانوں کو یہ دِقت کا سامنا ہے کہ حفاظتِ اسلام اور اشاعتِ مذہب کے واسطے جا بجا انجمنیں تو قائم ہوگئیں اور ان میں واعظ بھی مقرر کیے گئے، مگر کام کے واعظ نہیں ملتے۔ نہ واعظ بننے کے لیے تحصیلِ علم اور کسی قسم کی سند کی ضرورت باقی رہی ہے۔ نہ واعظوں کے لیے خاص ان اوصاف کے ساتھ متصف ہونا شرط ہے، جن کی ضرورت ایک ایسی جماعت کو ہے، جو ''رہبر'' اور ''ہادی'' و ''مبلغ'' ہو کر نکلی ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر ''او خویشتن گم است کرا راہبری کند'' (وہ خود گمراہ ہیں، دوسروں کی کیا رہبری کریں گے؟) کے مصداق ہوتے ہیں۔

علیٰ ہذا تصنیف و تالیف کا صیغہ (شعبہ) بھی ایسا عام ہو گیا کہ مصنف بننے کے واسطے ذی علم ہونا بھی شرط نہیں رہا۔ جو شخص اُردو میں کچھ لکھنے پڑھنے پر قادر ہے، اس کو مصنف بن جانے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ... تماشا ہے کہ کسی فن میں تصنیف کرنے کے واسطے اس فن کی واقفیت شرط ہوتی ہے، لیکن خاص مذہبی معاملات میں یہ شرط کسی درجے میں بھی ملحوظ رکھنے کے قابل نہیں ہے۔ حدیث کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو، محدثین کی اصطلاحات سے واقفیت نہ ہو، تفسیریں نہ دیکھی ہوں، مفسرین کے اقوال و ماخذ پر نظر نہ ہو، مگر کسی حدیث کو رَد اور قبول کرنے کے لیے اپنا ذہنی معیار کافی سمجھا جاتا ہے۔ مفسرین کے تمام اقوال کا یک لخت بُرے پیرائے میں رد کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ (وہ اقوال) ان کی رائے کے خلاف ہے۔...

ان تمام خرابیوں کا انسداد اور سدِ باب ہو سکتا ہے تو اس طرح کہ مسلمانوں کے تمام مذہبی سلاسل کا انتساب و اِرتباط کسی ایک مرکز سے قائم ہو جاوے۔ ان کی دینی قوت مجتمع ہو جاوے۔ ... اگر مسلمان کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو اپنے مذہب کا پاس ہے، وہ اپنے مذہب کی اشاعت میں کچھ حصہ لینا چاہتے ہیں، وہ اپنے پاک مذہب کو اغیار کے حملوں سے بچانے کو فرض خیال کرتے ہیں، اگر وہ اشاعتِ اسلام کو صحیح طریقہ پر وسعت دینا ضروری جانتے ہیں، اگر ان کو یہ خیال ہے کہ ان میں مستند اور معتبر لائق اقتداء نمونہ سلف علماء پیدا ہوں اور ان میں لائق متدیّن ذی استعداد خوش بیان واعظ بہ کثرت پائے جائیں، ان میں متکلم و مناظر جماعت کی کمی نہ رہے، تو ان کے لیے بہت ضروری ہے کہ جس قدر ممکن ہو، تمام دینی ضروریات کو کسی مذہبی دارالعلوم سے وابستہ اور منسلک کریں اور اس کے ماتحت ہر قسم کے مذہبی اور اسلامی علوم کی تعلیم گاہیں قائم کریں''۔ (1)

''جمعیت الانصار'' نے ان درج بالا مقاصد کے حصول اور ان کی اشاعت کے لیے ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس میں اکابرین علمائے محققین کے مضامین شائع ہونے لگے۔ اس کے پہلے شمارے میں ''القاسم'' کی اشاعت کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ (سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند) لکھتے ہیں:

''معاشرت اور تمدن، مہذب اور ترقی یافتہ اقوام کا معیارِ ترقی ہے۔ اسلام نے جیسے اُصول اس کے قائم کیے ہیں، کوئی مذہب ایسے پیش نہیں کرسکا۔ دنیا نے باوجود ہر قسم کی ترقیات کے انھی اصولوں کو رہنما بنایا ہے۔ معاشرت

www.rahimia.org

اور تمدن میں جہاں اَبنائے جنس (انسانوں) کے ساتھ باہمی معاملات کو اسلامی اصول کے موافق بتلانے کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے زیادہ حاکم و محکوم کے تعلقات اور اُس کے متعلق اسلام کے مقرر کردہ بے مثل اُصول و قواعد بتلانے کی حاجت ہے۔ خصوصاً ایسے زمانے میں، جب کہ عام کوشش سے اس تعلق کو ضعیف کرنے کی ہزار ہا تدابیر کی جاتی ہوں''۔ (2)

اس موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے ماہنامہ ''القاسم'' کے لیے رہنما اصول بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اپنی پریشانیٔ تقریر سے معذرت کے بعد (رسالہ ''القاسم'' میں چھپنے والے مضامین سے متعلق) دو امر قابلِ عرض ہیں ...: اوّل (اس رسالے میں) وحیٔ الٰہی کے متعلق بہ طور تنبیہ عرض کر دیا جائے، بلکہ علمِ وحی کے علاوہ جو دیگر فنون، فصاحت، بلاغت، تاریخ، کلام وغیرہ کے متعلق مضمون شائع ہوں گے، ان میں بھی اُس فن کے ائمہ اور محققین کے حُسنِ اتباع اور اُن کی عظمت کو ملحوظ رکھ کر تحقیق سے کام لیا جاوے گا انشاء اللّٰہ۔ یہ ہرگز نہ ہوگا کہ بلاوجہ وجیہ (بغیر کسی ضروری وجہ کے) اور بلا تحقیق کسی فن کے ائمہ اور محققین کو مطعون بنا کر اپنی سُرخ رُوئی اور کمالِ علمی کو دوسروں کی نظر میں موجّہ (قابلِ اعتبار) اور مدلل کرنے کی طمع کی جائے''۔ (3)

چناں چہ اسی کے پیشِ نظر حضرت شیخ الہندؒ نے ماہنامہ ''القاسم'' کے آغاز سے ہی علومِ نبوت، خاص طور پر ''وحی اور اُس کی عظمت'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا، جو ماہنامہ ''القاسم'' کے درجِ ذیل شماروں میں شائع ہوا تھا:

1۔ پہلی قسط: ماہنامہ ''القاسم'' کے نمونے کے پہلے شمارے کے صفحہ 6 تا 12 میں شائع ہوئی۔ یہ شمارہ دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر چھپا تھا۔ اس جلسے کی تقریب دیوبند میں ۶، ۷، ۸/ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ / 17، 18، 19/ اپریل 1910ء کو منعقد ہوئی تھی۔

2۔ دوسری قسط: ماہنامہ ''القاسم'' کی باقاعدہ اشاعت؛ جلد اوّل، شمارہ اوّل، بابت ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ میں طبع ہوئی، جو اس شمارے کے صفحہ 6 تا 16 میں چھپی تھی۔

3۔ تیسری قسط: ماہنامہ ''القاسم'' کی جلد اول، شمارہ :2، بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ میں صفحہ 4 تا 9 میں طبع ہوئی۔

اس طرح یہ مقالہ تین اقساط میں مکمل ہوا تھا۔

اس مقالے میں حضرت شیخ الہندؒ نے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ علومِ نبوت، بالخصوص وحیٔ الٰہی کی قرار واقعی حیثیت اور عظمت واضح کی ہے۔ اس طرح مادیت پرستی پر مبنی عقلی اور فکری گمراہیوں اور علومِ نبوت کے خلاف جو ماحول پیدا کیا جا رہا تھا، اس کی تردید کی ہے۔ وحیٔ الٰہی کے حوالے سے جو لوگ شکوک و شبہات اور ظنون واَوہام پھیلا رہے تھے، اُس کا مدلل اور محقق جواب دیا ہے۔ گویا کہ دینِ اسلام کی انقلابی تعلیمات کو علمی اور فکری حوالے سے صاف شفاف طریقے سے خوب واضح کیا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ اہم ترین علمی مقالہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے اُن کے ایک دوسرے مقالے ''لا إیمان لمن لا أمانة لهٗ'' کو جمع کر کے ''اِفاداتِ محمودؒ'' کے عنوان سے ۱۳۵۲ھ / 1933ء میں شائع کیا تھا۔ اس اشاعت کے

سرِورق پر درجِ ذیل یہ تحریر شائع کی گئی تھی:

''الحمد للّٰہ و المِنّۃ کہ رسالہ ''افاداتِ محمودؒ'' جانشین حضرت شیخ الہند حضرت مولانا الحاج المولوی السّیّد حسین احمد صاحب صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند (سہارن پور) کی توجہاتِ سامیہ سے قدوۃ الاتقیاء، زُبدۃ الاذکیاء، اسیرِ مالٹا، شیخ الہند حضرت مولانا الحاج المولوی محمود حسن صاحب قدس سرہٗ کی دو اہم تقریروں کا مجموعہ۔ بہ صرفِ زر از بعض اہلِ خیر۔ (طابع:) مولوی سیّد احمد مدیر کتب خانہ اعزازیہ دیوبند و سہارن پور، جید برقی پریس دہلی میں طبع ہو کر مفیدِ خاص و عام ہوا''۔

اس اشاعت کے بیک ٹائٹل پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی درجِ ذیل تحریر درج ہے:

''نحمدہ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم!

شیخ العرب و العجم حضرت مولانا محمود حسن صاحب — قدّس اللّٰہ سرّہ — کے دو مضمون بعنوان ''عظمتِ وحی'' اور ''لا إیمان لمن لا أمانۃ لہ'' تقریباً بیس بائیس سال گزرے کہ (ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند میں) شائع ہوئے تھے۔ علمی مجالس نے اُن کو خزائنِ علمی کی حیثیت سے قبول کیا تھا، لیکن ان جواہرِ علمی سے صرف وہی حضرات واقف ہو سکے، جنھوں نے ان دونوں مضمونوں کو خود ملاحظہ فرمایا۔ اور چوں کہ ان مضمونوں کی کوئی مستقل اشاعت نہ ہوئی تھی، اس لیے یہ انمول موتی زاویۂ خمول (چھپے ہوئے کونے کھدرے) میں پہنچنے کے قریب ہو رہے تھے۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے متوسلین کی عموماً اور میری خصوصاً دلی تمنا تھی کہ ان کو نہایت آب و تاب کے ساتھ از سرِنو شائع کیا جاوے۔ سو بحمد اللہ یہ تمنا یوں پوری ہوئی کہ ایک صاحبِ خیر نے — جو اپنے نام کو ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے ہیں — اس کی طباعت کے اخراجات کو برداشت کیا اور اشاعت کی اجازت دی۔

میں نے اور حضرت شیخ الہندؒ کے بعض کفش برداروں نے اس کی طباعت کے عملی اُمور انجام دیے، مگر جس طرح طباعت اور کتابت کے اعلیٰ مدارج پر اس کو دیکھنے کی تمنا تھی، وہ پوری نہ ہوئی، تاہم (ضرب المثل ہے):

''حاجتِ مشاطہ نیست روئے دلا رام را''

(خوب صورت کو بناؤ سنگھار کی حاجت نہیں ہے)

ارادہ ہے کہ اس کی طباعتِ ثانیہ کو طباعتِ اولیٰ سے ہزار درجہ بہتر صورت میں لایا جاوے۔

و اللّٰہ الموفّق ننگِ اسلاف حسین احمد غفرلہ ۱۳۵۲ھ/1933ء''

حضرت شیخ الہندؒ کا یہ اہم مقالہ ترتیب و تحقیق اور عناوین قائم کر کے قارئینِ ''شعور و آگہی'' کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دونوں مقالہ جات کے بعض حوالہ جات اور اشعار کی تخریج میں شاعرانہ ذوق رکھنے والے جناب انجینئر وسیم اعجاز نے بڑا تعاون فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور ہمیں حضرت شیخ الہندؒ کے علوم و افکار سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ مدیرِ اعلیٰ

www.rahmia.org

وحی اور اُس کی عظمت

بِسمِ اللّٰہ الرّحمٰن الرّحِیم

چو غلام آفتابم ، ہمہ زِ آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم [4]

(جب اپنے آفتاب کا غلام ہوں تو سب کچھ آفتاب سے ہی لے کر بیان کرتا ہوں۔
نہ میں خود رات ہوں، نہ شب پرست ہوں کہ میں خوابوں کی باتیں بیان کروں۔)

www.rahimia.org

(وحی کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم)

وحی لغتِ عرب میں:

''اشارہ''، ''کتابت''، ''مکتوب''، ''رسالت''، ''اِلہام''، ''اِلقاء'' کو کہتے ہیں۔ [5]

اور اصطلاح اور عُرف میں:

''اُس ''کلام'' اور ''پیام'' کا نام ہے، جو حضرت ربّ العزت کی طرف سے انبیا علیہم السلام پر نازل ہو۔'' [6]

ہر چند واسطہ بلاواسطہ کے تفاوت (فرق) اور وسائط (واسطوں کی نوعیت) کے اختلاف سے اُس (وحی) کی متعدد اقسام ہوں، مگر کلامِ الٰہی ہونے میں سب شریک ہیں:

(الف) زید کا کلام بلاواسطہ سنو، یا بہ واسطۂ ہیلو گراف (heliograph)، یا کتابت، یا پیغامِ زبانی، ہر حال میں اُس کو' کلام زید کا' کہنا درست ہوگا۔

(ب) ''گلستان'' کوئی پڑھے، کوئی لکھے، 'کلامِ شیخ (سعدی)' ہی سمجھا جائے گا۔

(ج) بلکہ صرف مضمون (اور معنی) جس کا ہوتا ہے، اُسی کا کلام شمار کیا جاتا ہے۔ الفاظ خواہ دوسرے کے ہوں۔

(د) اگر ہم کوئی مضمون کسی کو بتلا دیں اور وہ اُس کو زبانی اپنے الفاظ میں یا تحریراً (تحریری طور پر) اپنی عبارت میں بیان کر دے اور دوسروں کو پہنچا دے تو وہ ہمارا کلام اور ہمارا پیام ضرور سمجھا جائے گا۔ گو دوسری وَجہ سے اُس کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا بھی غلط نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ اصل کلام؛ ''مضمون'' و ''معنی'' ہیں۔ الفاظ و حروف اُس کے لیے عنوان اور اُس پر دالّ (دلالت کرنے

والے) ہیں۔

(وحیٔ الٰہی کی اقسام)

اب اِن شاء اللہ تعالیٰ یہ بات بھی بہ سہولت سمجھ میں آجائے گی کہ:

(الف) قرآن شریف

(ب) اور احادیثِ قدسیہ

(ج) اور دیگر احادیث و اقوالِ نبویہ — علٰی صاحبها الصّلوٰة و التّسليم —

سب کلامِ الٰہی اور وَحی مِن اللّٰه (اللہ کی جانب سے وحی) ہیں۔ عوارضِ خاصہ (مخصوص لوازمات) اور بعض احکام میں، گو اُن میں باہم امتیاز ہو — اور ضرور ہونا چاہیے — مگر کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی خِفا (شبہ) نہیں۔ چناں چہ جملہ اکابر کے نزدیک بھی مُسلّم ہے کہ احادیثِ رسول علیہ السلام، حتیٰ کہ اُن کا خواب بھی ''وحی'' ہی سمجھا جاتا ہے۔

(وحی کی عظمت وصداقت)

جب وحی کا مفہوم اور اُس کا مصداق اور اُس کے اقسام معلوم اور معیّن ہو چکے تو اَب اُس کی عظمت اور صداقت میں کون کلام کرسکتا ہے، جو دلیل کی حاجت ہو۔ جب کسی کو حاکم یا سلطان مان لیا جاوے تو گنوار سے گنوار بھی اُس کا یہی مطلب سمجھتا ہے کہ اُس کے احکام واجب التّسليم (ماننا لازمی) ہیں۔ ہاں! اگر کوئی سلطان اور حاکم کے معنی ہی نہ سمجھے، یہ دوسری بات ہے۔ یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ کوئی خدا کا تو قائل ہو اور اُس کے احکام کو واجب التّسليم (ماننا ضروری) نہ سمجھے۔ اور بالفرض کوئی ایسا ہو تو اُس کو ایمان کے ساتھ آدمیت سے بھی نکالنا پڑے گا، بلکہ نکالنے سے پہلے خود (انسانیت سے) نکل جائے گا کہ وہ حقیقت میں خدا ہی کا منکر ہے۔

(کوئی دوسرا ذریعۂ علم وحیٔ الٰہی کے برابر نہیں)

اس کے بعد یہ التماس ہے کہ وحی کے واجب التّسليم ہونے کے ساتھ یہ امر بھی ضروری اور بدیہی (واضح) ہے کہ جملہ ذرائع علم میں وحی کے برابر کوئی نہیں۔ جہل، وخطا، ونِسیاں (بھولنے) کا اُس میں شائبہ تک نہیں۔ اُس کے مقابلے میں افلاطون و بقراط کے کلام کو کسی جاہل، کودن (بے وقوف)، طفلِ مکتب کے کلام پر ہرگز فوقیت نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کلام کی عظمت اور اُس کی متابعت (اتباع کرنے)، فصاحت و بلاغت، واقعیت وصداقت، تطابقِ حکمت ومصلحت (حکمت ومصلحت میں مطابقت) کا مدار اُس (کلام) کے متکلم پر ہوتا ہے۔ جس درجے کا متکلم ہو، اُس درجے کا کلام۔

(اصول وضابطہ ہے کہ:)

''و قدر الشّهادة قدر الشّهود'' (گواہی کی قدر گواہوں کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔)

چناں چہ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''کلامِ الٰہی کو تمام مخلوقات کے کلام پر وہی فضیلت حاصل ہے، جو حق جل وعلا شانہ کی ذاتِ پاک کو تمام

مخلوقات پر ہے۔''[7]

''کلامُ الملوکِ مُلوکُ الکلام'' (بادشاہوں کا کلام، کلام کا بادشاہ ہوتا ہے)

کے قاعدے سے تو ''کلامُ الإلٰہِ، إلٰہُ الکلام'' (اللہ کا کلام، کلاموں کا خدا ہوتا ہے)

کہنا ضرور ہوگا۔ پھر کلامِ الٰہی کے برابر یا اُس سے زائد، مخلوقات کا کلام کیسے ہوسکتا ہے، بلکہ جیسے اُس کے مقابلے میں کسی کی کچھ حقیقت نہیں، ایسے ہی اُس کے کلام کے مقابلے میں کسی کے کلام کی کچھ حقیقت نہ ہوگی۔ سقراط اور ارسطو کے کلام کے رُوبرو کسی پاگل دیوانہ کے کلام کی جتنی وقعت ہوسکتی ہے، ربّ العزت کے کلامِ مقدس کے رُوبرو تمام مخلوقات کے کلام کی اتنی وقعت بھی نہیں ہوسکتی۔

(وحیٔ الٰہی کے درمیانی واسطے: فرشتے اور انبیاؑ معصوم ہیں)

بالجملہ یہ امر بدیہی (ظاہر) ہے کہ کلامِ الٰہی کے برابر ہرگز ہرگز کسی کا کلام قابلِ تسلیم اور واجب التّعمیل (عمل کرنا لازمی) نہیں ہوسکتا۔ اور اس پر کوئی حُجّتی (بلاوجہ بحث کرنے والا) بہت سے بہت (زیادہ سے زیادہ) کہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ:

''ہم کو وحیٔ الٰہی بلا واسطہ تو پہنچتی نہیں، بیچ میں وسائط (واسطے) ضرور ہیں۔ تاوقتیکہ اُن وسائط (واسطوں) کی طرف سے اطمینانِ تامّ (پورا اطمینان) نہ ہو، کلامِ الٰہی ہونے پر کیسے وثوق ہوسکتا ہے۔ صرف قائل کی صداقت کافی نہیں ہوسکتی۔ اُس کے ساتھ ناقل کا صادق ہونا بھی ضروری ہے''۔

تو وسائط (وحیٔ الٰہی کے درمیانی واسطے) کُل دو ہیں:

(1) ایک: وحی لانے والا، یعنی فرشتہ۔

(2) دوسرے: جس پر وحی لے کر آیا، یعنی نبی اور رسول۔

سو اِن دونوں فریق کی صداقت اور عصمت بہ اتفاق اہلِ عقل و نقل ایسے ظاہر و مُسلّم (تسلیم شدہ) ہے کہ اصلاً (اصولی طور پر) حاجتِ بیان نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ملائکۃُ الرّحمٰن اور انبیائے کرام مقرّبینِ بارگاہِ الٰہی سے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ''مقرّب'' اور ''خواص'' بننے کے لیے سراپا اطاعت ہونا ضروری ہے۔ اپنے مخالفوں کو اپنی بارگاہ میں کون گھسنے دیتا ہے اور مسندِ قُرب پر کون قدم رکھنے دیتا ہے۔

اس لیے ضرور ہے کہ وہ ''مقرّب'' جن پر اپنے اَسرار (علمی راز) اور مافی الضّمیر (دل کی باتیں) آشکارا کیے جاویں اور منصبِ سفارت پر مقرر فرمائے جاویں اور سلسلۂ ہدایت عالم اُن کے ساتھ وابستہ کیا جاوے اور

لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ[8] (اللہ تعالیٰ فرشتوں کو جو حکم دیتا ہے، وہ اُس کی نافرمانی نہیں کرتے)

اور

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[9]

(رسول تمھیں جس چیز کا حکم دیں، اُسے لے لو۔ اور جس چیز سے تمھیں روکیں، اُس سے رُک جاؤ)

فرما کر حق تعالیٰ نے اس کی صداقت کی کفالت فرمائی ہو، معصوم اور ظاہر و باطن میں مطیع و فرماں بردار ضرور ہوں گے۔ سو اب ملائکہؑ اور حضراتِ انبیاؑ کی شان میں کوئی بے ہُودہ خیال کرنا، ہرگز (صرف) اِنھیں تک نہ رہے گا، بلکہ اُس کی نوبت دُور (خدا) تک پہنچے گی۔

علاوہ ازیں حضراتِ ملائکہؑ کی طرف سے سُوئے ظنی (بُرا گمان) تو اتنا بعید امر (دور کا معاملہ) ہے کہ عاقل (عقل مند) سے متوقع نہیں۔ جو اُن کی اصلیت اور اُن کی حالت سے مطلع ہوگا، جان لے گا کہ اُن میں رذائل (بداَخلاق) کا مادہ ہی نہیں۔ اُن کی طرف کِذب (جھوٹ) کا خیال ایسا ہی ہے، جیسا کہ کوئی ناواقف اُن کی طرف اکل و شُرب و توالُد و تناسُل (کھانے پینے اور اولاد وغیرہ کے پیدا ہونے) کا خیالِ خام (کچا خیال) پکانے لگے۔

البتہ حضرات انبیاؑ کے بشر ہونے کی وَجہ سے شاید اُن کی نسبت کسی کو یہ خیال ستائے تو اس ضرورت سے جوابِ اوّل کے علاوہ دوسرا امر قابلِ التماس یہ ہے کہ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کو اور تم کو، جو کسی کو بہادر، یا سخی، یا باحیا، یا عقل مند، یا راست باز، یا امانت دار وغیرہ ہونے کا بسا اوقات یقین ہوتا ہے تو اس کی وَجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اُس کے تجربہ اور مشاہدۂ احوال و افعال و اقوال سے ہم کو بسا اوقات ایسا یقین ہوجاتا ہے کہ (اُس صفت کے) جانبِ مخالف کا خیال بھی نہیں رہتا تو اب حضراتِ انبیاؑ کے بارے میں یہ **قاعدۂ مُسلَّمہ** کہاں جاتا رہا۔

(نبی اکرم ﷺ کے اعلیٰ اَخلاق کے تمام لوگ مدّاح ہیں)

اَور (دیگر) حضرات انبیا علیہم السلام کو رہنے دیجیے، حضرت رسولِ عربی اُمّی **سیّد الأنبیاء و المرسلین علیه السّلام** کے احوال، و افعال، و اقوال کو ملاحظہ فرمایئے کہ موافق و مخالف، جو اُن کی حالت نقل کرتے ہیں، بہ رُوئے انصاف اُس سے کیا نکلتا ہے۔ کوئی دلیل جس سے اُن کی عقل و فہم و فراست و صداقت و دیانت و امانت، سخاوت و شجاعت، حیا و متانت وغیرہ میں کوئی کمی بھی معلوم ہوتی ہو؟ اگر ہو تو پیش کیجیے گا یا ہم آپ کو یہ دکھلاتے ہیں کہ اُن کے مخالف اور دشمن اُن کے کمالات کے کس قدر مدّاح ہیں۔ یقیناً آپؐ کا کمالاتِ حسنہ میں کامل ہونا، اُس سے زیادہ قابلِ تسلیم ہے، جیسے کہ رُستم کی شجاعت، و حاتم کی سخاوت مُسلَّم ہو رہی ہے، مگر **تعصُّب و عِناد** کے علاج سے سب مجبور ہیں۔

(نبی اکرم ﷺ صداقت و دیانت میں بے نظیر ہیں)

کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ ایسا شخص جو صداقت و دیانت جملہ کمالات میں نظیر نہ رکھتا ہو، وہ وحیٔ خداوندی میں ایسا کرے، اور جس نے **مُدّت العمر** (پوری عمر میں) کسی کے ساتھ کِذب (جھوٹ) کا استعمال نہ کیا ہو، وہ — **نعوذ باللّٰہ** (اللہ کی پناہ) — خداوندِ عالم پر جھوٹ لگائے۔

اسی کے ساتھ — بہ شرطِ فہم — یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ آپؐ پر جو وحی نازل ہوئی، اُس کی کیا صورت ہوئی اور کیا اسباب اور اہتمام اُس کے متعلق پیش آئے، تاکہ اُس پر غور کرنے سے اہلِ فہم کو **بالبداھت** (واضح طور پر) یہ معلوم ہوجائے کہ:

(الف) وحیٔ الٰہی میں کسی قسم کے خلجان (شک و شبہ) کی گنجائش نہیں۔

(ب) اور وَحی مِن اللہ (اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی وحی) کوئی معمولی بات نہیں، بلکہ نہایت اعلیٰ اور عظیم الشان امر ہے، جس کے قابل کوئی ہی نکلتا ہے۔

(ج) اور پھر اُس پر نزول کی بھی خاص ہی شان ہوتی ہے۔

(د) اور پھر فرقِ مراتب کی وَجہ سے ہر ایک وحی کا اہتمام اُسی کی شان کے موافق کیا جاتا ہے۔

(آپؐ پر نازل ہونے والی وحی کا درجہ بہت اعلیٰ ہے)

دیکھیے! حضرت رسولِ اکرم —نبیُّ الأنبیاء و الاُمم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم— پر جو وحی نازل ہوئی، جس کو اعلیٰ درجہ وحی کا کہنا چاہیے، اُس کے حالات اور کیفیات کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور پھر جس کا جی چاہے، انصاف سے کہہ دے کہ اُس میں کسی کوتاہی یا نقصان کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس کی تفصیل کے لیے جو إمام المُحدِّثین أمیر المؤمنین فی الحدیث (امام محمد بن اسماعیل البخاریؒ) نے ''صحیح بخاری'' میں بہ واسطہ احادیث بیان فرمایا ہے، اُس کو بہت کافی سمجھتے ہیں:

(1) حضرت امام بخاریؒ نے یہ کیا کہ اپنی کتاب میں سب سے اوّل ''باب کیف کان بدء الوحی إلیٰ رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم'' منعقد فرمایا، جس سے معلوم ہوگیا کہ:

(i) جملہ اصول و فروع، حتیٰ کہ ''ایمان'' اور ''علم'' سب کا ماخذ و منشا وحیٔ الٰہی ہے۔

(ii) اور تمام اصول و فروع وہی معتبر ہوسکتے ہیں، جن کا ماخذ ''وحی'' ہو۔

(iii) اور اس کتاب میں جو مذکور ہوگا، اصول ہوں یا فروع، عبادات ہوں یا معاملات، اُس کا ماخذ وحی ہوگی۔

(iv) اور اس کی کیفیات اور اُس کے حالات بیان فرمانے سے

حضرت امام (بخاری) —رضی اللّٰہ عنہ و أرضاہ— کی بھی غرض معلوم ہوتی ہے کہ اُن کو سمجھ کر ہر کوئی سمجھ جاوے کہ بے شک وحی ہی اصل اصول ہے اور اُس کے رُوبرو کوئی مستحکم سے مستحکم دلیل بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

(2) (باب کا) ترجمہ (عنوان) بیان کر کے اس کے بعد چند آیات و حدیث امام (بخاری) رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائیں، جس سے ''کیفیاتِ بدء الوحی'' (وحی کی ابتدا کی کیفیات) کی توضیح (وضاحت) ہوجائے۔ اور اُس کی عظمت اور مفترض الطاعت (جس کی اطاعت فرض) ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہے، مگر صرف دو باتوں کا خیال ضرور ہے:

(i) اوّل: یہ کہ لفظِ ''وحی'' میں جملہ اقسام مذکورۂ بالا داخل ہیں۔ (صرف) وحی متلو، یعنی قرآن شریف ہی مقصود نہیں۔

(ii) دوسرے یہ کہ (لفظِ بدء یعنی) ابتدا سے کوئی خاص ابتدا منظور نہیں، بلکہ عام ہے۔ خواہ:

(الف) بہ لحاظ زمانہ ہو، یا مکان۔

(ب) یا بہ اعتبار احوالِ خاصہ ہو، یا اوصاف۔

(3) (امام بخاریؒ نے باب کے) ترجمہ (عنوان) کے متصل ہی یہ آیت کریمہ لائی:

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۢ بَعْدِهٖ (10)

www.rahimia.org

(ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور اُن نبیوں پر جو اس کے بعد ہوئے)

بیان کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ:

(i) ''مبدأ وحی'' یعنی جہاں سے یہ کلام صادر ہوئے، وہ حق جلّ و علا شانہ' ہے۔

(ii) اور اسی طرح پر انبیائے سابقینؑ پر وحی آئی، جس سے معلوم ہوگیا کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کو اس کا ماننا ایسا ہی پڑے گا، جیسے اپنے انبیاؑ کی وحی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا انکار گویا سب کا انکار ہے۔

جن کو علم و عقل عنایت ہوا ہے، وہ اس پر قناعت نہ فرمائیں، بلکہ (سورت النساکے) اس رکوع کو **صراطاً مستقیماً** (آیت 163 تا 176) تک غور سے ملاحظہ کریں کہ وحی کی عظمت اور اُس کی تاکید کس کس طرح سے کی گئی ہے۔ شاید (قرآن حکیم میں) کسی دوسرے موقع پر اتنی تاکیدات نہ ملیں[11]، جس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی فہم و تتبُّع (بات کا گہرائی میں جا کر پیچھا کرنے اور سمجھنے) کا پورا پتہ لگتا ہے۔

(4) اس کے بعد (امام بخاریؒ نے) چند روایات اور آیات کو بیان فرمایا، جن کی تفصیل سے اس وقت بالکل قاصر ہوں۔

ہاں! بالاجمال (اِجمالی طور پر) یہ عرض ہے کہ ان (آیات و احادیث) سے یہ معلوم ہوا کہ:

(۱) نبی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت اعلیٰ اور خالص ہو۔

(۲) (نبی کا) نسب بہت اعلیٰ اور اَخلاق و اعمال کامل ہوں۔

(۳) نقضِ عہد (وعدہ خلافی) اور کِذب (جھوٹ) سے مُبرّا (بری) ہو۔

(۴) مخالفین تلک اُس کی صدق و دیانت و عمدگیٔ اَخلاق و افعال کو تسلیم کرتے ہوں۔

(۵) اور خاص جناب سیّد المرسلین کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ آپؐ کو ابتدا سے وحی نہیں عنایت ہوئی، بلکہ بڑے ہوجانے اور کامل العقل ہونے کے بعد — یعنی چالیس سال کے بعد — آپؐ کو وحی عطا ہوئی۔

(۶) اور فرشتوں میں بھی خاص حضرت جبرائیل علیہ السلام — جو افضل الملائکہ ہیں — اس خدمت پر مامور ہوئے۔

(۷) اور بہت سے مجاہدات اور خلوات (غارِ حرا کی تنہائی میں وقت گزارنے) اور کثرتِ عبادات کے بعد۔

(۸) اور ابتدا میں یہ حالت ہوئی کہ کلماتِ عربی جو آپؐ کی زبان تھی، اُس کو نہ کہہ سکی۔ مکرر سہ کرر (دو تین دفعہ دُہرانے کی) جدوجہد کے بعد اُن چند کلمات کو کہہ تو لیا، مگر اُس کی عظمت و ہیبت سے نہ دل قابو میں نہ ہاتھ پیر۔ آپؐ کو یہاں تک اندیشہ ہوا کہ شاید مرجاؤں۔

(۹) اور (وحی کے نزول کی) یہ نوبت بھی اوّل (پہلی مرتبہ) نہیں، بلکہ کچھ عرصے تک خواب میں اوّل (پہلے) آپ کو یہ حالاتِ صادقہ پیش آچکے تھے۔

(۱۰) اور یہ حالت تو آپؐ کی اخیر تلک رہی کہ نزولِ وحی کے وقت شدتِ سرما میں پسینہ بہنے لگتا تھا۔ سوار ہوتے تھے تو سواری بیٹھ جاتی تھی۔[12] کسی کے گھٹنے پر آپؐ کا گھٹنا ہوتا تو وہ یہ خیال کرتا کہ شاید میری ہڈی چُور چُور ہوجائے گی۔[13]

انھیں روایات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ:

(۱۱) غارِ حرا جو آپؐ کی عبادت گاہ اور اعتکاف کی جگہ تھی، وہاں اوّل (پہلی) وحی آئی۔

(۱۲) اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام مہینوں میں رمضان شریف کے مہینے کو وحی سے زیادہ اختصاص ہے۔

اور انھیں روایات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ:

(۱۳) چالیس برس کے بعد اور خوابوں کے بعد جب فرشتہ وحی لانے لگا تو پھر بھی مُتّصِلاً (مسلسل) وحی نہیں آئی، بلکہ (ایک دفعہ وحی) آ کر ایک عرصے تک (وحی کا) آنا بند رہا۔ پھر جو (وحی) آئی تو علی الاتّصال (مسلسل) آتی رہی۔

(۱۴) یہ بھی معلوم ہوا کہ وحی کے محفوظ رہنے اور بِجنسہٖ (پورے طور پر) اُس کو لوگوں تک پہنچوا دینے کی حق تعالیٰ نے کفالت اور ذمہ داری فرمائی۔

(۱۵) اور صاحبِ فہم کو اَور امور بھی ان روایات سے ایسے معلوم ہوتے ہیں جن سے عظمتِ وحی ہویدا (ظاہر ہوتی) ہے۔

اور ان (بخاری میں بیان کردہ آیات و احادیث) کے سوا دیگر روایات سے ایسے حالات بہ کثرت اہل فہم کو معلوم ہوتے ہیں، جن سے دو باتیں ضرور سمجھ میں آتی ہیں:

(الف) اوّل: تو وحی کی عظمت۔

(ب) دوسرے: یہ کہ اس میں کسی طرف سے اندیشۂ سہو و خطا وغیرہ نہیں ہوسکتا۔

(جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے)

لَّا یَأْتِیهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (14)

(اُس پر جھوٹ کا دخل نہیں، آگے سے اور نہ پیچھے سے)

(وحیٔ الٰہی ہم پر بہت بڑی حجت ہے)

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ کی اس طرز سے ہمارا مدعا ایک قسم کی وضاحت کے ساتھ ثابت ہوگیا کہ وحی جو بہ واسطہ رسول ہم کو پہنچتی ہے، مَتلُوّ (قرآن) ہو یا غیر مَتلُوّ (احادیثِ نبویہؐ)، وہ ہمارے لیے ایسی کافی حجت ہے کہ اس کے ہوتے (ہوئے)، دوسری طرف نظر ڈالنی اور وہ بھی کیف ما اتّفق (جیسے جی چاہا) بے شک خدا کی بندگی سے نکال کر شیطان کی بندگی میں داخل کردیتی ہے۔ اور (وحی کی صورت میں) آپؐ کا ارشاد نہ فقط اہلِ اسلام پر، بلکہ تمام اہلِ زمین پر بہ رُوئے انصاف ایسی حجت (دلیل) ہے کہ اُس کا ماننا ہر مُتنَفِّس (انسان) کو ضروری ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ادھر اُدھر جانا بالکل خام خیالی ہے۔

اور مسلمانوں میں گو اس کو سب مانتے ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے زور میں آ کر ذرا اِدھر اُدھر ہو کر بہت دور نکل جاتے ہیں۔ الحذر الحذر! (اس سے بچو! اس سے بچو!)۔ اگر مقدر ہے تو شاید کسی وقت کچھ تفصیل کی بھی نوبت آ جائے۔

یکے از عقل مے لافد، دِگر طامات مے بافد
بیا کایں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم (15)

(ایک عقل سے بے ہودہ گفتگو کر رہا ہے، دوسرا عبادت کی ڈینگیں ہانک رہا ہے
تم آؤ کہ یہ جھگڑے ہم حقیقی سچا انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں)

و السّلام علیٰ من اتّبع الھُدیٰ

(سلامتی ہواُس پر جس نے ہدایت کی اتباع کی)

(تمام احکامات کا دار و مدار وحیٔ خداوندی پر ہے)

صحرائے مغیلان ہوس طے شدنی نیست
در دامنِ تجرید شکستیم قدم را

(کانٹوں سے بھرے صحرا کا سفر محض خواہش سے طے نہیں ہوسکتا۔
تجرید کے دامن میں ہمارے قدم ٹوٹ گئے۔)

شادم کہ قضا ساختہ محراب جبینم
درگاہ شہنشاہِ عرب را و عجم را

(میں خوش ہوں کہ میں نے اپنی جبین کی محراب کو
عرب و عجم کے بادشاہ کی درگاہ میں پیش کردیا ہے۔)

آں شمع رسالت کہ کند نور جبینش
ہم منصب پروانہ براہین و حِکَم را (16)

(وہ رسالت کی شمع کہ اُن کے ماتھے کا نور
حکمتوں اور عقلی دلائل میں پروانے کا ہم منصب ہے۔)

پہلے یہ مضمون کچھ بسط (تفصیل) سے معلوم ہو چکا ہے کہ مدار جملہ احکام وحیٔ خداوندی پر ہے۔کسی بات کو بہ مقابلہ وحی قابلِ قبول سمجھنا، خالق و حاکم پر مخلوق و محکوم کی فوقیت و برتری کا اقرار کرلینا ہے۔ جس کے ابطال (غلط ہونے) کے لیے نام کی (معمولی) عقل بھی کافی ہے۔علم و ایمان کی بھی چنداں احتیاج نہیں۔ یہی وَجہ ہے کہ جن لوگوں کو ایمان وعلم کے بدلے میں بھی

عقل ہی مل گئی تھی، وہ بھی وحی کے تکیہ گاہِ بے حجت ہونے کو بلا حجت (بغیر دلیل) مان گئے۔

شکلِ انسانی میں ایسے افراد تو کچھ نہ کچھ ضرور پائے گئے کہ سِرے سے وجودِ باری کے ہی منکر ہوگئے اور وجودِ مخلوقات کے لیے وجودِ خالق کی ضرورت اُن کی عقل میں نہ آئی، مگر ایسا ایک شخص بھی نہ ہوا ہوگا کہ وجودِ خالق کائنات اور اُس کی صنعتِ کمالیہ (کمالاتِ الٰہیہ) کا قائل ہوکر اُس کے احکام کو واجب التّسلیم نہ سمجھے، یا کسی دوسرے کے حکم کو اس کے احکام پر ترجیح دینے کی جرأت کرے۔

ایسا تو ہوجاتا ہے کہ سلطانِ وقت یا حاکم بااختیار کی حکومت کو کوئی سینہ زوری یا حماقت سے تسلیم نہ کرے اور بغاوت پر کمر بستہ ہوجائے۔ مگر ایسا دیکھا تو کیا، سنا بھی نہ ہوگا کہ:

(الف) کسی کی سلطنت اور حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد، پھر اُس کے احکام کے واجب الاتّباع ہونے کا انکار کرے۔

(ب) یا رعایا میں سے کسی کے احکام کو اس کے احکام کے مقابلے میں واجب التّسلیم خیال کرے۔

(ج) اور بالفرض کوئی ایسا کرے تو اُس کو آدمیوں میں شمار کرنا آدمی کا تو کام نہیں۔

یہ تو صریح اجتماعِ ضدین (واضح طور پر ایک دوسرے کے مخالف چیزوں کو جمع کرنا) ہے، جس سے بڑھ کر غلط اور باطل کوئی امر نہیں ہوسکتا۔

(وحیٔ الٰہی کو نہ ماننے والے انھیں خطابات کے مستحق ہیں، جو ابلیس کو دیے گئے)

بالجملہ وحی یعنی کلامِ الٰہی اور کلامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — کہ وہ بھی حسبِ بیانِ سابق — حقیقت میں کلامِ الٰہی ہے، ایسی مستحکم اور قوی حجت ہے:

(الف) جیسے خدا کی خدائی، اس کے مقابلے میں کسی دلیل کی اتنی بھی وقعت نہیں ہوسکتی۔ جیسے آفتاب کے مقابل ذرّہ اور دریا کے سامنے قطرہ۔

(ب) اور ایسا عام حکم ہے کہ عرب، عجم، مسلم، غیر مسلم، عالم، جاہل، جملہ (تمام) بنی آدم پر اُس کی متابعت (اتباع کرنا) بلا تخصیص واستثنا یکساں فرض ہے۔

اُس کے کسی حکم سے انکار اور سرتابی کرنے والا انھیں خطابات کا مستحق ہے، جو ابلیس کو ہمیشہ کے لیے دیے گئے۔

اُس کے واجب التّعمیل ہونے میں کسی کو اتنی بھی گنجائش نہیں کہ تسلیمِ عقل (عقل کے مان لینے) کی انتظاری کی جائے یا اُس کے لِمْ (دلیل) اور اغراض و مصالح کے معلوم ہونے کی یا کسی خدشے کے رفع کرنے کی راہ دیکھی جائے۔

(وحیٔ الٰہی کے ہوتے ہوئے مختلف مذاہب وجود میں آنے کے اسباب)

اس مضمونِ مُسلَّم و بدیہی (تسلیم شدہ اور واضح مضمون) کے بعد ہر کوئی یقین کرسکتا ہے کہ اگر فہم و حق پرستی، انصاف و ایمان سے کام لیا جاتا تو وحیٔ الٰہی کے ہوتے (ہوئے) مذاہبِ مختلفہ کی نوبت آنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ جب سلطانِ وقت تمام رعایا کے لیے ایک عام قانون تجویز اور معین فرما دے اور اُسی کے مطابق تمام معاملات

ونزاعات (جھگڑے) فیصل کیے جائیں تو پھر اختلافات کے چلنے اور بڑھنے کی صورت کیا ہے۔

اب اس پر یہ اختلافِ مذاہب اور تعارضِ عقائد و خیالات جو بحرِ موّاج کی صورت میں نظر آتا ہے، کس چیز کا ثمرہ ہے اور اس اختلاف کے اسباب کیا ہیں؟

ظاہر ہے کہ علیٰ سبیل منع الخُلوّ (یعنی دونوں اسباب میں سے ایک تو ضرور ہوتا ہے اور اگر دونوں سبب موجود ہوں، تب بھی مضائقہ نہیں۱۲) اس اختلاف کا باعث کل دو امر ہیں:

(1) جہل و بدفہمی (جہالت اور غلط طور پر بات کو سمجھنا)

(2) یا ناحق پرستی اور بے انصافی

کیوں کہ اس خرابی کا منشا یا نقصانِ علم (علم کی کمی) ہوگا، یا نقصانِ عمل (عمل کی کمی)، سو اوّل (علم کی کمی سے) اوّل (جہالت اور بدفہمی پیدا ہوتی) ہے اور ثانی (عمل کی کمی سے) ثانی (ناحق پرستی اور بے انصافی ہوتی ہے)۔

آگے (اس کے بعد) جو کچھ اسبابِ اختلاف نظر آئیں گے، جیسے:

(i) خود رائی اور خود پسندی

(ii) اپنے سلفِ جاھلین (پہلے گزرے ہوئے جاہلوں) کا اتباع

(iii) اپنی رسوم اور اغراض و مصالح کی پابندی

(iv) اپنے خیال میں تشدد و تعصب

(v) سہل انگاری و تساہل (سستی اور کاہلی)

(vi) عناد و دشمنی

(vii) توسع اور مطلق العنانی

(viii) بے باکی و آزادی وغیرہ

وہ سب انھیں دو (یعنی کم علمی اور عمل کی کمی) کے شعبے ہیں۔

(صحابہ کرامؓ علم و عمل میں کامل تھے اور بُرے اختلاف سے بہت دُور تھے)

انصاف سے دیکھ لیجیے کہ حضرات صحابہ — رضوان اللّٰہ علیھم اجمعین — چوں کہ علومِ شرعیہ میں کامل اور حق پرستی میں طاق (ماہر) تھے، یعنی اُن کے علم و عمل دونوں جزوٗ نقصانِ مذکور (مذکورہ خرابیوں) سے پاک و صاف تھے، اس لیے اُن میں وہی ایک مذہبِ حق (سچا راستہ) — جو حضرت سیّدُ العرب و العجم ﷺ کے زمانۂ مسعود میں موجود تھا — اُسی ہیئت وصورت پر قائم رہا۔ کسی دوسرے طریقے کو اتنی بھی گنجائش نہیں ملی کہ اُن نفوسِ مقدسہ میں سے ایک فرد پر بھی اپنا ادنیٰ (معمولی سا) اثر پہنچا سکے اور یہ اختلافِ مذموم (مذکورہ بداَخلاقیوں پر مبنی بُرا اِختلاف) اُن کاملین فی العلم و العمل (علم و عمل میں کامل) میں سے کسی ایک کو بھی اپنا منہ دکھلا سکے۔ اللّٰہ اکبر۔

(صحابہ کرامؓ کے بعد اختلافِ منحوس شروع ہوا)

البتہ ان کے بعد اَور (دوسرے) طبقات میں جب جہل و ناحق پرستی کا اثر رفتہ رفتہ آنا شروع ہوا تو اُس کے ساتھ ساتھ اختلافِ منحوس کو بھی اسلام میں قدم بڑھانے کی گنجائش ملی۔

اور آج غلبۂ جہل و ناحق پرستی کے باعث اُس اختلاف کی یہ نوبت ہے کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف بھی گرد (کم) نظر آتا ہے۔ بنی اسرائیل وغیرہ اُممِ سابقہ (گزشتہ اُمتوں) کو جو جو مُوجِبات (اسبابِ) اختلاف پیش آئے تھے، جن کے باعث اُن کے مذہبِ اصلی کا پتہ لگانا عُنقا (ایک نایاب پرندے) کی سراغ رسانی سے کم دشوار نہیں۔ وہ جملہ اسباب زور وشور کے ساتھ آج مدعیانِ اسلام میں موجود ہیں، جن کی اصل وہی دو مرض (علم وعمل کی کمی) ہیں، جو ہم ابھی عرض کر چکے ہیں۔

اگر ارشاداتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام:

(۱) ''لا تزال طائفة من اُمّتی قائمین علیٰ الحقّ ظاھرین لا یضرّھم من خالفھم حتّٰی یأتی أمرُ اللّٰه.'' [17]

(یعنی میری اُمت میں سے قیامت تک ہمیشہ ایک جماعت حق پر رہے گی، جو دوسروں پر غالب ہوگی اور مخالفین کی مخالفت اُس کو کچھ ضرر نہ دے گی۔۱۲) کی جلوہ فروزی

(۲) اور فرمانِ (نبویؐ): ''لن تجتمع اُمّتی علیٰ الضّلالة'' [18] (میری اُمت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔۱۲)

کی کارسازی نہ ہوتی تو آج اس أفضل الأدیان (دینوں میں سب سے افضل دین اسلام) کی بالیقین (یقینی طور پر) وہی حالت ہوتی جو ادیانِ سابقہ کی یا اُس سے بھی بدتر۔ اور خیر الکتب —یعنی قرآن پاک— کی وہ گت (حالت) ہوتی، جو کتبِ سماویہ؛ تورات وانجیل وغیرہ کی (ہوئی)، یا اُس سے بھی ابتر۔ نعوذ باللّٰه و الحمد للّٰه (اللہ کی پناہ اور اللہ کا شکر)۔

بالجملہ! احکامِ وحی توفی نفسہٖ (اصولی طور پر) ایسی حجتِ قطعی اور فرمانِ عام ہیں کہ ہرقل وکسریٰ ونجاشی سے لے کر شاہانِ یورپ تک اور سُکّانِ حرمین (حرم کے رہنے والوں) سے لے کر جرمن ولندن وفرانس تک کسی کا کوئی عذر، حیلہ، دلیل، بروئے فہم وانصاف اس کے مقابلے میں قابل التفات نہیں ہوسکتا۔ تمام عالم پر اُس کی اطاعت فرض ہے، مگر صرف اُن بے اصل خیالات کے باعث جو جہل و ناحق پرستی پر مبنی ہیں۔ یہاں تک نوبت آئی کہ مدعیانِ اسلام بھی بہ کثرت اُن احکام کی پابندی سے آزاد و سبک دوش ہو بیٹھے، دوسروں کا تذکرہ ہی کیا ہے۔

(آیات اور احادیثِ نبویؐ اور حضرات صحابہؓ کے بارے میں کج روی اور خودرائی کی خرابیاں)

صرف اتنا عرض ہے کہ دیگر اقوام تو اُسی جہل وتعصب کے باعث آپؐ کی رسالت، مذہبِ اسلام کی حقیقت، قرآن و حدیث کے وحیٔ الٰہی ہونے کا سرے سے انکار کر کے اپنے نزدیک فارغ البال ہو بیٹھے۔ بہت ہوا تو اصول وفروعِ اسلام پر کچھ اعتراض بھی کر دیا اور مدعیان ومحبانِ اسلام اتنی جرأت تو کیسے کر سکتے تھے، انھوں نے یہ کیا کہ اپنی رائے کو بہ زور دخل دے کر خیالی گھوڑے دوڑانے شروع کیے اور اپنی فہم اور اغراض واوہام کو اصل قرار دے کر کلامِ الٰہی اور کلامِ جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو کھینچ کھینچ کر اُس پر منطبق کرنا شروع کر دیا اور خودرائی کے جوش میں سلف صالحین، حتیٰ کہ اصحابِ کرام —رضوان اللّٰہ

تعالٰی علیهم اجمعین — کے خلاف کی بھی کچھ پرواہ نہ کی۔ **فضلُّو و أضلُّوا** (خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔۱۲) حال آں کہ اہلِ علم و ایمان خوب جانتے ہیں کہ:

(1) حضراتِ صحابہؓ کی کیا شان ہے

(2) اور قرآن مجید اور حدیث شریف میں اُن کے کمالات اور مناقب کیا کچھ مذکور ہیں۔

(3) اور اُمتِ مرحومہ کو اُن کی تعظیم اور متابعت کی بابت کیا کیا وصیتیں ہیں۔

خیر! یہ قصہ تو لمبا چوڑا ہے، جس کی تفصیل سے اس موقع پر ہم معذور ہیں۔

(صحابہؓ کے بعد اُن کے متبعین کی سچی جماعت)

اہلِ فہم ہمارے بیان سے اتنا ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ جس جماعت نے وحی کو اپنا قبلہ اور حضراتِ صحابہ — **رضوان اللّٰه تعالٰی علیهم اجمعین** — کو اپنا امام بنایا، وہ نہ تو اُس طریقے کے مخالف ہوئے جو اوّل (پہلے) سے چلا آتا تھا اور نہ اُن میں باہم اس **اختلافِ مُضِر** (نقصان پہنچانے والے اختلاف) کی نوبت آئی، جس کے بانی جاہل ہوا پرست (خواہش پرست) ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب سب کا مقصود ایک ہے، خود رائی اور خود غرضی سے لگاؤ نہیں، علم کامل ہے، پھر (ایسی صورت میں) اس اختلافِ فاحش (بڑے اختلاف) کے پیش آنے کے کیا معنی! ۔بس اسی ایک فرقے کو ''اہلِ حق'' اور ''اہلِ سنت'' کا خطاب ملا اور اِرشادِ (نبویؐ) **''ماأنا علیه و أصحابی''** [19] (جس طریقے پر مَیں ہوں اور میرے صحابہ۔۱۲) کا یہی مصداق ہوا۔

(گمراہ فرقوں کی نوعیت)

البتہ جن صاحبوں نے بہ وجہ نقصانِ فہم، یا غلبۂ اَغراض و ہوا، اپنی رائے اور **توهُّمات** کو امام بنایا اور احکامِ وحی کو اُس (اپنی رائے) کے موافق کرنے میں سعی کی، وہ لوگ طریقۂ حق سے بھی اپنے اپنے جہل اور اوہام کے مطابق دُور ہوتے گئے اور حسب ارشادِ رسول علیہ السلام اختلافِ مذموم اور تعدُّدِ مذاہب (مذاہب کی تقسیم اور تعداد) کو بھی اُن میں پورا دخل ملا۔

کون نہیں جانتا کہ عقلِ عقلا (میں) خود از حد متفاوت (بڑا فرق) ہے۔ پھر بے وقوفوں کی سمجھ اور اُن کے اوہام و اغراض کا تو پوچھنا (ہی) کیا ہے۔ اُن کی بدولت تو جس قدر اختلاف اور تعدُّدِ مذاہب پیش آئے، وہ تھوڑا ہے۔ یہ تمام فرقے ''اہلِ ہوا'' کہلائے۔

(سابقہ ادیان میں خلل کے اَسباب)

ادیانِ سابقہ میں جو کچھ خلل آیا، اُس کی بڑی وجہ یہی ہوئی کہ جب کسی نبی کا زمانہ ختم ہوا تو اُن کے خلفا و اَصحاب نے دین کو سنبھالا اور اُن کی ہدایت کے موافق **خلقُ اللّٰه** (اللہ کی مخلوق) کی اصلاح میں کوشش کی، مگر رفتہ رفتہ کہیں جلد کہیں دیر میں یہ ہوا کہ **ناقص الفهم**، خود رائے، **مختلف الخیال، مداهن** (دین قائم کرنے میں سستی کرنے والے)، ہوا پرست لوگوں نے آ کر حدودِ شرعیہ کو ضائع اور احکامِ دین میں **تحریف و تغیُّر** کرنا شروع کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین اصلی مخالفوں سے تو کیا، خود اہلِ ملت سے ایسا روپوش ہو گیا کہ قیامت تک اُس کی صورت سے محرومی اور اُس کے دیدار سے یاسِ کلی (مکمل مایوسی) ہو چکی۔

www.rahimia.org

ملتِ ابراہیمی اور ملتِ موسوی اور ملتِ عیسوی وغیرہ سب میں یہی مرضِ مہلک (ہلاکت خیز مرض) اپنا پورا اثر دکھلا چکا ہے۔ اور حسبِ ارشادِ فخرِ عالم ﷺ یہ تمام مفاسد و اختلافات آج مذہبِ اسلام میں نہایت شدت و کثرت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔ [20]

(قرآن و حدیث میں تحریفِ معنوی کی مختلف شکلیں اور کیفیات)

وحیٔ الٰہی یعنی قرآن و حدیث — کہ جن کے ساتھ دین اسلام کا وجود و عدم وابستہ ہے — دانا دشمن اور ناداں دوستوں نے، یا یوں کہو کہ دشمنانِ اَعیانی (ظاہری) اور پنہانی (خفیہ دشمنوں) نے طرح طرح سے اُس کے ساتھ وہ سفاکانہ اور بے باکانہ کارروائی کی ہے کہ جس پر اسلام کا اصلی صورت پر باقی رہنا ایک حیرت ناک قصہ ضرور ہے۔

انصاف سے ایک تحریفِ معنوی ہی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمالیجیے، جو اس وقت میں وبا کی طرح پھیل رہی ہے کہ اُس کے مقابلے میں یہود کی وہ تحریف — کہ جس کی بُرائی کلامِ الٰہی میں جگہ جگہ مذکور ہے — کم نظر آتی ہے۔

توراۃ میں جو تحریف کرتے تھے:

(الف) وہ کسی وجہ سے عالمِ توراۃ تو سمجھے جاتے تھے۔

(ب) الفاظِ توراۃ کی تلاوت سے متنفر اور اُس کی عبارت کے ترجمۂ لفظی سے تو بے خبر نہ تھے۔

(ج) یہ تو نہ تھا کہ محض بہ ضرورتِ تحریف ہی توراۃ کو دیکھتے ہوں۔

(اس دور میں قرآن و حدیث میں تحریفِ معنوی کی حالت)

اب تو یہاں تک نوبت آ گئی کہ:

(1) کتبِ تاریخ دیکھ لو اور کلامِ الٰہی اور کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تحریف شروع کر دو۔

(2) یا جغرافیہ پڑھ لو اور تحریف کرنے لگو۔

(3) یا زبانِ انگریزی، یا ڈاکٹری، یا ریاضی و ہیئت، یا کوئی معزز عہدہ، یا وکالت و مختارکاری وغیرہ کا پاس حاصل کر لو اور وحیٔ الٰہی میں تحریف و خودرائی کی سند دبا بیٹھو۔

(4) قرآن و حدیث کو کبھی نہ دیکھو، بلکہ دوسروں کو بھی تضیع اوقات کا فتویٰ سنا دو اور جب کوئی ضرورت یا جدید خیال پیش آئے تو نہایت آزادانہ رائے زنی کرو۔

(5) خالق و مخلوق کسی کی موافقت کا انتظار اور مخالفت کی پروا نہ کرو۔

(6) زبانِ عربی سے ناواقفیت ہو تو ترجمہ دیکھ لو یا کسی سے پوچھ لو۔ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں [21]

علاوہ ازیں جہاں تک دیکھا جاتا ہے تو اہلِ کتاب اپنی کتابوں میں انھیں مواقع میں تحریف کی نجاست (گندگی) میں ملوث

ہوتے تھے، جہاں اپنی اغراضِ فاسدہ کی وجہ سے کوئی بڑی دقت نظر آتی تھی، جیسے:

(i) زنا کی سزا رجم

(ii) اور پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف

(iii) اور اُنؐ کی اتباع کا حکم

اور اب ہم اہلِ اسلام کے اندر یہ مرضِ مہلک ایک دریائے شور کی طرح ایسا پھیلا ہوا ہے کہ عقائد سے لے کر اعمال تک اور اوضاع سے لے کر عادات تک کوئی اُس کی تلخی سے بہ دشواری خالی رہ سکے گا۔ گویا وحیٔ الٰہی میں اُسی آزادی کے ساتھ رائے زنی کرنا، مدارِ لیاقت اور معیارِ عقل و کمال ٹھہر گیا ہے۔ ''ضرورت'' کی بھی ضرورت نہیں۔ شعر ؎

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
سعدی از دست خویشتن فریاد [22]

(ہر آدمی دوسرے آدمی کی دست درازی سے نالاں ہے
سعدی! اپنے لوگوں کی دست درازی کی فریاد کرتا ہے)

(احادیثِ نبویہؐ کے انکار اور اُن میں تحریفِ معنوی کی نوعیت)

اور اسی پر بس نہیں، بلکہ مقامِ ترقی میں احادیثِ نبویہ — **علیٰ صاحبها الصّلوات و التّسليمات** — پر ایک طرف سے غیر معتبر ہونے کا فتویٰ لگایا جاتا ہے اور پھر اُس پر طرہ یہ ہے کہ ارشادِ (نبویؐ):

''**أنتم أعلم بأمور دنیاکم**'' [23] (تم اپنے دنیا کے کاموں سے خوب واقف ہو۔۱۲)

کی وجہ سے تمام احکام متعلقہ معاملات کو امورِ دنیا میں شمار کر کے ہر ایک خود رائے، ہوا پرست، خاتم المرسلین اور قائل ''**أوتيت علم الأوّلين و الآخرين**'' [24] (مجھ کو اوّلین و آخرین کا علم عطا کیا گیا ہے۔۱۲) کے مقابلے میں اپنے آپ کا ''**أعلم**'' (بڑا جاننے والا) کہنے کو تیار ہے۔

حضرات صحابہؓ اور تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین اور علمائے راسخین اور جملہ صلحا و صدیقین کی تو اب حقیقت ہی کیا رہ گئی۔ افسوس! شعر ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے فلک نے تھے جو خاک چھان کے [25]

(وحیٔ الٰہی کا انکار کرنے والے اور تاویلات و تحریفات کرنے والے برابر کے مجرم ہیں)

اب انصاف و فہم سے کام لیجیے تو اسلام کی ضرر رسانی میں دونوں فریقِ مذکور برابر ہیں:

(الف) فریقِ اوّل نے جو وحیٔ الٰہی کی صاف صاف تکذیب کی۔

www.rahmia.org

(ب) اور فریقِ دوم نے جو اپنی ہوشیاری اور دین داری سے تاویلات وتحریفات کر کے نصوص کا وہ مطلب نکالا، جو اغراضِ شارع (نبی اکرم ﷺ کے مقصد) کے بالکل خلاف ہے۔

یہ دونوں امر اسلام اصلی کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے ایک دوسرے کی نظیر ہیں۔ شعر ؎

تفاوتِ قامتِ یار اور قیامت میں ہی کیا ممنون
وہی فتنہ ہے، لیکن یاں ذرا سانچہ میں ڈھلتا ہے [26]

بلکہ چشمِ بصیرت ہو تو دوستوں کی یہ عنایات دشمنوں کے ستم سے بدرجہا (کئی درجے) زائد ہیں اور گوش حقیقت نیوش ہو تو اسلام زبانِ حال سے یہ آوازِ بلند کہہ رہا ہے۔ شعر ؎

من از بیگانگاں ہرگز نمے نالم کہ برجانم
بلا ہائے کہ شد نازل زدستِ دوستاں آمد [27]

(میں اجنبیوں کی وجہ سے نہیں رو رہا کہ میری جان پر
اپنے دوستوں کے ہاتھ سے ہی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں)

(انبیا علیہم السلام دنیا میں ہدایت اور تعلیمِ احکام کے لیے آتے ہیں)

منصف وفہیم (انصاف پسند اور سمجھ دار) بالبداہت (واضح طور پر) سمجھتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں تعلیمِ زبان و لغات کے لیے تشریف نہیں لائے، بلکہ اُمتیوں کو انھیں کے محاورات میں ہدایت اور تعلیمِ احکام فرماتے ہیں۔ جو زبان اُن کے اندر پہلے سے شائع (پھیلی) ہوتی ہے اور سیدھی سادی طرز میں جو کہ معمّیات (پہیلیوں) اور تکلّفات (مصنوعی گفتگو) کے اسلوب سے بہ مراحل دور ہے:

(1) (اللہ تعالیٰ کا) خود ارشادِ صریح موجود ہے:
وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ [28]
(اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے، مگر اپنی قوم کی بولی بولنے والا)

(2) اور قرآن شریف کو مواقع کثیرہ میں "مُبِیْن" [29] فرمایا ہے، تو اَب قرآن مجید کے معنی خلافِ لغت واستعمالِ عرب لینے یا خلافِ صحابہ وتابعین اور دیگر عرب العرباء (خالص عرب) کے، اُس کے مطلب کو چیستاں بنانا بے شک اُسی نظر سے دیکھا جائے گا، جیسے کوئی ہندی، یورپی، کابلی، صرف ونحو کے دو چار رسالے دیکھ کر امرؤ القیس اور لبید (بن ربیعہ) کو اصلاح دینے کے لیے بیٹھ جائے، بلکہ اُس سے بھی کم تر۔ [30]

(خواہش پرستوں کو ''اھلِ اَھوا'' کا خطاب دینے کی وجہ)

اھلِ اَھوا (بہت زیادہ خواہش پرستوں) کو اس خطاب کا مستحق صرف اتنی ہی بات نے بنایا ہے کہ انھوں نے اپنی رائے کو امام بنا کر اور اپنی اغراض کو نصب العین رکھ کر احکامِ وحی کو اُس کے ساتھ کھینچنا چاہا اور کسی کے وفاق و خلاف کی پروا نہ کی اور نقل و عقل میں جب کش مکش پیدا ہوئی تو انھوں نے بہ زورِ عقل اپنی ناقص عقل کو سب پرور (برتر) رکھا اور نصوصِ یقینیہ میں تاویلاتِ نارِوا (ناجائز تاویلات) اور طرح طرح کی حیلہ سازی سے کام لیا۔

(خواہش پرستوں کا توہمات پر مبنی تحریف و تاویل کا طریقہ)

مثال مطلوب ہے تو سنیے! انھیں حضرات نے مخالفتِ نصوص (اللہ کے احکامات کی مخالفت) کے طعن سے بچنے کے لیے ایک قاعدہ عامّۃُ الوُرود (عام طور پر بیان کیا جانے والا قاعدہ) اور ایک چلتی ہوئی تدبیر جگہ جگہ یہ پیش کی کہ خدائے برتر اور رسولِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی جملہ کوئی کلام ہرگز ہرگز خلافِ حقیقت، خلافِ واقع، خلافِ عقل نہیں ہوسکتا۔

یہ قاعدہ فی حدّ ذاتہٖ (اصولی طور پر) ضرور قابلِ تسلیم ہے۔ مگر انھوں نے اس سے یہ کام لینا شروع کیا کہ جب کوئی حکمِ وحی اُن کی نام کی عقل، بلکہ اُن کے وہم کے بھی خلاف نظر آیا اور جس حکم الٰہی سے اُن کو جان بچانی منظور ہوئی، وہاں اپنے توہمات سے ''خلافِ واقع'' اور ''خلافِ عقل'' کا فتویٰ دے کر اُس حکم سے سبک دوش ہو بیٹھے اور نہایت بے فکری، بلکہ سرکشی کے ساتھ انکارِ محض یا تحریف و تاویل — جس سے چاہا — کام لیا۔ چناں چہ:

(۱) رؤیتِ جنابِ باری (اللہ تعالیٰ کی زیارت)

(۲) ثبوتِ تقدیر

(۳) تعذیبِ قبر (قبر کا عذاب)

(۴) وزنِ اعمال (انسانی اعمال کا ترازو میں وزن)

(۵) پُل صراط (حشر کے میدان اور جنت کے درمیان پُل صراط)

(۶) دوزخ جنت کا بالفعل (واقع میں) موجود ہونا

(۷) اور دیگر جزئیاتِ کثیرہ قطعیہ (قطعی شرعی احکامات)

کا خون اُسی شمشیر کے بھروسے اپنی گردن پر لینا بڑے اطمینان کے ساتھ منظور کیا گیا۔

(خواہش پرستوں کی باتوں کا جواب)

افسوس اُن مدعیانِ عقل و اسلام کو اتنا بھی نہ سوجھا کہ کلامِ خداوندی اور کلامِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جیسے مخالفِ حقیقت اور مخالفِ واقع نہیں ہوسکتی۔ ایسی ہی ''واقع'' کے دریافت کرنے کی صورت اس سے بہتر کوئی نہیں کہ خدائے تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی طرف رجوع کیا جاوے۔ جو کوئی طریقہ دربارۂ اخبارِ واقع مخالف کلام اللہ اور احادیثِ صحیحہ ہوگا تو کلام اللہ اور احادیث کے ذریعے سے اُس کی تغلیط کرسکیں گے، پر کلام اللہ اور احادیث کی تغلیط اُس طریقے کے بھروسے ہرگز نہیں کرسکتے۔

www.rahima.org

الغرض! عقل کی بات تو یہ تھی کہ کلام اللہ اور احادیثِ صحیحہ، **نمونۂ صحت و سقمِ دلائلِ عقلیہ** (عقلی دلائل کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار اور نمونہ) سمجھی جاتیں، نہ برعکس۔

علٰی ھٰذا القیاس (اِسی پر قیاس کرتے ہوئے) کلام اللہ اور حدیث کے **مضمونِ متبادر و مطابقِ محاورۂ عرب** (عرب کے محاورے کے مطابق ظاہری طور پر معلوم ہونے والے مضمون) کو جو بہ اعتبارِ قواعدِ صرف ونحو بہ دلالتِ مطابقی سمجھ میں آتا ہو، اُس کو اصل قرار دے کر **دلائلِ عقلیہ** کو اُس پر منطبق کرنا چاہیے۔ اگر کھینچ کھنچا کر بھی (وہ دلائل کلام اللہ کے) مطابق آجاوے تو فَبِہا (ٹھیک ہے)، ورنہ (اور اگر عقلی دلائل اصل کلام اللہ کے مطابق نہیں آتے تو) ع

کالائے زبوں بریشِ خاوند [31]

(خراب مال کا نقصان اُس کے مالک کے ذمہ ہے)

(یعنی عقلی دلائل کے قرآن وسنت کے مطابق نہ ہونے کی ذمہ داری اُن عقلی دلائل گھڑنے والوں پر ہے)

یہ اُن کی عقل کا قصور سمجھا جائے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ اپنے توہمات ومعقولات کو اصل سمجھ کر کلامِ الٰہی اور احادیثِ صحیحہ کو ترک کیا جائے یا اُن کو کھینچ تان کر اپنی عقل کا تابع بنایا جائے۔

اگر آج کوئی جنگلی، دیہاتی، وحشی، بے عقل، بے خبر (آدمی)، ریل اور تار وغیرہ **صنائع عجیبہ** (نئی ایجادات) کے افسانے سن کر اُن کو دُور از عقل بتائے اور اُن کی **تغلیط** (غلط قرار دینے) پر زور دے تو کیا اُس کا یہ انکار اہلِ عقل کے نزدیک قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے؟ یا اُس کا قصورِ عقل سمجھا جائے گا؟

انصاف کیجیے تو خداوندِ عالم کے علم کے سامنے تمام حکما وعقلا کی عقل وفہم کی حقیقت اُس وحشی بے وقوف کی عقل کے برابر بھی کسی طرح نہیں ہوسکتی۔

پھر اُس کے کلام کے مقابلے میں ایسی جرأت معلوم نہیں کس چیز کا نشہ ہے۔ شعر ؎

آناں کہ زِ رُوئے تُو بجائے نگرانند
کوتہ نظر انند ، چہ کوتہ نظر آنند

(وہ لوگ کہ تیرے چہرے کے بجائے کسی اَور طرف دیکھ رہے ہیں
کم نظر ہیں اور کس قدر کم نظر ہیں)

(اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات اور وحی کا انکار محض ہٹ دھرمی ہے)

اس تمام خامہ فرسائی (تحریر کرنے) سے ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ وحیٔ الٰہی کے **واجب التّسلیم** ہونے پر ہرچند کہ تمام اہلِ ادیان متفق ہیں اور اس وجہ سے تمام اہلِ عالم پر قرآن وحدیث کا ماننا ضروری اور اُن کے احکام کا اتباع واجب ہے، مگر مخالفین تو اُس کے کلامِ الٰہی اور احکامِ خداوندی ہونے کے منکر ہوکر بے فکر ہوگئے، حال آں کہ اُن کا یہ انکار محض ہٹ دھرمی ہے۔

چناں چہ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے آیاتِ قرآنی اور روایاتِ حدیث سے اس کی طرف اشارہ کردیا ہے کہ جو وحی جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، وہ ہر پہلو سے قابلِ اطمینان اور **واجب الاتباع** ہے۔ کسی طرح سے اُس میں تردّد اور انکار کی گنجائش نہیں۔ اس سے قبل کسی قدر تفصیل سے اس کو عرض کردیا گیا ہے۔

جس طریقے سے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ — **علیہما السّلام** — کی نبوت ہر کسی کو مُسلَّم ہے، اُسی طریقے سے آپ کی رسالت کی تصدیق کرنی پڑے گی۔ پھر کوئی یہودی یا نصرانی یا کسی ملت کا تابع یا کسی رسول کا اُمتی اُس کا انکار کیوں کر کرسکتا ہے اور اُس کا انکار بروئے انصاف کیوں کر مسموع اور مقبول ہوسکتا ہے۔

اور سوائے اہلِ حق اور اہلِ سنت کے جتنے فرقے مدعیانِ اسلام ہیں، ان سب نے یہ کیا کہ خیالات و اغراضِ مذکورۂ بالا کی وجہ سے تاویل وتحریف، **انکار و تغلیط** (کے لیے) طرح طرح کے حیلوں سے کام لیا اور احکامِ وحی کو بہ زورِ عقل جس سانچے میں چاہا، ڈھال لیا۔ جس کی وجہ سے وہ **قصرِ دین** (دین کا محل) کہ جس کی **تکمیلِ تامّ** (پوری تکمیل) آپؐ کے مبارک ہاتھوں سے ہوچکی تھی اور جس کی حفاظت ہم پر فرض تھی، آج اُس کی چار دیواری اور اُس کے دروازے کا پتہ لگانا ہر ایک کا کام نہیں۔

اور وہ شاہراہِ شریعت، جس کی بابت ملتِ بیضا اور جس کی توصیف میں "**لیلُها و نهارُها سَواء**" [32] ارشادِ (نبویؐ) ہوچکا تھا، اس میں سے چاروں طرف قدم قدم پر اتنی سڑکیں نکالی گئیں کہ اُس شریعتِ بیضا (روشن شریعت) کی برابر تمام عالم میں کوئی بھول بھلیاں نظر نہ آئے گی۔

(حافظ شیرازیؒ نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے) ع

گوئیا باور نمے دارند روزے داورے
کایں ہمہ قلب و دغل درکار داور مے کنند [33]

(گویا انھیں قیامت کے دن پر یقین ہی نہیں ہے
کیوں کہ یہ سب لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دغا اور فریب کما رہے ہیں)

جب دوستوں کی طرف سے یہ حُسنِ سلوک ہے تو پھر دوسروں کی شکایت کیا۔ لیکن اہلِ قلم پر روشن ہوچکا ہے کہ اس تمام اختلال (خلل) وخرابی کی جڑ اور ان تمام مقاصد کا تخم وہی خود رائی ہے، جس نے **ادیانِ سابقہ** (پہلے مذاہب) کو اپنے دست بُرد سے تہ و بالا کرکے صفحۂ ہستی سے اُن کا نام ونشان مٹا چھوڑا۔

(قرآن وحدیث میں خود رائی سے بہت شدت سے روکا گیا ہے)

یہی وجہ ہے کہ اس خانہ برانداز (اپنا گھر اُجاڑنے والی) خود رائی کو کلامِ الٰہی اور احادیث اور اقوالِ علما و اولیا میں نہایت شدّومدّ سے روکا گیا ہے۔ کلامِ الٰہی میں ارشاد ہے:

(۱) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [34] (خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی کا حکم معتبر نہیں۔ ۱۲)

(۲) دوسرے موقع پر — اللہ أکبر! — خاص رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم
مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾ (35)

(اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف سے کچھ باتیں گھڑ کر بیان کرتے تو ہم اُن کا دایاں ہاتھ پکڑ کر گردن اڑا دیتے اور تم میں سے کوئی اُن کو بچا نہ سکتا۔)

(۳) اور ایک موقع پر حضرات صحابہ کو خطاب ہے:

وَاعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ ۚ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (36)

(اے مسلمانو! خوب سمجھ لو کہ تم لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں۔ اگر وہ اکثر باتوں میں تمھاری اطاعت کرتے رہتے تو تم لوگ مشقت میں پڑ جاتے۔)

(۴) اور لیجیے! جملہ اہل ایمان کی نسبت حکم ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ
يُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾ (37)

(یعنی خدا کی قسم ہے کہ وہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہوسکتے، جب تک اپنے جھگڑے میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ اور آپ کے فیصلے سے دل میں ذرا بھی تنگی نہ لاویں اور پوری طرح تسلیم نہ کرلیں۔)

(۵) دوسری جگہ دھمکایا جاتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١﴾ (38)

(یعنی اے ایمان والو! خدا اور رسول سے پیش قدمی نہ کرو۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ وہ تمھارے سب اقوال کو سنتا ہے اور تمھاری سب باتوں کو جانتا ہے۔)

ان آیاتِ واضحہ کو تدبر و انصاف سے ملاحظہ فرمایئے کہ صاف یہ حکم ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو منصبِ حکم نہیں۔ اُس کے سوا حقیقت میں کوئی حاکم نہیں۔ اور خود فخر الانبیا علیہ السلام کو بھی یہ اختیار نہیں کہ اپنی طرف سے حکم دے سکیں اور اللہ کے ذمہ اپنی طرف سے کوئی بات لگا دیں اَوروں (دوسروں) کی تو حقیقت کیا ہے۔

افضل و اَعلَمِ اُمت — یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللّٰہ علیہم — کو ارشاد ہے کہ:

''تم میں رسول اللہ موجود ہیں۔ اُن سے اپنی رائے کی متابعت کی کوئی توقع نہ رکھیے۔ بالفرض ایسا ہو تو تم ہلاک ہوجاؤ''۔ (49)

تمام مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ:

''جب تک ارشادات واحکامِ رسول کو خوش دلی اور اطمینان سے تسلیم نہ کرو گے، ایمان نصیب نہ ہوگا۔ اور تم کو یہ ہرگز نہ کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول کے حکم معلوم ہونے سے پہلے ہی اپنی رائے سے حکم لگانے بیٹھ جاؤ''۔ (40)

www.rahmia.org

اس کے سوا آیات واحادیث واقوالِ اکابر اس بارے میں اس کثرت سے ہیں کہ ہم کو تو سب کا جمع کرنا بھی محال نظر آتا ہے اور نہ اُس کے جمع کرنے کی حاجت ہے۔

(احکامِ الٰہی پر عمل کرنا واجب ہے، اُن میں خود رائی کی اجازت نہیں)

جب یہ امر مُحقَّق و مُسَلَّم (تحقیق شدہ اور تسلیم شدہ) ہے کہ احکامِ الٰہی ہر امر میں **واجبُ التعمیل** (عمل کرنا واجب) ہیں تو اوّل کلامِ الٰہی سے اسی بات کو طے کر لینا چاہیے کہ (خدا تعالیٰ کے علاوہ) دوسروں کو، بالخصوص ہم جیسوں کو اُن احکام میں رائے زنی اور خود رائی کی کہاں تک اجازت ہے۔

اور احکامِ مذکورہ میں کسی حد تک کسی کو اگر رائے زنی کا منصب بھی ہو تو اُس کے لیے کسی نصاب، کسی سند، کسی لیاقت کی ضرورت ہے یا صرف اپنی خوشی پر موقوف ہے۔ جس کا جی چاہے، اُس مجلس شوریٰ کا رُکن بن جائے اور خدا اور رسول کو مشورہ دینے کو تیار ہو جائے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ جو اپنی معمولی جزئیات میں دوسروں کی رائے کے محتاج ہیں، وہ بھی احکامِ خداوندی کی ترمیم واصلاح کرنے کو، بلکہ **احکامِ قطعیہ منصوصہ** (شریعت کے قطعی احکامات) کو نظر بر مصالح واسباب (اسباب اور مصالح پر نظر کرتے ہوئے) اس زمانے میں **واجبُ الترک** (چھوڑ دینے کو واجب) کہنے کو نہایت استقلال اور اطمینان کے ساتھ کمر بستہ ہو جاویں۔

اگر یہ دریافت کیا جائے گا کہ حکم خداوندی کے مقابلے میں اوّل کس نے خود رائی کر کے خطابِ ''رجیم'' اُڑایا تو اس کا جواب شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہے۔ ہر کوئی اس کا جواب جانتا ہے۔ خواہ اُس خود رائی کے وجود کو بھی مانتا ہو یا نہ مانتا ہو۔

نعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا و من سیّئات أعمالنا.

(ان سوالات پر غور کر کے عقل وانصاف کے ساتھ جواب دیجیے)

(1) اگر ہم خدا کے قائل ہیں اور وہ حاکم بلکہ **احکم الحاکمین** اور ہم محکوم محض ہیں۔

(2) اگر ہمارا وجود وعدم اور جملہ منافع اور مضار (نقصانات) اُس کے قبضے میں ہیں۔

(3) اگر اُس کا کوئی خاص سفیر اور رسول ﷺ ہم کو اُس کے قوانین واحکام بہ غرضِ تعمیل پہنچا چکا ہے، بلکہ کر کے دکھلا گیا ہے۔

(4) اگر ہم کو اُس کے ساتھ کسی تعلق کے قائم رکھنے کی حاجت ہے۔

(5) اگر ہم سے کسی وقت ہمارے خیالات اور معاملات کی باز پُرس فرمانے کا اُس کو استحقاق حاصل ہے۔

(6) تو پھر بروئے انصاف ہم کو کیا کرنا چاہیے اور ہمارے موجودہ اقوال وافعال کہاں تک ان امور کے موافق یا مخالف ہیں۔

(7) اور اس پُر اختلاف وقت میں ہم کو من جملہ فِرَق ہائے مذکورۂ بالا (اوپر بیان کیے ہوئے فریقوں میں سے) کس فریق کا اتباع اور کس جماعت میں داخل ہونا چاہیے، یا سب سے یکسو ہو کر اپنا آئین ودین مقرر کرنا چاہیے۔

جس کے دل میں کچھ خیر اور دماغ میں کچھ عقل اور عقل میں کچھ انصاف ہوگا، وہ تو — واللّٰہ! — یہی کہے گا کہ بندے کو خدا اور اُس کے رسول علیہ السلام کے سامنے (ایسے ہی) **''کالمیّت فی ید الغسّال''** (جیسے غسل دینے والے کے ہاتھ میں

مردہ) ہونا ضروری ہے۔

ہاں! جن کو اپنی عقل و کمالات پر ناز اور اپنے نفس کی تابع داری ضروری ہے، وہ بے شک اپنے آپ کو مثل جمادات سمجھ لینا ہرگز گوارا نہ کریں گے۔

لیکن وہ تعلق قوی جو خالق و معبود اور اُس کی مخلوق و عبد (اور بندے) میں مُـحـقّـق (حقیقت میں) ہے اور وہ ربطِ مستحکم (مضبوط رابطہ) جو عِـلّتِ تامّہ اور اُس کے معلولِ تام میں ثابت ہے، اُس پر جس کی نظر ہوگی، اُس کو تو اپنے کسی کمال کا خیال اس موقع میں ہرگز ہرگز سدِراہ (راستے کی رُکاوٹ) نہیں ہوسکتا۔

مگر ہم اس نِـــزاع (جھگڑے) کو فضول سمجھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اچھا صاحب! یہ نہ سہی، مگر اُس کو حاکمِ مطلق اور اپنے آپ کو اُس کا محکومِ محض سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں۔ اَور (دوسرا) جو کوئی حاکم ہوگا، وہ تو ظاہری اور عارضی ہوگا اور اُس کی حکومت بھی محدود ہوگی۔ حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین، اُس کی حکومت اصلی اور حقیقی اور غیر محدود۔

تو اب کسی کو اس کی گنجائش ہے کہ:

(الف) اُس کے احکام کا خلاف کرسکے؟

(ب) یا اپنی رائے سے دوسرا قانون اُس کے قانون کے خلاف مقرر کرے؟

(ج) یا اُس کے قانونِ مقررہ کو اُس کے خلافِ منشا (اُس کی مرضی کے خلاف) اپنی طرف سے مُتغیّر و مُحَرف (تبدیل اور تحریف) کرکے اُس کی ہی مملکت میں پھیلا کر اُس کی رعایا کو باغی بنانے لگے؟

اور کوئی ایسا کرے تو بروئے انصاف وہ کس خطاب کے لائق اور کس سزا کا مستحق ہے۔

و اللّٰہ الھادی وھو الموفّق (اللہ ہی ہدایت دینے والا اور وہی توفیق دینے والا ہے)۔

(سچائی کے ساتھ وحیٔ الٰہی کی اتباع ضروری ہے)

کیا اچھا ہو!

(الف) جو ہم راست بازی (سچائی) کے ساتھ وحیٔ (الٰہی) کی متابعت کریں۔

(ب) اور اپنے توہمات و خیالات کو اُس میں دخل نہ دیں۔

(ج) اور عقائد و اقوال میں تو اس کے پورے مُقیّد (پابند) رہیں۔ ایک اعمال ہی میں نقصان رہے تو رہے۔

باقی اپنی رائے زنی اور آزاد خیالی کے لیے بہت میدان وسیع آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور اس میں جولانی (دوڑنے) سے کون روکتا ہے۔ ؎

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور ولے
رسولؐ کے رہے قدموں پہ سر خدا کے لیے

(ماہنامہ ''القاسم'' میں چھپنے والے مضامین کے متعلق دو اُمور پیشِ نظر ہیں)

اپنی پریشانیٔ تقریر سے معذرت کے بعد (رسالہ ''القاسم'' میں چھپنے والے مضامین سے متعلق) دو امر قابلِ عرض ہیں:

(1۔ وحیٔ الٰہی کی عظمت پر تحریر کیوں ضروری ہے؟)

ایک تو یہ کہ ہم نے جو کچھ وحیٔ الٰہی کے متعلق (اس رسالہ ''القاسم'' میں) عرض کیا، اُس کے باعث (بننے والے) دو امر ہیں:

(الف: سب کے لیے قانون صرف وحیٔ الٰہی ہے، اس کی مخالفت سے بچنا ضروری ہے)

اوّل یہ کہ اسلامی عقائد، اعمال، اَخلاق، اوضاع، عبادات، معاملات، سب کا منشا اور سب کے لیے قانون صرف وحیٔ الٰہی ہے۔ جملہ اُمور میں اُس کی متابعت اور اُس کی مخالفت سے اجتناب ضروری ہے۔ حتیٰ کہ توحید جو اصلُ الأعمال (اعمال کی اصل بنیاد ہے) اور رأس الطّاعات (عبادتوں کی جڑ) ہے، اُس کا بھی وحیٔ الٰہی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ جو توحید ارشادِ وحی کے خلاف ہے، وہ وسوسۂ نفسانی سے زیادہ اعتبار نہیں رکھتی۔

دیکھئے! فلاسفہ، معتزلہ، یہود، نصاریٰ سب ہی (گمراہ فرقے) مُوَحِّد (اللہ کے ایک) ہونے کے مدعی ہیں، مگر بذریعہ وحیٔ الٰہی جو توحید ہم کو بتلائی گئی، چوں کہ ان (گمراہ) فرقوں کی توحید اُس کے خلاف ہے، اس لیے ہم نے — توحید بیان فرمودہ وحیٔ (الٰہی میں بیان کردہ توحید کو) — قبول کر کے اُن سب کی توحید کو غلط اور باطل سمجھا۔

پچھلے دو فرقوں (یہود و نصاریٰ) نے تو (اس سلسلے میں) اتنا توسُّع (وسعت اختیار) کیا کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر دیا، جو صریح کفر ہے۔ اور اوّل دو فرقوں (فلاسفہ اور معتزلہ) نے توحید میں اتنی تنگی کی کہ کمالاتِ خداوندی اور اُس کی صفاتِ ذاتیہ کا بھی انکار کر بیٹھے۔ ہم نے وحی کے مقابلے میں کسی کی نہ مانی اور اِفراط و تفریطِ مذکورہ چھوڑ کر توحید — تعلیم فرمودہ وحی — کو اپنا ایمان بنایا۔

جب ایمان و توحید جس کو اصل الاصول کہنا چاہیے، اُس کا مدار وحی پر ہے تو اَور (دوسرے) اعمال و فروعات کا تابعِ وحی ہونا تو بدیہی ہے۔ اس کے سوا اسلام کی مخالفت اور مذاہبِ اسلامیہ کی کثرت، جو وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اُس کا بڑا منشا یہی ہے کہ پابندیٔ احکامِ وحی میں طرح طرح سے خلل اندازی اور تساہل سے کام لیا جاتا ہے۔ اس جڑ کے درست ہو جانے سے بہت سے اختلافات تو خود بہ خود انشاء اللہ ایسے ہو جائیں گے کہ مشعل لے کر بھی نظر نہ آئیں گے۔ اور یہی وجہ ہے جو حضرت امام بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب میں ایمان سے بھی مقدم وحی کا باب منعقد فرمایا۔

(ب: تمام کاموں میں احکامِ شرعیہ کی اتباع کا خیال رکھا جائے)

دوسرے: رسالہ ''القاسم'' میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ — انشاء اللہ حتّی المقدور — ہر کلی جزوی امر میں مطابقت احکامِ شرعیہ یعنی وحیٔ الٰہی کی متابعت کا پورا خیال رکھا جائے۔

ان دو ضرورتوں (1۔ ''وحیٔ الٰہی کا قانون سب کے لیے'' اور 2۔ ''تمام کاموں میں احکامِ شریعت کی اتباع'') سے مناسب

معلوم ہوا کہ (ماہنامہ ''القاسم'' میں) اوّل وحیٔ الٰہی کے متعلق بہ طور تنبیہ عرض کردیا جائے، بلکہ علمِ وحی کے علاوہ جو دیگر فنون، فصاحت، بلاغت، تاریخ، کلام وغیرہ کے متعلق مضمون شائع ہوں گے، ان میں بھی اُس فن کے ائمہ اور محققین کے حُسنِ اتباع اور اُن کی عظمت کو ملحوظ رکھ کر تحقیق سے کام لیا جاوے گا انشاء اللّٰہ۔

یہ ہرگز نہ ہوگا کہ بلاوجہ وجیہ (بغیر کسی ضروری وجہ کے) اور بلاتحقیق کسی فن کے ائمہ اور محققین کو مطعون بنا کر اپنی سرخروئی اور کمالِ علمی کو دوسروں کی نظر میں موجّہ (قابلِ اعتبار) اور مدلل کرنے کی طمع کی جائے۔

(2۔ ماہنامہ ''القاسم'' میں چھپنے والی تحریرات کا مقصد کسی پر طعنہ زنی یا توہین کرنا نہیں ہے)

دوسری بات قابل عرض یہ ہے کہ — حاشا و کلاَّ — جو ہم کو اس تحریر سے کسی پر طعن یا کسی کی توہین مدِنظر ہو، محض اہلِ اسلام کہ جن میں یہ ننگِ اسلامی بھی شمار ہوتا ہے، اُن کی اصلاح و تنبیہ کی غرض سے اس عرض کی نوبت آئی۔

ہم اپنے سادہ معمولی تحریر کی حقیقت اور ابنائے زمانہ کے مذاق کی کیفیت سے کچھ واقف ضرور ہیں۔ اثنائے تحریر میں بار بار خیال آتا تھا۔ ؎

کَس زبانِ مَرا نمے فہمد
بہ عزیزان چہ التماس کنم (41)

(کوئی میری زبان نہیں سمجھتا
معزز لوگوں سے میں کیا درخواست کروں)

مگر شفیق خیراندیش (بھلائی کا خیال رکھنے والے مہربان) کو مریض کی رغبت اور لذت کا اتنا خیال نہ ہونا چاہیے، جس قدر اس کی صحت و راحت کا۔ اور مریض انجام بین (اپنے انجام سے باخبر مریض) کو بھی اُبالی (ہوئی) کھچڑی کی وہ قدر و منزلت کرنی چاہیے، جو بریانی اور تنجن کی بھی نہ ہو۔ صرف اسی قسم کے خیالات اس عرض (کرنے) کے باعث ہوئے۔ ؎

گو نالہ نارسا ہو، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی، جو مجھ سے ہوسکا (41)

و ما توفیقی إلّا باللّٰہ علیہ توکّلت و إلیہ اُنیب.

حوالہ جات وحواشی

1۔ خطبات و مقالات، افادات: مولانا عبیداللہ سندھیؒ، ص: 96-94 ملخّصاً، طبع: دارالتحقیق والاشاعت، لاہور

2۔ ماہنامہ ''القاسم'' کا پہلا نمونے کا شمارہ، ص: 4، طبع: احمدی پریس، علی گڑھ۔

3۔ دیکھیے! ماہنامہ ''القاسم''، جلد 1، شمارہ 2، بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ، ص: 8 و 9، طبع: مطبع قاسمی دیوبند۔

4۔ دیوانِ شمس، از مولانا جلال الدین رومیؒ، غزل 1621، ص: 568۔

5۔ لسان العرب، مادہ: وحی۔

6۔ وحی الٰہی کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اور اُس کی اقسام کی تفصیلات کے لیے دیکھیے! حاشیہ علیٰ صحیح البخاری، از حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری، ص: 2، طبع: قدیمی کتب خانہ، کراچی۔

7۔ سنن دارمی، حدیث: 3356۔ سنن دارمی کے الفاظ یہ ہیں: ''و فضل کلام اللّٰہ علیٰ سائر الکلام کفضل اللّٰہ علیٰ خلقه''.

8۔ 66-التحریم: 6۔

9۔ 59-الحشر: 7

10۔ 4-النّساء: 163۔

11۔ قرآن حکیم کی سورت النساء کے ان دو رکوعوں میں بڑی تاکید کے ساتھ وحیٔ الٰہی کی عظمت بیان کی گئی ہے۔

(1) پہلے آیت نمبر 163 میں حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کے بعد آنے والے حضرات انبیا علیہم السلام پر نازل ہونے والی وحیٔ الٰہی کے تسلسل کو بیان کیا۔

(2) آیت نمبر 164 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی حقیقت بیان کی گئی۔

(3) پھر آیت نمبر 165 میں انبیا علیہم السلام کو بھیجنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے انسانیت پر حجت کے تمام کرنے کا تذکرہ کیا گیا۔

(4) پھر آیت نمبر 166 میں نبی اکرم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی پر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی اور اپنے فرشتوں کی گواہی کا تذکرہ کیا۔

(5) آیت نمبر 167، 168 اور 169 میں وحیٔ الٰہی کو نہ ماننے والے کافروں اور ظالموں کی گمراہی اور جہنم میں داخل ہونے کا تذکرہ کیا گیا۔

(6) آیت نمبر 170 میں وحیٔ الٰہی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:
''اے لوگو! تمھارے پاس رسول آ چکا ٹھیک بات لے کر تمھارے ربّ کی طرف سے، پس ایمان لاؤ، تاکہ تمھارا بھلا ہو''۔

(7) آیت 171 اور 172 میں دین میں غلو کرنے سے روکتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے کے بجائے خدا ماننے کی تردید کی گئی۔ اُن کی رسالت کی حقانیت واضح کی گئی۔

(8) آیت 173 اور 174 میں وحیٔ الٰہی کو ماننے والے پورے انعامات اور نہ ماننے والوں کو سخت سزا کی وعید سنائی گئی۔

(9) آیت 175 اور 176 میں کل انسانیت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے لوگو! تمھارے پاس تمھارے ربّ کی طرف سے بُرہان (دلیل) پہنچ چکی اور تمھاری طرف ہم نے کھلا اور واضح نور نازل کیا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی اس وحیٔ الٰہی پر ایمان لائیں اور اسے مضبوطی سے پکڑیں گے تو اُن کو اللہ اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور صراطِ مستقیم کا سیدھا راستہ دکھائے گا''۔

حضرت شیخ الہندؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ امام بخاریؒ جب اس باب کے عنوان میں آیت ''اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ'' الآیہ لائے ہیں تو دراصل اُن کے پیشِ نظر وحیٔ الٰہی کے حوالے سے ان آیات میں بیان کردہ مضمون بھی رہا ہے۔

www.rahimia.org

12۔ صحیح مسلم، حدیث: 2333۔

13۔ صحیح بخاری، حدیث: 4592۔

14۔ 41- حم سجدہ: 42۔

15۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، ردیف میم، غزل نمبر: 11، ص: 748۔ نیز دیوانِ حافظ، از حافظ شیراز، ص: 293، طبع: پروگریسیو بکس، لاہور۔

16۔ کلیاتِ حزیں، از شیخ محمد علی حزیں، ص: 154، طبع: منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ۔

17۔ **صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب 53، حدیث نمبر 4950.**

18۔ سنن ترمذی، حدیث: 2167۔

19۔ سنن ترمذی، حدیث: 2641۔

20۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا: ''**لتتّبعُنّ سُنَنَ مَن کان قبلکم شِبرًا شِبرًا، و ذِراعًا ذِراعًا، حتّٰی لو دخلوا جُحر ضبٍّ تبِعتموھم**''. **قلنا: ''یا رسول اللہ! الیھود و النّصاریٰ؟'' قال: ''فمن؟''.**
(صحیح بخاری، **کتاب الاعتصام بالکتاب و السّنّة**، حدیث: 7320)

21۔ دیوانِ غالب، از مرزا اسد اللہ خاں غالبؒ، ص: 108، مطبوعہ: نظامی پریس، بدایوں، 1927ء۔

22۔ کلیاتِ سعدی، از شیخ سعدی شیرازیؒ، ص: 468، طبع؛ مؤسّسۃ الانتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۴۹ھ۔

23۔ **صحیح مسلم، حدیث: 2363.**

24۔ ''**أوتیت علم الأوّلین و الآخرین**'': اس حدیث کا حوالہ ان الفاظ کے ساتھ ہمیں نہیں ملا، البتہ قرآن و حدیث میں بہت سی آیات و روایات میں آپ ﷺ کے علوم کی وسعت بیان کی گئی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:
''**بُعثتُ بجوامع الکلم و نُصرت بالرّعب، فبینا أنا نائم أوتیت بمفاتح خزائن الأرض، فوضعت فی یدی**''.
(**صحیح بخاری، کتابُ الجھاد و السّیر**، حدیث: 2977)
قال صاحب ''الکوثر الجاری إلٰی ریاض أحادیث البخاری'': ''بُعِثتُ بجوامع الکلِم'' أی بالکلمات الجامعة من إضافة الصّفت إلٰی الموصوف. قیل: أراد بھا القرآن، فإنّ فیه علم الأوّلین و الآخرین مع قلّة الألفاظ''. (ص: 4)

25۔ کلیاتِ میر، از میر تقی میر، ص: 74، طبع: منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، 1941ء۔

26۔ کلیاتِ ممنون، از میر نظام الدین ممنون دہلوی، ص: 301، مرتبہ: ڈاکٹر صدیقہ ارمان، طبع: الوقار پبلی کیشنز، لاہور، 1996ء۔

27۔ یہ شعر کس کا ہے؟ معلوم نہیں ہوسکا، البتہ حافظ شیرازی کی غزل کا شعر اس طرح سے ہے ؎
من از بیگانگاں دیگر نہ نالم که با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد
(دیوانِ حافظ، ص: 174، شیخ مبارک علی تاجر کتب، لوہاری گیٹ، لاہور)

28۔ 14- ابراہیم: 4

29۔ 6- الانعام: 59۔

30۔ امرء القیس عرب کا مشہور فصیح و بلیغ شاعر تھا۔ اس کا نام جندح بن حجر الحارث الکندی تھا۔ اس کی پیدائش 500 عیسوی جب کہ وفات 540 عیسوی میں ہوئی۔ اسلام سے چالیس سال پہلے گزرا ہے۔ لبید بھی جاہلیت کا مشہور شاعر تھا۔ اس کا نام ابوعقیل لبید بن ربیعہ بن مالک عامری تھا۔ اس کی پیدائش 560 عیسوی جب کہ وفات 661 عیسوی میں ہوئی۔ اس کی نسبت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ''اُس کا یہ قول نہایت ہی سچا ہے: ''**ألا! کلّ شیء ما خلا اللہ باطل**'' (صحیح بخاری، حدیث: 3841) یعنی خوب سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ کے سوا

تمام چیزیں باطل ہیں۔

31۔ یہ ایک فارسی محاورہ ہے۔ جب کسی آدمی کا مال و اسباب خراب نکل آئے تو اُس کی عقلی ناتجربہ کاری اور خرابی کا مظہر ہوتا ہے۔ لغت میں اس محاورے کے الفاظ کے معانی یہ ہیں: ''کالائے'': مال اسباب اور سامان۔ ''زبوں'': خراب، بُرا، منحوس۔ ''ریش'': داڑھی، زخم۔ ''خاوند'': کسی چیز کا مالک اور خدا۔ (فیروز اللغات۔ فارسی، اُردو)

32۔ حضرت عرباض ابن ساریہ رضی اللہ عنہٗ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''قد ترکتکم علی البیضاء، لیلها کنهارها، لا یزیغ عنها بعدی إلّا هالک، من یعش منکم فسیریٰ اختلافاً کثیراً، فعلیکم بما عرفتم من سنتی و سنّة الخلفاء الراشدین المهدیّین، عضّوا علیها بالنواجذ''.

(سنن ابن ماجہ، کتاب السنہ، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدین المهدیّین، حدیث: 43)

33۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، ردیف الدال، غزل نمبر 142، ص: 547۔

34۔ 12- یوسف: 67۔

35۔ 69- الحاقہ: 47-44۔

36۔ 49- الحجرات: 7۔

37۔ 4- النساء: 65۔

38۔ 49- الحجرات: 1۔

39۔ 49- الحجرات: 7۔

40۔ 4- النساء: 65۔

41۔ کلیاتِ حزیں، از شیخ محمد علی حزیں، ص: 454۔

42۔ دیوانِ درد، از خواجہ میر دردؒ، ص: 123، مرتب: ڈاکٹر نسیم احمد، طبع: مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی، 2003ء۔

☆

www.rahimia.org

مقالاتِ شیخ الہندؒ

دینِ اسلام میں امانت و دیانت کی ضرورت اور اہمیت

''لا إيمان لمن لا أمانة لهٗ'' (حدیثِ نبویؐ)

[جس میں امانت نہیں، اُس کا ایمان نہیں]

تحریر: شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہٗ
تحقیق و تخریج: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

www.rahimia.org

حرفِ تعارُف

برطانوی سامراج کے ہندوستان پر تسلط کے نتیجے میں جہاں علومِ نبوت بالخصوص وحیٔ الٰہی کی اَساس پر سیاسی، معاشی اور معاشرتی تشکیل کے خلاف سوچ اور فکر پیدا کی گئی، وہیں اس خطے میں بسنے والے انسانوں میں بددیانتی اور دھوکا دہی کو فروغ دینے کے لیے سامراجی نظام تشکیل دیا گیا۔ اس خطے میں ولی اللّٰہی سلسلے کے علمائے ربانیین بالخصوص سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور امامِ ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے دارالعلوم دیوبند قائم کر کے ان دونوں محاذوں پر کردار ادا کیا۔ علومِ نبوت کی اساس پر تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور ظلم اور بددیانتی کی بنیاد پر قائم کردہ نظام کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کی امانت و دیانت پر مبنی سوچ اور فکر اور تربیت یافتہ جماعت کو پروان چڑھایا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ انھیں حضرات کے تربیت یافتہ اولوالعزم رہنماؤں میں سے ہیں۔ انھوں نے جہاں عملی طور پر انگریز سامراج کے خلاف آزادی اور حریت کی جنگ لڑی، وہیں علمی اور فکری محاذ پر تحریر و تقریر کے ذریعے سے دینِ اسلام کی سچی انقلابی تعلیمات کے فروغ کے لیے کردار ادا کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی تحریرات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دینِ اسلام کے حوالے سے پیدا ہونے والے عصری چیلنجز کو پیشِ نظر رکھ کر قلم اُٹھاتے ہیں۔ انھوں نے علومِ نبوت اور وحیٔ الٰہی کی عظمت اور اہمیت پر مقالہ سپردِ قلم کیا تو اُن کے پیشِ نظر جہاں دینِ اسلام کی سچی تعلیمات کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے تحریر کرنا تھا، وہیں سامراجی افکار کی روشنی میں پیدا ہونے والے خود ساختہ مسلمان قلم کاروں کی ژولیدگیٔ فکر اور علومِ نبوت کے حوالے سے جہالت اور گمراہی کو بھی آشکارا کرنا تھا۔ اس حوالے سے ماہنامہ

''القاسم'' دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کا طبع شدہ مقالہ ''وحیٔ الٰہی اور اُس کی عظمت'' بہت اہمیت رکھتا ہے، جو اس شمارے میں اس سے قبل تحقیق وتخریج کے بعد پیش کیا جاچکا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا زیرِنظر یہ مقالہ ''دینِ اسلام میں امانت و دیانت کی ضرورت اور اہمیت'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کا اصل عنوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کو بنایا تھا۔ چناں چہ ''القاسم'' میں یہ مقالہ **''لا إيمان لمن لا أمانة لهٗ''** (جس میں امانت نہیں، اُس کا ایمان نہیں) کے عنوان سے 6 قسطوں میں چھپا تھا۔ ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند کے مختلف شماروں میں ذیل کی تفصیل کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی:

1۔ پہلی قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 1، شمارہ: 4، بابت ماہ ذی قعدہ المکرّم ۱۳۲۸ھ صفحہ 1 تا 8

2۔ دوسری قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 1، شمارہ: 7، بابت ماہ صفر المظفّر ۱۳۲۹ھ، ص: 1 تا 12

3۔ تیسری قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 1، شمارہ: 11، بابت ماہ جمادیٰ الثانیہ ۱۳۲۹ھ، ص: 3 تا 10

4۔ چوتھی قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 1، شمارہ: 12، بابت ماہ رجب المرجب ۱۳۲۹ھ، ص: 9 تا 16

5۔ پانچویں قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 2، شمارہ: 1، بابت ماہ شعبان المعظم ۱۳۲۹ھ، ص: 28 تا 32

6۔ چھٹی قسط: ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، جلد: 2، شمارہ: 2، بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ، ص: 9 تا 21

اس اہم ترین مقالے میں حضرت شیخ الہندؒ نے دینِ اسلام میں امانت و دیانت کی قرار واقعی حیثیت کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ آپؒ نے اس حدیث کی روشنی میں یہ واضح کیا ہے کہ جس مسلمان میں امانت و دیانت نہیں، وہ کامل مؤمن نہیں ہوسکتا۔ امانت و دیانت کا تقاضا ہے کہ انسانی سوسائٹی کے لیے جو نظام قائم کیا جائے، وہ حقائق کی بنیاد پر ہو اور حقائق کا صحیح اندازہ انبیا علیہم السلام کے علوم، اُن کی تعلیم و تربیت، اُن کے تیار کردہ صحابہ کرامؓ کی جماعت کے اجتماعی اُمور سے ہوتا ہے۔

حقیقت میں امانت ایک ایسا نور ہے، جو انبیا علیہم السلام کے قلوب پر نازل ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث کی روشنی میں حضرت شیخ الہندؒ نے یہ واضح کیا کہ صحابہ کرامؓ نے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امانت و دیانت سیکھی، پھر قرآن حکیم سیکھا، پھر آپؐ کی سنت سیکھی۔ عملی طور پر صداقت و امانت کے بغیر محض علمی طور پر بلند بانگ دعوے کرنا درست نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وحیٔ الٰہی کے نزول سے پہلے خود نبی اکرمؐ ''صادق'' اور ''امین'' بن کر انسانیت کے سامنے آئے۔ آپؐ نے قبل از نبوت مکہ مکرمہ کے معاشرتی نظام میں بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام لوگوں سے اپنی صداقت اور امانت کا لوہا منوایا اور نزولِ وحی کے بعد اپنے انھی اَخلاق کے سبب دینِ اسلام کے غلبے کا قومی اور بین الاقوامی نظام قائم کیا۔

ہر سامراجی نظام میں امانت و دیانت کا خون پہلے کیا جاتا ہے۔ خیانت، بددیانتی اور دھوکا دہی کو فروغ دے کر مفادات اُٹھائے جاتے ہیں۔ انگریز سامراج نے برعظیم پاک و ہند میں انسانی سماج کے تمام سیاسی، معاشی، انتظامی دائروں میں خیانت پر مبنی نظام استوار کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کا مقالہ اس کے خلاف ایک مزاحمتی سوچ اور فکر پیدا کرتا ہے۔ آج کے اس ماحول میں جہاں برطانوی سامراج کا نظام بدستور ملک اور قوم کے ساتھ خیانت پر اُستوار ہے، ایک صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود یہ مقالہ اپنے اندر تازگیٔ فکر رکھتا ہے۔ اس لیے اسے تحقیق وتخریج کے بعد قارئینِ ''شعور وآ گہی'' کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ مدیرِ اعلیٰ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

’’لا إیمان لمن لا امانة لهٗ‘‘

[جس میں امانت نہیں، اُس کا ایمان نہیں]

پہلے یہ مضمون (وحیٔ الٰہی اور اُس کی عظمت) توضیح اور تفصیل کے ساتھ معروض ہو چکا ہے کہ عقائد و اعمال، عبادات و معاملات، اَخلاق و اوضاع کی بُرائی بھلائی، صحت وسُقم (صحیح اور غلط) کا دار و مدار وحیٔ الٰہی پر ہے۔ بدون (بغیر) اتباعِ وحیٔ ایمان اور دیگر اعمالِ حَسَنہ حقّہ کا میسر آنا ایسا ہے، جیسے بدون قوتِ باصِرہ (دیکھنے کی قوت کے بغیر) دیکھنے کی اور بغیر قوتِ سامِعہ کوئی سننے کی توقع رکھے۔

(ایمان کا دار و مدار اَمانت پر ہے)

اب یہ عنوان جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، یعنی ’’لا إیمان لمن لا أمانة لهٗ‘‘ [1] (جس میں امانت نہیں، اُس کا ایمان نہیں) جو بعینہٖ ارشادِ رسولؐ یعنی: (غیر متلو) ’’وحیٔ الٰہیٔ‘‘ ہے، اس کو دیکھ کر شاید یہ خدشہ ہو کہ وحیٔ الٰہی پر تو ایمان کا موقوف ہونا سمجھ میں آتا تھا، لیکن ’’امانت‘‘ پر ایمان کا موقوف ہونا اور امانت کے موجود اور معدوم ہونے پر ایمان کے وجود اور عدم (نہ ہونے) کا متفرع (نتیجہ) ہونا کیسے قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے۔

(ہر چیز کے وجود کے لیے ’’علّتِ فاعلہ‘‘ اور ’’علّتِ قابلہ‘‘ ضروری ہے)

اس لیے کہ اوّل تو یہ عرض ہے کہ: تمام اہلِ عقل بالبداہت (واضح طور پر) جانتے ہیں کہ ہر چیز اپنے وجود میں جیسے علتِ فاعلہ (فعل کرنے کی صلاحیت) کی محتاج ہے، ایسے ہی علتِ قابلہ (اُس فعل کو قبول کرنے کی صلاحیت) کی دست نِگر ہے۔ دیکھئے وجودِ زراعت جیسے تخم ریزی پر موقوف ہے، ایسے ہی زمین کی — جو قابلِ زراعت ہو — محتاج ہے۔ ورنہ پتھر، لوہے، آگ، پانی وغیرہ سب پر زراعت کرلیا کرتے۔ تعلیم میں جیسے فاعل یعنی مُعلِّم کی ضرورت ہے، ایسی ہی جس کو تعلیم دی جائے، اس کا قابلُ العِلَم (علم کو قبول کرنے والا) ہونا لا بُدّی (ضروری) ہے۔ ورنہ جمادات، ونباتات، و جملہ حیوانات کو بھی مثلِ انسان تعلیم دینا ممکن ہوتا۔

جب یہ مضمون دل نشین ہوگیا کہ ہر امرِ ممکن کا موجود ہونا جیسا کہ وجودِ فاعل اور مؤثر پر موقوف اور اس کا محتاج ہے، ایسا ہی اس امر کو اپنے تحقُّق (حقیقت بننے) میں قابل اور متأثر کی بھی احتیاج ہے۔ اور جب تک یہ دونوں موقوف علیہ — یعنی فاعل اور قابل — متحقق نہ ہوں گے، اُس وقت تک کوئی امر ممکن الوجود (ممکنہ طور پر وجود میں آنے والا کام) موجود نہ ہوسکے گا۔

(''علّتِ قابلہ'' کے مختلف درجات ہوتے ہیں)

تو اب یہ سمجھ لینا بھی کوئی دشوار نہیں کہ ایک چیز کے لیے اگر چند ''قابل'' ہوں تو اُن میں باہم فرقِ مدارج قابلیت بھی ہوا کرتا ہے۔ دیکھ لیجیے تمام قطعاتِ زمین' قابلیتِ زراعت میں اور تمام افرادِ انسان قابل العلم (علم کی قبولیت) ہونے میں ہرگز ہرگز یکساں نہیں، بلکہ ازحد مختلف ہیں۔

اب اس کے بعد یہ التماس ہے کہ اگر ایمان کے لیے:

(الف) وحیٔ الٰہی کو بہ منزلہ ''علّتِ فاعلہ'' مانا جائے۔

(ب) اور امانت کو اُس کے لیے بہ منزلہ ''علّتِ قابلہ'' کہا جائے۔

تو اس کا واجب التسلیم ہونا ایسا ہی بدیہی ہوگا، جیسا کہ زراعت کے لیے:

(الف) تخم ریزی کو ''علّتِ فاعلہ''

(ب) اور زمین کو ''علّتِ قابلہ'' کہنا۔

یا تعلیم کے لیے:

(الف) معلم کو ''علّتِ فاعلہ''

(ب) اور فہمِ متعلّم کو ''علّتِ قابلہ'' کہنا بدیہی امر تھا۔

(''امانت'' کو ایمان کے لیے ''علّتِ قابلہ'' کہنے کی وجہ)

اس کے بعد عاقل منصف اگر کہہ سکتا ہے تو صرف اس قدر کہہ سکتا ہے کہ یہ تو مُسلَّم (تسلیم شدہ) ہے کہ ایمان کے لیے بھی ''علّتِ فاعلہ'' اور ''علّتِ قابلہ'' دونوں کا ہونا ضروری امر ہے اور ایمان کے لیے وحیٔ الٰہی کا بہ منزلِ ''علّتِ فاعلہ'' ہونا بھی درست ہے۔ جیسا کہ پہلے مضمون میں ثابت ہو چکا ہے، لیکن ''امانت'' کو ایمان کے لیے ''علّتِ قابلہ'' کہنا اس کی وجہ کوئی معلوم نہیں ہوتی۔ تو صرف اتنے خدشے کا ازالہ بہت آسان ہے۔ ''امانت'' کے معنی اور مراد سمجھ لینے کے بعد — انشاء اللہ — یہ خلجان (شک وشبہ) پیش ہی نہ آئے گا، بلکہ امانت کا ایمان کے لیے ''علّتِ قابلہ'' اور موقوف علیہ ہونا ضروری التّسلیم (لازمی طور پر تسلیم شدہ) سمجھا جائے گا، جو حدیثِ مذکورۂ بالا کا عین مطلب ہے۔

(''امانت'' اور ''خیانت'' کی تعریف اور اُن کا معنی اور مراد)

سو سنیے کہ لغتِ عرب میں ''امانت'' — (اس کی) ضد خیانت (ہے) — کا نام ہے۔ اور ''خیانت'' اُس کو کہتے ہیں کہ: کسی شخص کو کسی امر میں کسی وجہ سے ہم تو قابلِ اطمینان سمجھیں اور اس سے خیر خواہی اور راست بازی کی توقع کریں، مگر وہ ہم سے بدخواہی اور دھوکے بازی اور بدعہدی اور بدمعاملگی کر جائے۔ (اس حوالے سے) کچھ مال کی ہی تخصیص نہیں۔ مال ہو، خواہ عہد و پیمان ہو، خواہ کوئی معاملہ یا راز یا کوئی مشورہ وغیرہ ہو۔ جب خلافِ اطمینان و توقع کسی بات میں بدخواہی اور بدمعاملگی کی جاوے گی، وہی ''خیانت'' ہوگی۔ تو اب بالضّرور (ضروری ہے کہ) امانت کے یہ معنی ہوں گے کہ: فعل یا قول یا عہد و پیمان یا روپیہ

پیسہ وغیرہ میں کوئی امر خلافِ خیرخواہی اور راست بازی نہ ہو۔ جو کچھ ہو، عین سلوک، عین ایمان داری اور حق پسندی کے ساتھ ہو۔

(دینِ اسلام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی امانت ہے)

جب امانت کے معنی معلوم ہوگئے تو اب سنیے کلام اللہ میں مذکور ہے کہ جب حق تعالیٰ نے مضمون امانت کو مخلوقات میں سے کسی کے ذمے لگانے کی تجویز ظاہر فرمائی تو آسمان و زمین و پہاڑ سب اس بارِ گراں کے تحمل (اٹھانے) سے گھبرا گئے۔ اور کانوں پر ہاتھ دھر گئے، مگر انسان — گٹھڑی کے پورے مت کے ہیٹے — نے اپنے سر لے لیا، جس کا نتیجہ اہلِ ایمان کے لیے نہایت مفید اور دوسروں کے حق میں نہایت مضر ہونے والا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ وہ آیتِ کریمہ یہ ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِينَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٣﴾ (2)

(ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو، پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس کو اٹھائیں، اور اس سے ڈر گئے۔ اور اُٹھا لیا اس کو انسان نے۔ یہ ہے بڑا بے ترس، نادان۔ تاکہ عذاب کرے اللہ منافق مردوں کو اور عورتوں کو، اور شرک والے مردوں کو اور عورتوں کو۔ اور معاف کرے اللہ ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو۔ اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔)

اہلِ علم واقف ہیں کہ ''لِيُعَذِّبَ'' میں جو ''لام'' ہے، یہ ''لام تعلیلیہ'' ہے اور ''لامِ عاقبت'' کہلاتا ہے۔ یعنی انسان کے حق میں تحمُّلِ بارِ امانت (امانت کا بوجھ اٹھانے) کا انجام اور نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ ایمان **مستحقِ تنعیم** (نعمت کے مستحق) اور دوسرے لوگ **مستوجَبِ تعذیب** (عذاب کے سزاوار) ہوگئے۔

جیسے (مثال) ''ضربتُ تادیباً'' میں ''تادیب'' (ادب سکھانے) کو ''ضرب'' (مارنے) کی ''علّتِ غائی'' اور اُس کا نتیجہ کہا جاتا ہے اور یہی بعینہٖ انسان کے مکلّف ہونے کا مطلب ہے۔

سب جانتے ہیں انسان کے مکلّف (شریعت کا پابند) ہونے کا ماحصل (نتیجہ) صرف یہی تو ہے کہ احکامِ خداوندی بجالانے میں مستحقِ ثواب اور خلاف کرنے میں موردِ عقاب ہوگا۔ تو جب تحمُّلِ بارِ امانت (امانت کا بوجھ اٹھانا) انسان کے حق میں موجبِ تعذیب و تنعیم ہوا تو صاف معلوم ہوگیا کہ مدارِ تکلیف اور اُس کا منشا صرف امانت ہے، جس میں صفتِ امانت اور ملکۂ امانت محقق (حقیقت میں) ہوگا۔ وہی تعمیلِ احکامِ خداوندی کا مکلّف ہوگا اور جس میں یہ ملکہ اور استعداد نہ ہوگی، وہ بے شک غیر مکلّف ہوگا۔

حضرت امام غزالی اور قاضی بیضاوی اور شاہ ولی اللہ صاحب — **رحمۃُ اللّٰہ علیہم** — فرماتے ہیں کہ امانت سے یہی مراد ہے کہ تکلیفِ احکامِ خداوندی کو اپنے ذمے لے لینا اور اپنے آپ کو اطاعت کی صورت میں مستحقِ ثواب اور درصورتِ معصیت مستحقِ عذاب تسلیم کر لینا۔ (3)

اس تقریر سے یہ بات بہ خوبی واضح ہوگئی کہ جیسا دیکھنا بصارت پر، اور سننا سماعت پر موقوف ہے، اسی طرح انسان کا ایمان اور جملہ احکام متعلقۂ ایمان کا مکلّف (پابندِ شریعت) ہونا صفتِ امانت پر متفرع (نتیجہ خیز ہوتا) ہے۔ اور صفتِ امانت ان جملہ

www.rahimia.org

تکلیفاتِ شرعیہ کے لیے منشا اور موقوف علیہ ہے تو اب یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ امانت ایمان کے لیے موقوف علیہ اور ضروری ہے۔ بدونِ تحقُّقِ امانت (امانت کی حقیقی صفت کے بغیر) تحقُّقِ ایمان (ایمان کی حقیقت) ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہو تو پھر امانت کا ایمان کے لیے موقوف علیہ ہونا بھی غلط ہوجائے گا اور جمادات وحیوانات کو بھی مثل انسان مکلّف احکامِ شرعیہ کہنا پڑے گا۔ کچھ فرق ہی نہ رہے گا۔ وھو باطل.

(اس حقیقت کے عقلی اور حِسّی دلائل)

اگر توضیح و تفصیل مطلوب ہے تو سنیے! حسبِ ارشاداتِ نقلیہ و دلائلِ عقلیہ و محسوساتِ بدیہیہ جن کی تفصیل میں تطویل (طوالت) ہے، جاننے والوں کو یہ بات بہ خوبی معلوم ہے کہ مخلوقاتِ عالم میں انسان سب سے اشرف اور افضل ہے۔ خصوصاً جمادات و نباتات وحیوانات وغیرہ اشیائے معلومہ محسوسہ پر تو اُس کی افضلیت اسی طرح روشن ہے، جیسے خوب صورتوں کا بدصورتوں پر (شکل و) صورت میں افضل ہونا۔ اور خوش فہموں (اچھے سمجھ دار لوگوں) کا بدفہموں سے فہم میں افضل ہونا ظاہر اور باہر ہے۔ اور اسی وجہ سے منصبِ خلافتِ احکم الحاکمین (اللہ تعالیٰ کی خلافت کا منصب) بھی اسی (انسان) نے اُٹھایا اور بارِ امانت جس کے اٹھانے سے آسمان زمین پہاڑ سب عاجز ہوگئے، وہ بھی اسی ظلوم وجہول (انسان) کو اٹھانا پڑا۔

حافظ شیرازؔ اسی مضمون کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔ شعر ؎

آسماں بارِ امانت نہ توانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند [4]

(آسمان بھی امانت کے بوجھ کو اٹھا نہ سکا
جس وجہ سے قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام نکال دیا گیا)

اب جیسا انسان کا اشرف المخلوقات اور افضل الموجودات کہنا عقلاً اور نقلاً ضروری ہے، ایسا ہی دو امر اَور بھی ضرور التّسلیم (تسلیم کرنا ضروری) ومجمع علیه عقلاً (اور عقلی طور پر اجماعی اور اتفاقی) ہیں:

(اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو امانت دینا حکمت کے مطابق ہے)

اوّل: یہ کہ خداوندِ عالم علیم وحکیم نے اپنی مخلوقات میں جس کو جیسا بنایا اور جو مرتبہ ادنیٰ یا اعلیٰ اُس کو عنایت فرمایا، وہ سراسر حکمت کے مطابق ہے اور ایسا ہی ہونا مناسب تھا۔ اگر کسی موقع خاص میں کسی کو کوئی خلجان پیش آوے یا حکمت کے خلاف نظر آئے تو یہ بالیقین (یقینی طور پر) اس کے فہم کا قصور ہوگا۔ حکم خداوندی کے مطابقِ حکمت ہونے میں اس سے اصلاً اشتباہ (اصولی طور پر شبہ) نہ ہوسکے گا۔ جب ملائکہ مقربین کے (سوال)

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ [5]

(کیا قائم کرتا ہے تُو زمین میں اُس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے۔ اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو۔)

عرض کرنے کا جواب

قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ [6] (فرمایا: بے شک مجھ کو معلوم ہے، جو تم نہیں جانتے۔)

کافی ہوگیا، جس پر ملائکۃ الرّحمٰن (اللہ کے فرشتوں) کو بھی بہ جز سکوت (سوائے خاموشی کے) کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور بالآخر (یہ) عرض کر کے

سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ [7]

(پاک ہے تُو، ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تُو نے ہم کو سکھایا۔ تُو ہی ہے اصل جاننے والا، حکمت والا۔)

اپنے قصور سے معترف ہوئے تو آج وہ کون ہے کہ اُس کے قوی سے قوی خدشے اور اعتراض کے مقابلے میں ہم اس کو یہی جواب دیں اور کافی نہ سمجھا جائے۔

پہلے مضمون میں ہم صاف عرض کر چکے ہیں کہ تمام حکما وعقلا، بلکہ جملہ (تمام) عالَم کے عقل وعلم کی حق تعالیٰ کے علم کے سامنے ہرگز ہرگز اتنی بھی وقعت نہیں ہوسکتی، جیسے جملہ حکما کی عقل کے سامنے کسی جاہل گنوار کی عقل کی حقیقت۔

(اللہ کی رحمت نہ ختم ہونے والی اور تمام مخلوق کو شامل ہے)

دوسرے یہ کہ مثل دیگر صفاتِ کمالیہ حق تعالیٰ کی رحمت بھی غیر متناہی اور تمام مخلوقات کو حاوی ہے۔ (فرمانِ خداوندی:)

وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ [8] (اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو۔)

خود اُس کا ارشادِ صریح موجود ہے۔ دوسرے موقع پر کلامِ الٰہی میں مذکور ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ہَدٰی [9]

(ربّ ہمارا وہ ہے، جس نے دی ہر چیز کو اُس کی صورت، پھر راہ سجھائی۔)

یعنی خالق عالم خبیر وحکیم، رحیم وکریم نے جملہ مخلوقات کو اُن کے مناسبِ شان ومطابقِ حال، اوّل تو صورت وشکل و دیگر اوصافِ قویٰ عنایت فرمائے۔ اُس کے بعد ہر ایک مخلوق کو ان اوصاف وقویٰ سے جو کہ خالق حکیم نے اُن میں ودیعت رکھ دیے تھے، کام لینے اور نفع اٹھانے کے طریقے سمجھا دیے۔ (**فسبحانہ جلّ جلالہ ما عمّ رحمتہٗ و نوالہ**)

و ما أحسن ما قال العارف (حافظ شیرازیؒ نے بہت خوب کہا ہے)۔

جلوہ کرد رخشِ روزِ ازل زیرِ نقاب
عکسے از پرتوِ آں بر رُخِ اِفہام اُفتاد

(روزِ ازل اُس کے چہرے نے زیرِ نقاب اپنا جلوہ دکھایا
تو اُس کے پرتو کی ایک جھلک عقل کے چہرے پر پڑ گئی)

ایں ہمہ عکس مے و نقش مخالف کہ نمود
یک فروغِ رُخِ ساقیست کہ در جام اُفتاد

(شراب کا یہ سارا عکس اور طرح طرح کے نقش جو ظاہر ہوئے ہیں
یہ سب کچھ ساقی کے ہی چہرے کا ایک جلوہ ہے جو کہ پیالے میں پڑ رہا ہے)

پاک بیں از نظرِ پاک بہ مقصود رسید
احوال از چشمِ دو بیں در طمع خام اُفتاد (10)

(پاک نظر سے دیکھنے والا پاک نگاہی کی بدولت اپنے مقصود تک پہنچ گیا ہے
بھینگا ایک چیز کو دو دیکھنے والی آنکھ کے سبب لالچ کی کمزوری میں مبتلا ہوگیا ہے)

(حکمت اور رحمتِ الٰہی تمام مخلوقات کے لیے ہے)

جب (۱) حکمت و (۲) رحمتِ الٰہی دونوں کا عموم وشمول بہ نسبت جملہ مخلوقات (تمام مخلوقات کی نسبت سے عام ہونا) معلوم ہوچکا تو ہر ایک **سلیمُ الطّبع** خود معلوم کرلے گا کہ انسان جس کا کہ اشرف المخلوقات ہونا مُسلَّم ہوچکا ہے، اس کے برابر نہ کوئی مظہرِ حکمت ہوسکتا ہے، نہ مظہرِ رحمت۔ اور یہ بات یوں بھی تو ظاہر اور بدیہی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بادشاہِ وقت کو کوئی مہم یا بھاری کام پیش آتا ہے۔ مثلاً کسی ولایت (ریاست) کو اپنے تصرُّف میں لانا چاہتا ہے، یا کسی ملک کو کسی مخالف سرکش کی دست بُرد سے بچانا چاہتا ہے، یا اہلِ ظلم واہلِ فساد واہلِ بغاوت کے اثر سے ملک کو پاک کرنا اور پاک رکھنا مطلوب (ہوتا) ہے۔ اور اس مہمِ عظیم کا کام لینا اپنے خلیفہ اور نائب سے مقتضائے مصلحت ہوتا ہے تو:

(۱) اوّل تو بادشاہ بیدار مغز اپنے **مقرّبین** اور خواص، اور خواص میں سے (بھی) اُس کو اِس مہم کی انجام دہی کے لیے منتخب اور مقرر کرتا ہے، جو ہر طرح سے لائق اور قابلِ اطمینان اور جماعتِ مقرّبین میں سب پر افضل وممتاز سمجھا جائے۔

(۲) دوسرے اس مہمِ عظیم کی انجام دہی کے لیے جس قدر لشکر اور سامان اور نقد وجنس وغیرہ کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، بے تأمُّل (بغیر کسی تاخیر کے) خزائنِ شاہی سے دو چیزیں امیرِ مذکور کو عطا فرمائی جاتی ہیں۔ اور جملہ لشکر اور تمام انتظامات پر اُس کو اختیاراتِ کلی دے کر اور سب کو اُس کا محکوم اور ماتحت بنا کر بعد عطائے سند وخطاب مہمِ عظیم کی انجام دہی کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

جب خالق علیم **حاکم علی الاطلاق** (مطلق حکمران) نے حضرت آدمؑ کو اپنا خلیفہ اور نائب مقرر فرما کر عالَمِ دنیا کی اصلاح اور درستی کے لیے اور اُس میں احکام وقوانینِ احکم الحاکمین اور سلسلۂ ہدایت جاری کرنے اور پھیلانے کے لیے اس عالَم میں بھیجا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اُس خلیفۂ خاص کے حق میں ہر دو امر مذکورۂ بالا کی رعایت نہ کی گئی ہو۔

سلطانِ وقت بہ وجہ اقتدارِ کلی گو اپنے ماتحتوں اور غلاموں میں سے ادنیٰ سے ادنیٰ کو بھی منصبِ نیابت دے سکتا ہے، مگر اپنی عقل اور بیدار مغزی کی وجہ سے ہرگز کسی نالائق اور ناقابل کو یہ اعلیٰ منصب عطا نہ کرے گا۔

(اللہ کی رحمت اور حکمت بے حد اور بے پایاں ہے)

اسی طرح پر خالق قدیر اپنی قدرت سے جس کو چاہے منصبِ خلافت عطا کرسکتا ہے۔ کون دم مار سکتا ہے، مگر چوں کہ جیسی

اُس کی قدرت غیر متناہی ہے، ایسی ہی اُس کی حکمت بھی بے حدود و بے پایاں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جس کو اُس نے تمام عالَم پر اپنا خلیفہ اور نائب بنا کر ایک امرِ عظیم کی انجام دہی کے لیے مقرر فرمایا، اُس میں:

(الف) اوّل تو امتیاز و افضلیت اور ہر طرح کی لیاقت کی رعایتِ کلی کی گئی ہے۔

(ب) دوسری کارِ خلافت میں جن کمالوں اور شانوں کی حاجت تھی، وہ بِتمامِها (مکمل طور پر) اس خلیفۂ خاص کو ضرور خدا کے غیر متناہی خزانے سے حسبِ حاجت عطا فرمائی گئی ہیں، جس کی تفصیل کی اس موقع پر حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ صرف ارشاد:

''خلق الله آدمَ علیٰ صورته''. (11)

(اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔)

اللہ اکبر! ایک اتنی بڑی بات ہے، جو اہلِ علم کے سمجھنے کے لیے قدرِ کفایت سے بھی بِدرجِها (کئی درجے) زائد ہے۔

(خلافتِ آدم کے لیے کمالِ علمی بنیادی حیثیت رکھتا ہے)

جب یہ بات خوب دل نشیں ہو چکی تو اب سنیے کہ جس قدر کمالات خلیفۂ موصوف (حضرت آدم اور اُن کی اولاد) کو عنایت فرمائے گئے، ان سب میں:

(الف) اوّل و افضل و ضروری کمالِ علمی ہے اور سب کمالات اس کے بعد ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ کی جملہ صفاتِ کمالیہ جن کو مخلوقات سے کوئی تعلق ہے، جیسے قدرت، ارادہ، کلام وغیرہ، ان میں بھی سب سے اقدم اور افضل صفت علم ہی شمار ہوتی ہے۔ ادھر دیکھیے! کہ جب ملائکہ — علیهمُ الصّلوٰة و التّسلیم — کو حضرت آدم کی خلافت میں خلجان پیش آئے، جس کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے تو حضرت آدمؑ اور ملائکہ علیہم السلام کا امتحان علم ہی میں تو لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام، حضرات ملائکہ علیہم السلام پر کمالِ علمی میں ایسے فائق رہے کہ ملائکہ بھی اُن کی افضلیت اور مستحق خلافت ہونے کے معترف ہوگئے۔

آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (12) (اور سکھلا دیے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے) سے لے کر تین چار آیتیں پڑھ جایئے۔ یہ مضمون بہ وضاحت مذکور ہے، جس سے صاف معلوم ہوگیا کہ علم افضل الصفات ہے اور مدار خلافتِ الٰہی اس پر ہے۔ اور حضرت آدمؑ اس کمال میں سب سے فائق اور ممتاز ہیں۔ علاوہ ازیں عالم سے جاہل تک سب کو معلوم ہے کہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہمارا کوئی فعل اختیاری بدونِ علم ہم سے صادر نہیں ہوتا۔ ہر فعل اختیاری کرنے کے لیے ضرور ہے کہ پہلے اُس کا علم حاصل ہو تو پھر فعل مذکور کی نوبت آئے تو اب انصاف فرمایئے کہ خلافتِ خداوندی جیسی عظیم الشان خدمت بدونِ کمالِ علمی کیوں کر انجام پذیر ہوسکتی ہے۔ الحاصل! خلیفہ مذکور کے لیے علم اور علم کا بھی کامل ہونا ضروری ہے۔ بدون اس کمال کے کہ جس کو اصل الکمالات کہنا چاہیے، کارِ خلافت پورا تو کیا، ادھورا بھی نہیں ہوسکتا۔ مگر ظاہر ہے کہ صرف کمالِ علمی سے خدمتِ خلافت کیوں کر انجام پذیر ہوسکتی ہے۔

(خلافت کے لیے قدرت اور قوت بھی ضروری ہے)

علم کے ساتھ ایسی قدرت وقوت کی بھی ضرورت ہے، جس کے ذریعے سے امورِ ضروریہ متعلقۂ خلافت کے خود بھی تعمیل

کر سکے اور دوسروں سے بھی تعمیل کرا سکے۔ بدون ان دونوں کمالوں کے کارِ خلافت انجام دینا ممکن نہیں۔ دیکھئے! اگر علم بھی نہ ہو تو پھر تو کرنا تو درکنار، کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرسکتا اور اگر صرف علم ہو اور قدرت نہ ہو تو ہر چند عمل کا ارادہ تو کرسکتا ہے، مگر عمل کیوں کر کرسکتا ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ قوتِ علمیہ اور قوتِ عملیہ کے بدون (بغیر) کارِ خلافت کی انجام دہی ممکن نہیں۔

اس لیے بہ مقتضائے رحمت وحکمت اور حسبِ ارشادِ (خداوندی) اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى [13] (دی ہر چیز کو اُس کی صورت، پھر راہ سجھائی) اور نیز بہ باعثِ اشرفیت وافضلیت انسان ضرور ہوا کہ انسان ضعیف البُنیان (کمزور جسم) کو کمالِ علمی میں سب سے فائق و برتر بنا کر اس قدر قدرت عطا فرمائی جائے کہ کارِ خلافت کو بہ سہولت انجام دے سکے اور سلسلۂ ہدایت کو عالَم میں پھیلا سکے اور انتظامِ عالَم کو پورا کرسکے، جو کہ اس کی آفرینش سے مقصود ہے۔

(علم اور قدرت کے درمیان نفسانی تقاضے اور طبعی رغبت ونفرت کے پردے حائل ہیں)

اب ان ہر دو کمال کے بعد بہ ظاہر کارِ خلافت کی انجام دہی میں کوئی حالتِ منتظرہ معلوم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ علم' سمجھنے کے لیے اور قدرت' عمل کے لیے کافی ہیں۔ اور واقع میں بھی یہی بات ہے۔ مگر غور سے کام لیجیے تو علم و قدرت کے بیچ میں ایک چیز — کہ جس کو ''اقتضائے نفس وفطرت'' (نفسانی تقاضے) یا ''رغبت ونفرتِ طبعی'' سے تعبیر کیجیے — ایسی حائل و حاجب (رُکاوٹ) ہے کہ باوجود علمِ یقینی ''قدرت'' کو بسا اوقات ''علم'' کے موافق کام کرنے سے روک دیتی ہے، بلکہ یہی اقتضائے نفسانی علمِ یقینی کے بالکل خلافِ قدرت سے کام لے لیتا ہے۔

چور، رہزن، باغی، قاتل وغیرہ جملہ بدمعاشوں کو دیکھ لیجیے کہ بسا اوقات اُن کو اس بات کا علم اور ظنِ غالب ہوتا ہے کہ اس کام کا انجام جیل خانہ، عبور دریائے شور، جلاوطنی، پھانسی اور طرح طرح کی مصیبت اور رُوسیاہی و ذِلت ہے، مگر وہی مقتضائے نفسانی وطبعی ان کے علم کو بالکل معطل و بے کار بنا کر اُن کی قوت وقدرت سے بڑے بڑے سنگین کام لے لیتا ہے اور علم وقدرت طبیعت کے سامنے مغلوب ومجبور ہو کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہیں۔

ہم کو احکامِ خداوندی پر ایمان ویقین ضرور ہے۔ حساب کتاب، ثواب عقاب سب چیزوں کو دل سے مانے ہوئے ہیں، مگر طبیعت کی وہی بے ہودہ رغبت ونفرت اکثر اوقات ہم کو احکم الحاکمین کے اوامر (احکامات) کی تعمیل سے مانع اور اُس کے نواہی (ممنوعات) پر مستعد اور دلیر بنا دیتی ہے اور ہم ہیں کہ اپنے علم وقدرت سب کو بالائے طاق رکھ کر اقتضائے طبیعت (طبعی تقاضے) کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیتے ہیں۔

نعوذ باللّٰہ من شرورِ أنفسنا و من سیّآت أعمالنا.

(اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نفسوں کے شرور اور اپنے اعمال کی برائیوں سے محفوظ رکھے۔)

(انسان میں قُوّتِ مَلَکیّہ اور قُوّتِ بهیمیّہ کے تضاد کے اثرات)

اور اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ خالق کائنات اور حکیم علی الاطلاق نے اپنی قدرتِ قاہرہ اور حکمتِ باہرہ سے انسان کے اندر قُوّتِ مَلَکیّہ اور قُوّتِ بهیمیّہ دونوں رکھ دی ہیں۔ اور ان دونوں متضاد قوتوں میں برابر باہمی تخالف (اختلاف) اور تزاحم

(مزاحمت) رہتا ہے۔ انسان کو اوّل قوت (ملکیّہ) خیر کی طرف کھینچتی ہے تو دوسری قوت (بھیمیّہ) طرح طرح کی خرابیوں اور فسادات میں مبتلا ہونے پر اس کو مجبور کرتی ہے۔ اسی وجہ سے کوئی ''اعلیٰ عِلّیّین'' تک پہنچ جاتا ہے تو کوئی ''اسفل السّافلین'' میں پڑ جاتا ہے۔ اہلِ عقل و انصاف کو اس سے زائد بیان کی حاجت نہیں معلوم ہوتی۔ (14)

(''امانت'' حقیقت میں فطرتِ اسلامی ہے)

سو جب انسان پابندِ ہوا و ہوس کا یہ حال ہے کہ رغبت و نفرتِ طبعی کے مقابلے میں علم و قدرت جیسے کمالات کو خاک میں ملا دیتا ہے اور جس علم و قدرت کی اِعانت و مدد سے اُس رغبتِ مذمومہ اور نفرتِ قبیحہ سے اپنا بچاؤ کرسکتا تھا، اسی علم و قدرت کو اُس رغبت و نفرت کی تحصیل میں صَرف کرنے سے اصلاً باک نہیں کرتا تو اس لیے أحکم الحاکمین، أرحم الرّاحمین نے جہاں اپنے خزانۂ خاص سے اَور (دیگر) کمالات انسان کو عطا فرمائے تھے، ان (علم و قدرت جیسے اعلیٰ) کمالات کی اعانت اور تکمیل اور تقویت کے لیے محض اپنے فضل سے انسان کی اصلی خلقت اور فطرت اور طبیعت میں ایک ملکہ اور ایک خاص صفت ایسی بھی رکھ دی، جو انسان کو اپنے مالک کی محبت واطاعت اور عدل و ہدایت اور راست بازی و حق پسندی اور جملہ امورِ خیر کی طرف رغبت دلائے اور بُری خصلتوں اور بُرے کاموں سے اس کو نفرت دلانے میں سعی کرے۔

سو اسی ملکہ اور اسی قوت کا نام حقیقت میں ''امانت'' ہے اور یہی فطرتِ اسلامی ہے، جو (ارشادِ نبوی ﷺ):

''كُلُّ مولود يولد علىٰ الفطرة فأبواه يُهوّدانه، أو ينصّرانه، أو يمجّسانه الخ''. (15)

(ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اُس کے والدین اُسے یہودی بنا دیتے ہیں، یا وہ اُسے نصرانی بنا دیتے ہیں، یا اُسے مجوسی بنا دیتے ہیں۔)

اور متعدد آیات واحادیث میں مذکور ہے۔

(علم اور امانت کے دونوں کمال تمام انسانیت کے لیے عام ہیں)

سو اب یہ دونوں کمال، یعنی علم اور امانت ہر انسان کے لیے خاص اور تمام افرادِ انسانی کے لیے اسی طرح عام ہیں کہ جس سے کوئی فردِ انسانی خالی نہیں ہوسکتا۔

صانع رحیم وحکیم نے حسبِ بیانِ سابق ہر چیز کو جیسا اس کے مناسب حالات و صفات مختلف عطا فرمائیں، اسی طرح پر انسان اشرف المخلوقات کو جہاں اَور کمالاتِ لائقہ اور فائقہ دیے گئے تھے، وہیں لیاقتِ علم و امانت خصوصیت کے ساتھ ذاتِ انسانیت کو لازم کردیے گئے، تاکہ اپنا فرضِ منصبی — یعنی کارِ خلافت — بہ خوبی انجام دے سکے اور حسبِ متابعت ہدایاتِ خداوندی اور مطابقتِ احکامِ ایزدی تمام مفاسد اور نقصانات ومظالم کا دفعیہ کرکے جملہ عالم کی اصلاح اور درستی میں کوشش کرسکے۔

(علم اور امانت کے مؤیّدات اور مُضِرّات کی اہمیت)

لیکن یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ زراعت میں گو اصل الاصول تو یہی ہے کہ دانے کو زمین کے اندر رکھ دیا جائے، مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی ضرور ہے کہ جن چیزوں کو نشو ونما میں دخل ہے، جیسے پانی، ہوا وغیرہ، وہ چیزیں دانہ کو پہنچائی جائیں اور جو

چیزیں نشو ونما کو مضر ہوں، اُن سب کے اثر سے دانۂ مذکورہ کو بچایا جائے۔ مثلاً پانی کی کثرت یا برف باری کی شدت۔ دیکھیے! اگر زمین شور (نمک شدہ) میں دانہ بَو دیں، یا کھیت کو بَو کر حوض کی طرح اس کو پانی سے بھر دیں یا ہزاروں من مٹی دانہ پر ڈال دیں یا تیز آگ پھیلا دیں تو پھر تو زراعت کیسی؟ خود تخم ہی گل سڑ کر پیوندِ زمین ہو جائے گا یا جل بھن کر رہ جائے گا۔

اب اسی طرح پر خیال فرمالیجیے کہ حسبِ بیانِ سابق یہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ہر ایک آدمی کے اندر جوہرِ علم اور جوہرِ امانت دونوں جوہر پیدا فرما دیے ہیں، مگر صرف اتنی ہی بات سے ہم عالم بن جائیں اور صاحبِ امانت کہلائیں، ایسا خیال کرنا خود اس بات پر دال (دلالت کرتا) ہے کہ ابھی عالم ہونے میں بہت دیر ہے۔

بلکہ جیسا دانے کی نشو ونما اور پھولنے پھلنے کے لیے اُس کی مؤیِّدات (تائید کرنے والے اُمور) کا پہنچانا اور مُضِرّات (نقصان پہنچانے والے اُمور) سے اس کو بچانا ضروری ہے، ایسے ہی ملکۂ علم و امانت کے مُثمِر و مُنتِج ومفید و کارآمد ہونے میں اس کی ضرورت ہے کہ علم و امانت کے مؤیِّدات اور مُتمِّمات اور مُکمِّلات کے حصول میں کوشش کی جائے اور جملہ مُضِرّات ومُفسِدات سے احتراز واجتناب رکھا جائے۔ ورنہ مثل دانۂ مذکورہ قوتِ علم اور قوتِ امانت سے فائدہ تو درکنار، خود علم و امانت ہی خراب و فاسد ہوکر نقصان دہ اور مضرت بخش ہو جائیں گے۔

جب یہ بات ضروری ٹھہری کہ کوئی فردِ انسانی صفتِ علم و صفتِ امانت سے خالی نہیں ہوسکتا، اگر خالی ہوسکتا تو ضرور ہے کہ مثل دیگر مخلوقات غیر مکلّف ہوگا۔ حال آں کہ تمام افرادِ انسانی کا مکلّف اور مخاطبِ احکامِ الٰہی ہونا ضروری امر ہے۔

اور اسی کے ساتھ یہ امر بھی قرار پاچکا کہ جو صفتِ علم اور استعدادِ امانت کہ خالقِ کائنات نے آدمی میں اسی طرح رکھ دی ہے، جیسے قوتِ بصارت وسماعت و رفتار و گفتار وغیرہ۔ اُسی صفتِ علم و امانت کا بذریعۂ مؤیِّدات واسبابِ ظاہری بڑھانا اور اُن کے مضرات ومفسدات سے پرہیز کرنا ہر انسان کے ذمہ لازم اور ضروری ہے۔ ورنہ بدون (بغیر) اس تائید وتقویت کے ان کمالات کے وسیلے سے ہم نفع نہیں اٹھا سکتے۔

اور جو ایسا نہ کرے گا، وہ اپنے مقصودِ اصلی، یعنی اطاعتِ خداوندی اور اپنے کارِ منصبی، یعنی انجام دہیٔ خدمتِ خلافت سے محروم رہ کر (اس ارشادِ ربانی)

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ [16]

(وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ وہی لوگ غافل ہیں۔)

کا پورا منظر اور ارشادِ (ربانی)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ، ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ [17]

(ہم نے بنایا آدمی کو خوب سے اندازے پر۔ پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے نیچے۔)

کا ایک کامل مظہر بن جائے گا۔

(رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا) [18]

(اے ربّ! نہ پھیر ہمارے دلوں کو جب تُو ہم کو ہدایت کر چکا۔)

(اللہ کے دیے ہوئے کمالات کے لیے استعدادِ اصلی اور کسبی کی ضرورت)

الحاصل! اس مضمون کو خوب دل نشین کرلینا چاہیے کہ حق جلّ و علا شانہٗ نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے بے شک انسان کو عجیب عجیب مَلَکات اور کمالات کا مخزون و مظہر بنایا، مگر اُن کمالات کے لیے استعدادِ اصلی اور استعدادِ کسبی دو درجے مقرر فرما دیے:

(الف) استعدادِ اصلی انسان کی حدِ قدرت و اختیار سے بالکل اوپر اور باہر ہے اور اُس میں کمی و بیشی کی بھی گنجائش نہیں۔

(ب) لیکن استعدادِ کسبی میں انسان کے کسب و اختیار کو پورا دخل ہے اور ہمارے کسب و اختیار ہی پر اس کی ترقی و تنزُّل موقوف ہے۔

دور جانے کی ضرورت نہیں۔ حواسِ ظاہرہ ہی کو دیکھ لیجیے کہ بصارت و سماعت وغیرہ کی استعدادِ اصلی اور قوت جو ہم میں اوّل سے موجود ہے، کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف۔ اس میں تو ہمارے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں، بلکہ اندھا مادر زاد جیسا اپنے اختیار سے اندھا نہیں ہوگیا۔ بعینہٖ ایسے ہی آنکھوں والا اپنے اختیار سے بصیر (دیکھنے والا) نہیں ہوا۔

البتہ ان قویٰ (دیکھنے والی قوتوں) سے جو الوان و اَشکالِ مختلفہ (مختلف شکلیں اور رنگ) اور اَصواتِ متبائنہ (ایک دوسرے سے مختلف آوازیں) اور ملموساتِ متفاوتہ (چھوئی ہوئی چیزوں کے درمیان فرق) اور مشموماتِ متمیّزہ (سونگھی گئی چیزوں کی امتیازی خصوصیات) کو اِدراک کرتی ہیں، اُس میں ہمارے قصد و اختیار کو بے شک دخل ہے۔

اور مدرکاتِ مذکورہ کی مشق و مہارت کے بعد ہم اتنی ترقی کرلیتے ہیں کہ اُن مدرکات کے ایسے باریک و دقیق فرقوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ دوسرا آدمی، جس نے یہ مشق و ترقی نہ کی ہو، اُس فرق کے دریافت کرنے سے ایسا عاجز ہوتا ہے کہ بسا اوقات بتلانے کے بعد بھی دریافت نہیں کرسکتا۔ گو اصلی استعداد میں وہ ہم سے بڑھا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔

(تجربے اور مہارت سے انسانی قوتوں کے نتائج کا فرق)

دیکھئے اگر کسی شخص کی قُوّتِ شامّہ (سونگھنے والی قوت) اصل سے بہت قوی ہو، مگر اس کو عطریات کے تجربے اور استعمال کی نوبت نہ آئی ہو تو وہ شخص عطریات کے باریک فرق تو درکنار، موٹے موٹے فرق کے احساس سے بھی بے خبر ہوتا ہے۔ اور دوسرا شخص کہ جس کی قُوّتِ شامّہ پہلے کی برابر یا اس سے کچھ کم ہی کیوں نہ ہو، مگر عطریات کا تجربہ اور مہارتِ تامہ رکھتا ہو تو وہ بے تکلف ایسے ایسے باریک فرق بتلا دیتا ہے کہ ناواقفوں کو سن کر بھی تعجب ہوتا ہے۔

تو اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ علم و امانت کی استعدادِ اصلی جو حکیم علی الاطلاق نے ہر ایک انسان میں رکھ دی ہے۔ کسی میں قوی اور کسی میں ضعیف۔ اس سے تو کوئی شخص خالی اور بے بہرہ نہیں ہوسکتا۔ اور وہ استعداد ہر ایک میں بالفعل (عملاً) موجود ہے۔ آدمی کے کسب و قصد کو اس میں اصلاً دخل نہیں۔

(آیات و احادیث میں ''استعدادِ اصلی'' اور ''استعدادِ کسبی'' کا ذکر)

آیتِ کریمہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ الخ[19] (ہم نے دکھلائی امانت) اور حدیث شریف ''کُلّ مولود یولد علی

الفطرة الخ" [20] جن کا ذکر (پیچھے) آچکا ہے، ان میں ''امانت'' و ''فطرت'' سے سب جانتے ہیں کہ ان کی ''استعدادِ اصلی'' ہی تو مراد ہے، بلکہ اس بارے میں ہمارے مدعائے سابق کے لیے دلیل قطعی ہیں۔ ایسے ہی بعض آیات و احادیث میں ''استعدادِ کسبی'' مراد ہے، جس کو جاننے والے بالبداہت (واضح طور پر) جانتے ہیں۔

بالجملہ علم و امانت کی استعدادِ کسبی کو سمجھ لینے کے بعد اب ان شاء اللہ ہر ایک صاحبِ فہم بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ:

(الف) جیسا آیت وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا الخ [21] (اور سکھلا دیے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے) میں علم کی استعدادِ اصلی کی طرف اور

(ب) آیت قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ [22] (تُو کہہ! کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ؟) میں علم کی استعدادِ کسبی کی طرف اشارہ ہے۔

بعینہٖ اسی طرح پر:

(الف) آیت اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ (ہم نے دکھلائی امانت آسمانوں کو اور زمین کو اور پہاڑوں کو) الخ [23] مرقومہ بالا میں تو امانت کی استعدادِ اصلی کی جانب

اور حدیث شریف مندرجہ عنوان "لا إيمان لمن لا أمانة له" میں امانت کی استعدادِ کسبی کی جانب ایما (اشارہ) ہے۔

کیوں کہ ابھی گزر چکا ہے کہ علم و امانت کی استعدادِ اصلی سے تو کوئی فردِ بشر خالی ہی نہیں اور نہ اس کے ہم مکلّف ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ تکلیف (شریعت کی پابندی) اُن امور کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو بندہ کے اختیار میں ہوں اور استعدادِ اصلی میں بندہ مجبورِ محض ہے۔

تو اب یہ مضمون خوب واضح ہوگیا کہ علم کی استعدادِ اصلی کے لحاظ سے تو ارشاد ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' مندرجہ آیتِ مذکورۂ بالا کا مصداق قیامت تک نہیں مل سکتا۔

اور علیٰ ہذا القیاس امانت کی استعدادِ اصلی کے لحاظ سے فرمان "لا أمانة لهٗ" مندرجہ حدیث کا مصداق بھی نوعِ انسانی میں ہاتھ نہیں آسکتا۔

ہاں! علم اور امانت کی استعدادِ کسبی کے اعتبار سے اَور وہ بھی زمانۂ موجودہ میں ارشاد ''لَا يَعْلَمُوْنَ'' اور "لا أمانة لهٗ" کے افرادِ اوّل نظر (پہلی ہی نظر) میں اتنے نظر آئیں گے کہ ارشاد ''يَعْلَمُوْنَ'' کے مصداق اور متّصفین بالأمانة (امانت کا وصف رکھنے والے) کے افراد سعی اور تلاش کے بعد ہزاروں میں ایک کے ملنے کی بھی وہی توقع کرسکتا ہے کہ جس کو علم و امانت کی اتنی بھی خبر نہ ہو کہ کس چیز کا نام ہے۔ شعر (حافظ شیرازی)

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند
کس بہ میداں در نمے آید سواراں را چہ شد

(بزرگی اور توفیق کی گیند درمیان میں گری پڑی ہے
اور کوئی بھی میدان کی جانب منہ نہیں کر رہا، نہ جانے ان سواروں کو کیا ہوگیا ہے)

www.rahimia.org

حافظ اَسرارِ الٰہی کَس نمے داند خموش
از کہ مے پُرسی کہ دورِ روزگاراں را چہ شد [24]
(اے حافظ! اللہ تعالیٰ کے بھیدوں کو کوئی نہیں جانتا ، تُو خاموش ہوجا
تُو کس سے پوچھ رہا ہے کہ زمانے کی گردش کو کیا ہوا؟)

(ایمان کی نعمت' علم و امانت کی دونوں استعدادوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی)

ان جملہ مضامین کے ضبط کرلینے کے بعد ان شاء اللہ بہ خوبی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ نعمتِ ایمان حاصل ہونے کے لیے بے شک ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر دو کمالِ خداداد یعنی علم اور امانت کی استعدادِ اصلی جو رحیم و حکیم نے زبردستی محض اپنے لطف و کرم سے مثل قوتِ باصرہ اور قوتِ سامعہ وغیرہ ہماری ذات میں پیدا فرما دی ہیں۔ ان کے وسیلے سے اب ہم علم اور امانت کی استعدادِ کسبی حاصل کرنے میں جدوجہد سے کام لیں۔ اور تاوقتیکہ ہم ایسا نہ کریں گے، ہرگز ہرگز اس ذمہ داری سے سبکدوش نہ ہوسکیں گے، جس کو تمام مخلوقات سے آگے بڑھ کر ہم نے اپنے ذمے لیا تھا۔

اور آیتِ مذکورۂ سابقہ جو لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الخ اور يَتُوبُ اللّٰهَ [25] دوصورتیں مذکور ہیں، اُن میں سے اوّل صورت (عذابِ الٰہی) میں رست گاری (چھٹکارہ) اور دوسری صورت (یعنی توبہ) میں شراکت کا کوئی طریقہ بجز اس کے نہیں کہ علم و امانت کی استعدادِ کسبی مذکورۂ بالا کی تحصیل اور تکمیل اور اس کی تعمیل میں پوری چستی اور مستعدی کی جائے۔

کوئی شخص فرض کرلیجیے کہ تمام فنون کا ماہر، بلکہ موجد اور عاقل اور ہفت اقلیم کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، مگر علم و امانتِ مذکورۂ بالا کی استعدادِ کسبی سے اگر بالکل بے خبر اور بے بہرہ ہے تو وہ اپنے مقصودِ اصلی اور کارِ منصبی سے اتنا دور پڑا ہوا ہے کہ جس کا تدارُک وہ کسی طرح نہیں کرسکتا۔ اور ارشادِ مذکورۂ عنوان ''لا إيمان لمن لا أمانة لهٗ'' کا پورا مصداق ہے۔

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ [26] (اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا، جس کو چاہتا ہے۔)

(جوہرِ ایمان کا حصول' احکامِ الٰہی اور امانت کے اوصاف پر موقوف ہے)

ہماری معروضات سے خوب واضح ہوگیا کہ ایمان جو کہ ہر فردِ انسان کے حق میں تمام ضروریات سے ضرورتر اور تمام کمالاتِ انسانیہ کی جڑ ہے اور اس کے بدون (بغیر) انسان بالکل ایسا ہے، جیسا کوئی گھوڑا قوی ہیکل، خوب صورت، تیز رفتار ہوکر ایسا سرکش ہوجائے کہ کسی طرح سواری نہ دے، بلکہ دیوانہ کتے اور بھیڑیے کی طرح مردم دری کرنے (مردوں کو چیرنے پھاڑنے) لگے۔

اس جوہرِ ایمان کا حصول دو چیزوں پر موقوف ہے:

(الف) اوّل: احکامِ الٰہی، یعنی وحی جس کو حسبِ معروضۂ سابق ایمان کے لیے بہ منزلۂ عِلّتِ فاعِلہ کہنا چاہیے۔

(ب) دوسری: صفتِ امانت جس کو ایمان کے حق میں بہ منزلہ عِلّتِ قابلہ سمجھنا چاہیے۔

تاوقتیکہ یہ دونوں کمال نصیب نہ ہوں گے۔ حصولِ ایمان ایسا ہی محال ہوگا، جیسے بغیر تخم ریزی یا بدون (بغیر) زمینِ قابلِ زراعت کوئی نادان حصولِ زراعت کی توقع کرے۔

جس سے ارشاد ''لا إیمان لمن لا أمانة لهٗ'' مرقومۂ عنوان کی حقیقت اور حقِّیت میں کسی قسم کا خلجان (شک وشبہ) نہ رہا اور جو مضمون ضروری ہم کو عرض کرنا تھا، بحمداللہ اس سے فراغت ہو چکی۔

(ایک وضاحت اور تنبیہ؛ صفتِ ایمان کی قلبی کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے؟)

مگر اس کے بعد بہ غرضِ توضیح وتنبیہ یہ بتلا دینا بھی مناسب ہے کہ:

(الف) صفتِ امانت کی اصلاح اور اُس میں ترقی کرنے کی صورت کیا ہے؟

(ب) اور صفتِ امانت، یعنی کسی کی رغبت ونفرت پر معتبر یا غیر معتبر ہونے کا حکم لگانے کی سبیل کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حسبِ ارشاداتِ سابقہ جب علم اور امانت پر ایمان کا دار و مدار ٹھہرا اور ان دونوں کمالوں کی تحصیل ہم پر ضروری ہوئی تو اب:

(۱) علم وحی اور احکامِ خداوندی کے حاصل کرنے کا طریقہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ بذریعہ تعلیم وتعلّم جیسے ہر ایک علم وفن کو ہم حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح پر بذریعہ تعلیم وتعلّم علم وحی کو بھی اگر کوئی حاصل کرنا چاہے تو بے تکلف — اپنی لیاقت کے موافق — حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) لیکن صفتِ امانت جو ایک کیفیتِ قلبی ہے، اس کو دل میں پیدا کرنے کی کیا صورت ہے اور اس میں کمال اور ترقی کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے۔

علاوہ ازیں جب یہ امر مُسَلَّم ہے کہ مضمون امانت اور اس کی استعدادِ اصلی ہر ایک فردِ انسانی میں موجود ہے اور ادھر یہ بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ ہر ایک طبیعت کے ساتھ اس کی مقتضیاتِ مختلفہ (مختلف تقاضے) یعنی کسی امر کا شوق ورغبت اور کسی امر سے اجتناب ونفرت بھی ضروری لگی ہوئی ہیں اور پھر وہ مقتضیات باہم ازحد مختلف ہیں۔

دیکھئے! ایک طبیعت شرک و بت پرستی اور خمر وخنزیر کی طرف اس قدر راغب ہے کہ ان اشیا سے کسی حالت میں رُک ہی نہیں سکتی اور ان کے بدون (بغیر) اس کو چین ہی نہیں آ سکتا۔

اور دوسری طبیعت اشیائے مذکورہ سے اس قدر متنفر (نفرت کرتی) ہے کہ ان کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور کسی طرح ان چیزوں کو گوارا نہیں کر سکتی۔

علٰی هٰذا القیاس جہاں تک نظر جاتی ہے، مرغوباتِ طبائع میں اس قدر تخالُف (اختلاف) اور تبایُن (ایک دوسرے سے دور ہونا) نظر آتا ہے کہ خدا کی پناہ، جس کے روبرو آسمان وزمین کا فرق بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ شعر ؂

و یختلف الرزقان و الشّیء واحد
إلٰی أن یُریٰ إحسان هٰذا، لِذا ذنبا (27)

(دونوں کے رزق (نتائج) مختلف ہوتے ہیں، حالآنکہ چیز ایک ہی ہوتی ہے
یہاں تک کہ کسی ایک کے لیے اسے اچھا سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کے لیے بُرا)

تو اس حالت میں ہم کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ:

(الف) فلاں طبیعت کی رغبت معتبر اور فلاں طبیعت کی غیر معتبر ہے۔

(ب) اور ہمارے پاس کون سا معیار ہے کہ جس کے ذریعے سے ہم صفتِ امانت کی نسبت جو کہ بھلی بُری کی شناخت کے لیے ہر ایک انسان کے اندر موجود ہے، صحت وفساد (صحیح اور غلط) کا حکم لگا سکیں۔

(علم اور صفتِ امانت کی قلبی کیفیت کی پہچان کا طریقہ)

سو امرِ اوّل کا جواب بہ قدر کفایت تو یہی ہے کہ امانت جیسے ایک کیفیتِ قلبی کا نام ہے، ایسے ہی علم بھی تو ایک کیفیتِ قلبی ہی کا نام ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ اعضائے جسمانی کو تو علم ہوتا ہی نہیں۔ علم تو صرف دل کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، شعر ؎

از خواندن علم ہرگز عالم نہ شوی
شیریں نہ شود دہاں زِ نامِ شکّر (28)
(علم پڑھنے سے ہرگز عالم نہیں ہوتا
شکّر کا نام لینے سے منہ میٹھا نہیں ہوتا)

تو پھر بذریعہ تعلیم وتعلّم — جو اعضائے جسمانی؛ زبان، آنکھ، کان کا کام ہے — علم کو — جو کہ امرِ قلبی ہے — کیوں کر ہم حاصل کر لیتے ہیں۔

بس اسی طرح اعضائے جسمانی مذکورۂ بالا کے وسیلے سے صفتِ امانت کو بھی ہم ضرور حاصل کر سکیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کان سے کسی مضمون کا سننا، یا آنکھ سے کسی کتاب کو دیکھنا، یا زبان سے پڑھنا ہرگز علم میں شمار نہیں ہوسکتا، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جو تعلق خاص حکیم علیٰ الاطلاق نے انسان کے حواسِ ظاہرہ اور اس کے قلب میں رکھ دیا ہے، اُس تعلق لطیف کی وجہ سے بذریعہ حواس انسان کو بالبداھت (ظاہری طور پر) علم حاصل ہوجاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حواس کو ہر چند علم تو حاصل نہیں ہوتا، مگر حصولِ علم کے لیے حواسِ ظاہرہ واسطہ بے شک ہوتے ہیں۔ اور یہ امر ایسا بدیہی ہے کہ جس کی تسلیم میں کسی صاحبِ فہم کو خلجان نہیں ہوسکتا۔

بعینہٖ اسی طرح صفتِ امانت کو خیال فرمالیجیے کہ اسی تعلقِ لطیف کی وجہ سے جو کہ انسان کے قوائے ظاہرہ اور قوائے باطنہ میں موجود ہے۔ اگر ہم چاہیں تو بلا تامل (بے سوچے) امورِ ظاہرہ کے ذریعے سے کیفیتِ امانت کی تحصیل وتکمیل میں کوشش کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

(علم اور صفتِ ایمان کی طبعی رغبت پرکھنے کا معیار)

باقی رہا امرِ ثانی کہ کس کی رغبت طبعی اور میلان کو صحیح ومعتبر سمجھیں اور کس پر غلط اور غیر معتبر ہونے کا حکم لگائیں؟

www.rahimia.org

سو ہر چند اس کا جواب مختصر اور عقل کے مطابق صرف یہ ہے کہ:

(الف) جو طبیعت صحیح اور امراض مفسدۂ فطرت سے پاک ہوگی، اس کا اعتبار ہوگا۔

(ب) اور جس طبیعت کو امراض نے خراب اور فاسد کر کے اس کی مرغوبات کو کچھ کا کچھ کر دیا ہو اور امورِ حقہ واقعیہ سے متنفر اور غلط اور بے ہودہ امور کی طرف راغب اور مائل بنا دیا ہو، ایسی بے ہودہ، نکمّی طبیعت کی رغبت ونفرت کا اعتبار وہی کر سکتا ہے کہ جس کی طبیعت اور عقل دونوں مسخ ہو چکی ہوں۔

(معقولات اور محسوساتِ انسانی میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے)

معقولات اور محسوساتِ انسانی دونوں کو ملاحظہ فرما لیجیے کہ ہر ایک میں کس قدر اختلافِ شدید موجود ہے:

(الف) امورِ عقلیہ کے اختلافات کا تو ذکر بھی فضول ہے اور اُن سب کا شمار کرنا بھی ہماری قدرت کے احاطے سے باہر ہے۔

(ب) محسوسات: کہ جن سے زیادہ کوئی چیز ظاہر اور بدیہی نظر نہیں آتی، اُن (کی مثالوں) کو ملاحظہ فرما لیجیے:

(۱) ایک صحیح النظر کسی چیز کو ایک کہتا ہے تو اَحوَل (بھینگا) اسی چیز کو دو دیکھ رہا ہے۔

(۲) ایک صحیح المزاج کو ایک کپڑا سفید نظر آتا ہے، وہی کپڑا مریضِ یرقان کو صاف زرد نظر آرہا ہے۔

(۳) ایک شخص کو مصری شیریں اور لذیذ معلوم ہوتی ہے، دوسرے کو غلبۂ صفرا میں ایلوہ (کڑوے پھل) سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

(۴) ہم کو نیم کی پتی سخت تلخ معلوم ہو رہی ہیں۔ مار گزیدہ (سانپ کاٹے ہوئے) کو اُن میں قند وشکر کا مزہ آرہا ہے۔

(۵) عطر وگلاب کے سونگھنے سے ایک لطیف الدماغ کے گئے ہوئے ہوش لوٹ آتے ہیں۔ گندہ دماغ کے آئے ہوئے ہوش ان کی بُو سے اُڑے جاتے ہیں۔

(۶) جس لالٹین میں مختلف الالوان (مختلف رنگوں کے) آئینے ہوں، اُس میں شمع کسی کو سرخ، کسی کو سبز، کسی کو زرد محسوس ہوتی ہے۔

(۷) حتیٰ کہ سب کو معلوم ہے کہ بسا اوقات شدتِ خوف کی حالت میں آدمی کو:

(i) آنکھوں سے صاف طور پر وہ اَشکال (شکل وصورتیں) نظر آتی ہیں، جن کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔

(ii) اور ایسی آوازیں مسموع (سنائی دیتی) ہوتی ہیں کہ جن کا کہیں وجود بھی نہیں پایا جاتا۔

مگر ان بدیہی اختلافات کے دفع کرنے میں کسی عاقل کو دشواری نہیں ہوتی، بلکہ ہر کوئی یہ کہے گا کہ **جمیع اَمثِلۂ مذکورہ** (اوپر بیان کردہ تمام مثالوں) میں اعتبار اسی کی بات کا ہوگا، جس کا حاسہ (محسوس کرنے والی قوت) صحیح ہو اور کسی امرِ عارضی اور مرضِ خارجی نے اس کے احساس کو خراب اور غلط نہ کر دیا ہو۔ گو ایسا شخص ایک ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کے احساس میں کسی مرض کے باعث فتور موجود ہے، اس کا ہرگز اعتبار نہ ہوگا۔ گو ایسے مریض ہزار دو ہزار یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں، بلکہ خود وہ مریض بھی بشرطیکہ عقل کو جواب نہ دے بیٹھا ہو، اپنے احساس کو غلط اور صحیح المزاج اور صحیح الادراک کے احساس کو درست اور واقع کے مطابق کہے گا۔

(طبیعتوں کے اختلاف کے ہوتے ہوئے یہ اُمور لازمی ہیں)

اب مقتضیاتِ طبائع میں اختلافِ شدید دیکھ کر ہم کو ہرگز پریشان نہ ہونا چاہیے، بلکہ ہم پر لازم ہے کہ:

(الف) اوّل عقلِ خداداد اور غور وانصاف اور قرائن ودلائل اکابر اور تجربہ وغیرہ سے طبیعتِ سلیم اور مریض میں تمیز کریں کہ کون سی طبیعت صحیح اور کون سی بیمار ہے۔

(ب) اُس کے بعد حسبِ قاعدۂ مسلمۂ سابقہ بے تکلف طبیعتِ سلیمہ کی مقتضا کی تصدیق اور مریضہ کی تکذیب اور تغلیط کریں اور کسی سے نہ ڈریں۔

اور کم سے کم یہ بات تو ہم پر فرض ہے کہ جب تک ہم کو کسی کی نسبت دلائل سے یہ اطمینان نہ ہوجائے کہ اس کی طبیعت جملہ اُن امراض اور نقصانات سے پاک ہے کہ جن کی وجہ سے طبیعت کی مقتضیات میں خلل اور فساد آ سکتا ہے، اُس وقت تلک ہم اُس شخص کی رغبت ونفرت کو ہرگز قابل نہ سمجھیں، گو وہ اپنے وقت کا افلاطون اور ارسطو ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر اگر کوئی عاقل ہم کو جاہل کا خطاب دے تو بروئے انصاف ہم کو بُرا ماننا نہ چاہیے۔

(حجت پسند طبائع کو جواب)

مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ حجت پسند طبائع کیا عجب ہے جو صرف اتنی بات فرما کر ہماری تمام جانفشانی کو خاک میں ملا دینے کو موجود ہوجاویں کہ ہم کو تو اپنی عقل وانصاف سے فلاں منشی یا فلاں مولوی یا فلاں فلاسفر یا فلاں ڈاکٹر یا فلاں مسٹر یا فلاں پنڈت کی طبیعت وفطرتِ سلیم وصحیح اور قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے تو ہر چند اہلِ عقل وانصاف کے نزدیک یہ کہنا اس سے بھی بدتر ہے کہ کوئی عقل کا دشمن، طبیعت کا ہٹی، شرم وانصاف کو بغل میں مار کر اَحول (بھینگے) کی نظر اور مریضِ صفرا کے ذائقے اور چمار خاکروب کی قُوّتِ شامّہ (سونگھنے کی قوت) کو قابلِ اعتماد اور لائقِ اعتبار قرار دے کر صحیح النظر اور صحیح المزاج اور لطیف الدماغ کے احساس کی تغلیط پر کمر بستہ ہوجائے۔

تاہم یہ عرض ہے کہ ایسی جرأت کرنا' واقف سلیم الطبع سے تو قیامت تک ممکن نہیں اور ناواقف، فاسد الطبع کا اس اہم معاملے میں کسی درجے اعتبار کرنا اُسی کا کام ہے، جو خود **فاسد الطّبیعت** اور نا قابلِ اعتبار ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ کام تو اُس شخص کا ہے کہ پہلے خود سلیم الفطرت ہو اور اُس کی طبیعت جملہ امراض اور اُن کے علل واسباب سے محفوظ ہو، بلکہ امراضِ فطرت کے معالجات سے بھی واقف ہو۔ **کیف ما اتّفق** (اتفاقی طور پر) کسی فن خاص کا ماہر یا کوئی رند بازاری اس منصبِ اعلیٰ کے لائق کب ہوسکتا ہے۔ شعر ؎

شہپر زاغ و زغن زیبائے صید و قید نیست
کایں کرامت در خور شہباز و شاہیں کردہ اند [29]

(کوّے اور چیلوں کے شہپر قید اور شکار کے قابل نہیں ہیں
کیوں کہ یہ مقام و مرتبہ تو صرف شہباز اور شاہین کو ہی عطا کیا گیا ہے)

اور ہم سے پوچھئے تو وہ حقیقت میں کسی کا بھی پیرو نہیں، صرف اپنی رغباتِ فاسدہ اور خیالاتِ بے ہودہ کا تابع ہے اور کسی فلاسفر یا مولوی یا جاہل کا نام لے دینا ایسا ہی ہے، جیسے ڈوبتا ہوا تنکے کے سہارے کو منظور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

لیکن ہم اگر اس وقت اُن امراض اور اُن کے معالجات کے متعلق بحث کرتے ہیں تو:

(الف) اوّل تو ہم یہ نہیں بتلا سکتے کہ اپنی مختصر سیدھے مطلب سے کس قدر دور جا پڑیں گے۔ اس کے علاوہ جو مطلب ضروری ہم کو یہاں عرض کرنا منظور ہے، اُس کے لیے اس تفصیل اور تطویل کی حاجت بھی نہیں۔

(ب) ان تمام باتوں کے سوا ہم کو اس موقع پر یہ بتلا دینا بھی بہت ضروری ہے کہ کسی شخص کی صفتِ امانت اور کمالِ علم و فطرت میں فائق اور معتبر ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کارِ خلافت اور منصبِ ہدایت جو کہ خاص انسان کو عطا ہوا ہے، اُس کی انجام دہی کے لیے اُس شخص کا علم اور امانت و فطرت کافی ہے اور اُس کو کسی تعلیم و تعلّم کی حاجت نہیں۔ اگر کسی کی نسبت کوئی ایسا خیال کرے تو ع

بالکل غلط غلط غلط ، اور کس قدر غلط [30]

تمام اہلِ عقل کو معلوم ہے کہ کارخانۂ ہدایت اور منصبِ خلافت کا انجام دینا تو حق جل جلالہٗ کے اوامر و نواہی — یعنی اُس کی مرضیات و غیر مرضیات کے جاننے اور اُس کی موافقت و متابعت — پر موقوف ہے اور ان سب کا علم بدوں کسی کے بتلائے یا تو:

(الف) اُس کو ہوسکتا ہے کہ جس کا علم و عقل __ نعوذ باللہ __ حق تعالیٰ کے علم کے برابر ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ اس کے قائل کو احمق کہنا بھی ایسا عزت کا خطاب ہے کہ جس کا مستحق وہ قیامت تلک بھی نہیں ہوسکتا۔

(ب) اور یا اُس شخص کو ان اُمور پر اطلاع ممکن ہے کہ فرض کیجیے کہ اُس کا احساس و انکشاف اس قدر قوی ہو کہ مکنوناتِ علمِ جنابِ باری (اللہ تعالیٰ کے چھپے ہوئے علم) تک اُس کی رسائی ہو۔

مگر ہم بالبداہت دیکھتے ہیں کہ انسان سرتا پا کثافت کے **مافی الضّمیر** (کسی کے ضمیر) تلک تو ہمارا اِحساس پہنچنے سے عاجز ہے۔ اگر کسی کا سینہ، بلکہ دل بھی چیر کر دیکھیں تو اُس کے **مافی الضّمیر** کا نام و نشان بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ پھر حق تعالیٰ شانہ — **لطیف و خبیر، وراءُ الوراء، ثُمّ وراءُ الوراء** — کی مکنوناتِ علمیہ کی نسبت اگر کوئی بھی عقلِ بے باک ایسی بات زبان سے نکالے تو اُس کی زبان پر اگر دسترس مشکل ہوگی تو اپنے کانوں کے بند کرنے میں تو کسی کو بھی تأمُّل نہ ہوگا۔ جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کے بدون (بغیر) بتلائے اور اُس کے بغیر ظاہر فرمائے کسی کو اُس کی مرضیات و غیر مرضیات (پسندیدہ و غیر پسندیدہ) کا علم ممکن نہیں۔

انصاف تو کیجیے کہ اگر انسان کی فطرتِ سلیمہ اور امانتِ صحیحہ اس بارے میں کافی ہوتی تو حکیم علی الاطلاق مثل دیگر فنون و علوم ضرور اس بار (بوجھ) کو بھی ہمارے ذمہ رکھ دیتا۔ اس علمِ خاص کے لیے انبیا علیہم السلام کے بھیجنے اور پھر بذریعہ وحی اپنی مرضیات و غیر مرضیات پر اُن کو اطلاع دینے کی حاجت کیا تھی۔

www.rahmia.org

(کیا رغبت و نفرتِ طبعی قابلِ اعتبار ہے؟)

جب یہ معلوم ہوگیا کہ أفضل البشر اور أکمل البشر اور أعلم البشر ، یعنی انبیائے کرام —علیھم الصّلٰوۃ و السّلام — بھی مرضیات و غیر مرضیات جنابِ باری —عزّ إسمُہ — کے جاننے اور دریافت کرنے میں تعلیم خداوندی اور وحیِ الٰہی کے محتاج ہیں تو اس پر بھی اگر کوئی زید و عمر کی عقل، یا اُن کی رغبت و نفرتِ طبعی کو اس بارے میں کافی سمجھے، یا علمِ الٰہی جو بذریعۂ وحی ہم تلک پہنچا ہے، اُس کے مقابلے میں اُس کا اعتبار کرے تو اُس پر فرض ہے کہ جان دے کر بھی اگر کہیں سے تھوڑی عقل و امانت مل سکے تو ہرگز تأمُّل (کوتاہی) نہ کرے۔ اور بدقسمتی سے اگر عقل و امانت اس طرح پر بھی میسر نہ ہو تو پھر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسی فضول جان کو کیا کرے۔ ہاں! ایک مردِ زندہ دل کی یہ دعا ضرور یاد آتی ہے۔ ع

خونش بہ تیغِ حسرت یا ربّ حلال بادا
صیدے کہ از کمندت ، آزاد رفتہ باشد [31]
(اُس کا خون حسرت کی تلوار سے اے ربّ حلال کردے
ایک شکار جو کمند سے آزاد ہو کر چلا گیا)

الحاصل! جب یہ امر معلوم ہو چکا کہ صفتِ امانت اور سلامتیٔ فطرت کے خراب کرنے والے امراض اور اُن کے علل و اسباب کے بیان میں کچھ طُول (لمبی گفتگو) بھی ہے اور ہمارے مدعا کی تحقیق میں اُن کی حاجت بھی نہیں۔ اور ادھر صرف فطرتِ سلیمہ اور امانتِ صحیحہ سے بغیر اتباعِ وحیٔ الٰہی ہمارا کام بھی نہیں چل سکتا۔ تو ان وجوہ سے اُن کی تفصیل سے قلم کو روک کر بالاجمال (اجمالی طور پر) اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ:

فطرتِ سلیمۂ انسانی کو جس قدر امور فاسد و بیمار و مسخ کردینے والے ہیں، اُن سب کے اصول کل تین ہیں:

(۱) اوّل: نقصان و خرابیِ علم و معرفت

(۲) دوسرے: خواہشاتِ طبعی و نفسانی کی مشغولی اور اُن میں انہماک

(۳) تیسرے: پابندیٔ رسوم، یعنی تحصیلِ کمال و عزت و جاہ و اوضاع و احوال میں طالبانِ دنیا کی موافقت کو پسند کرنا اور اُن کی متابعت کو عقل و نقل پر ترجیح دینا۔

(مطلب کی وضاحت کے لیے عقلی طور پر تسلیم شدہ ایک قاعدہ)

اور ان امراض کی تفصیل اور اُن کے معالجات کو اہلِ علم و فن کے حوالے کر کے وہ بات عرض کیے دیتے ہیں، جس سے بہ سہولت یہ بات معلوم ہوجائے کہ:

(الف) کون سی فطرت و امانت کو صحیح و سالم، قابلِ اعتبار کہنا چاہیے؟

(ب) اور کس کو بیمار، ناقص اور بے ہودہ سمجھنا چاہیے؟

(ہر کمال سے نفع اُٹھانے کے لیے حدود و قیود کا لحاظ رکھنا ضروری ہے)

مگر توضیحِ مطلب سے پہلے ایک قاعدہ بدیہی، جس کی تسلیم میں کسی عاقل کو تأمُّل نہیں ہوسکتا، عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات، حکیم علی الاطلاق نے جس قدر کمالاتِ ظاہری و باطنی انسان اشرف المخلوقات کو عطا فرمائے ہیں، اُن میں ہر ایک کمال سے کوئی نفع خاص مقصود ہے کہ جس کی وجہ سے وہ کمال آدمی کو عطا ہوا ہے اور ہر کمال کے ساتھ حق سبحانہ نے اپنی حکمت و قدرت سے ایسی قیود اور حدود بھی ضرور لگا دی ہیں کہ ہر کمال اپنی تحصیلِ غرض میں اُن قیود کا محتاج اور اُن حدود کا پابند ہے۔ کوئی کمالِ انسانی اپنی احاطۂ مقررہ (مقرر کردہ دائرے) سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ اگر یہ رکھے گا تو وہ کمال مبدل بہ نقصان (نقصان میں تبدیل ہو جائے گا) اور باطل اور غیر مفید ہو جائے گا۔ اور جس قدر فائدہ مند تھا، اُسی قدر ضرر رَساں سمجھا جائے گا۔ اس لیے ہر کمال سے نفع اٹھانے کے لیے اُن قیود و حدود کا پورا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے۔

(آنکھ کے کمال کی حدود و قیود)

مثلاً آنکھ جو عطا ہوئی ہے، ہر چند اُس کو ہمارے جمال میں بھی پورا دخل ہے، مگر سب جانتے ہیں کہ غرضِ اصلی آنکھ سے مُبصَرات (دیکھی جانے والی چیزوں) کا دیکھنا اور بھلے بُرے کی تمیز ہے۔ اور اسی کے ساتھ آنکھ سے دیکھنے کے لیے متعدد شرائط اور قیود بھی ہیں، جن کے بدون (بغیر) آنکھ اپنا کام کرنے سے عاجز و مجبور ہے۔ اگر اپنے اُس احاطے سے جو قدرت و حکمتِ الٰہی نے اُس کے واسطے مقرر فرمایا ہے، ایک قدم بھی باہر رکھیں گے تو آنکھ کا وجود اُس کے عدم سے زیادہ مفید نہ ہوگا۔

دیکھیے! آنکھ اُسی چیز کو دیکھ سکتی ہے:

(الف) جو موجود بھی ہو۔

(ب) اور مثل اجسامِ محسوسہ و اَشکال و اَلوانِ مختلفہ وہ چیز کثیف بھی ہو اور نار (آگ) کی طرح لطیف نہ ہو۔

(ج) اور وہ چیز آنکھ کے سامنے ایک خاص دوری پر بھی ہو۔ آنکھ کے متصل یا بہت بعید نہ ہو۔

(د) اور وہاں روشنی بھی ہو۔

تو اب کسی شخص کو اختلالِ دماغ کی حالت میں اگر وہ چیزیں نظر آنے لگیں، جن کا وجود ہی نہیں تو اُس پر سب خللِ دماغ کا حکم لگائیں گے۔ اُس کی رؤیت کو ہرگز معتبر نہ سمجھیں گے، یا کوئی یہ دعویٰ کرے کہ مجھ کو ہوا بھی نظر آتی ہے، یا میں ہندوستان میں بیٹھے ہوئے تمام یورپ کی سیر کر لیتا ہوں تو کوئی عقل کا اندھا بھی یہ نہ کہے گا کہ اُس کی نظر بہت تیز اور قوی ہے کہ اس قدر اشیائے لطیفہ اور بعیدہ کو دیکھ رہا ہے، بلکہ ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ اُس کے دماغ و حواس میں خلل ہے، یا دیدہ و دانستہ دروغ بے فروغ حماقت سے بک رہا ہے۔ اسی طرح پر جملہ حواس کا حال خیال فرمالیجیے۔

(تمام کمالات میں علم سب سے افضل اور وسیع ہے)

جب یہ قاعدہ واضح ہو چکا تو اب سنیے کہ صفحاتِ گزشتہ میں مذکور ہو چکا ہے کہ انسان — أفضل المُمکِنات — کو جو اوّل درجے کا کمال عطا ہوا ہے، وہ علم ہے، جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت اور حکمت کی شناخت اور بالخصوص حق سبحانہ تعالیٰ کی مرضیات

اور غیر مرضیات کے دریافت کرنے کے لیے عطا ہوا ہے۔ اور اس کمال کا **أفضل الکمالات** ہونا ایسا ہی مُسلَّم ہے، جیسا انسان کا **أفضل المخلوقات** ہونا قابلِ قبول ہے۔

اور اس کمالِ (علم) میں صانع حکیم و رحیم نے اس قدر وسعت عطا فرمائی ہے کہ حواسِ (خمسہ) میں کسی کو نصیب نہیں۔

آنکھ کی طرح:

(الف) نہ روشنی کا محتاج ہے،

(ب) اور نہ روبرو ہونے کی ضرورت،

(ج) نہ قربِ مکانی (فاصلے کے قریب ہونے) کی پابندی،

(د) نہ اتحادِ زمانی (ایک زمانے میں ہونے) کی حاجت۔

(ہ) دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، قریب بعید، حاضر غائب سب طرف اُس کی رسائی یکساں ہے۔

(و) بلکہ **معدومات** (وجود نہ رکھنے والی) اور **مُمتنَعات** (ممکن نہ ہونے والی اشیا) تلک اُس کی دسترس نظر آتی ہے۔

(ز) وسعتِ علم کے مقابلے میں آسمان و زمین کی وسعت بھی ہیچ نظر آتی ہے۔

(ح) امورِ موجودہ اور گزشتہ و آئندہ سب اُس کے جولان گاہ ہیں۔

مگر باوجود اس قدر پھیلاؤ اور وسعت کے — جو کسی احساس و ادراک کو نصیب نہیں — سب کو معلوم ہے کہ علم بھی ایک احاطے میں مُقیَّد (پابند) ہے اور اُس کی رسائی کے لیے بھی ایک شاہراہ مقرر ہے۔

(علم بھی کچھ واسطوں اور وسائل کا محتاج ہے)

جاننے والے خوب جانتے ہیں علم انسانی نہ جملہ معلومات کو دریافت کرسکتا ہے اور نہ یہ کرسکتا ہے کہ جس طریقے سے چاہے **کیف ما اتّفق** (کسی بھی کیفیت سے) کسی اَمر کو معلوم کرلیا کرے۔ بلکہ بعض معلومات تو ایسی ہیں کہ علمِ بشری وہاں تلک پہنچنے ہی میں عاجز اور قاصر ہے اور جن امور تلک اُس کی رسائی ممکن ہے، اُن کے دریافت کرنے میں **وسائطِ مخصوصہ** (خاص واسطے) اور **اسبابِ مُقرَّرہ** (مقرر کردہ اسباب و عِلل) کا محتاج ہے کہ بدون اُن وسائل کے علم کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔

دیکھیے! دُخان (دھوئیں) کے ذریعے سے تو بے شک ہماری عقل کو آگ تلک رسائی ہوسکتی ہے، مگر گرد و غبار کے ذریعے سے آگ کا علم ہرگز ''علم'' نہ ہوگا، بلکہ ''جہل مرکب'' ہوگا۔

الحاصل! جن وسائط (واسطوں) اور وسائل سے ہم کسی امر کو دریافت کرنا چاہیں گے، تاوقتیکہ وہ وسائل حقیقت میں وسائل اور واقع میں معتبر نہ ہوں گے۔ اُن سے جو علم حاصل ہوگا، وہ سراسر جہل ہوگا۔ کیوں کہ 'واقع' علم کا تابع نہیں ہوتا، بلکہ 'علم' واقع کا تابع ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ علم کا تابع معلوم ہونا' اہلِ علم میں مشہور اور بدیہی مسئلہ ہے۔

(علم کا واقع کے تابع ہونے کی ایک مثال)

اگر تمام ماہرانِ ہیئت (علمِ فلکیات) و ریاضی اپنے معتبر نقشوں اور گھڑی گھنٹوں کے حساب سے اس بات پر متفق ہوجائیں

کہ آفتاب اس وقت بالکل غروب ہو چکا ہے۔ اور فرض کیجیے آفتاب کا کنارہ کسی قدر باقی ہے تو یہ ہرگز نہ ہوگا کہ اُن ماہرانِ ہیئت اور اُن کے نقشہ جات و آلات کے (باہمی) اتفاق کے باعث آفتاب واقع میں غروب ہوجائے گا، بلکہ واقع میں اُن کا قول غلط اور اُن کا علم سراسر جہل شمار ہوگا۔

اسی طرح پر اگر نفسُ الامر (حقیقت) میں:

(الف) عالَم (کائنات) کے لیے کوئی صانع (بنانے والا) اور خالق (پیدا کرنے والا) ہے۔

(ب) یا خالقِ کائنات کے لیے توحید اور اُس کا ایک ہونا ضرور ہے۔

(ج) یا یہ صحیح ہے کہ جس قدر امور چھوٹے بڑے ہیں، وہ سب اُس (اللہ تعالیٰ) کے علم میں مقدر اور مقرر ہو چکے ہیں۔

(د) یا عالَم (کائنات) کا حادِث (ناپید) ہونا واقعی بات ہے۔

تو پھر اگر تمام مدعیانِ عقل و علم بھی بالفرض:

(الف) وجودِ صانع کا انکار کریں

(ب) یا دو تین خدا کے قائل ہوجائیں

(ج) یا تقدیر کا انکار کرنے لگیں

(د) یا عالَم کے قدیم ہونے کے معتقد ہوجائیں

تو اس اتفاق سے ہرگز ہرگز یہ نہ ہوگا کہ:

(الف) وجودِ صانع میں ادنیٰ سا ضعف (کمزوری) بھی آسکے

(ب) یا اُس کی توحید میں خلل آجائے

(ج) یا تقدیر کا مسئلہ غلط ہوجائے

(د) یا عالَم (کائنات) قدیم بن جائے،

بلکہ اُن تمام مدعیانِ عقل کا قول محض غلط، سفید جھوٹ اور اُن کا علم سراسر جہل ہوگا۔ یہ نہ ہوگا کہ اُن کے سمجھنے یا کہنے سے جو امر واقعی ہے، وہ بدل کر اُن کے علم کے موافق اور اُس کا تابع ہوجائے گا۔ اور یہ بات ایسی بدیہی ہے، جس کی تسلیم میں کوئی فہیم (سمجھ دار آدمی) متأمّل نہیں ہوسکتا۔

(صفتِ امانت کے صحیح اور غلط معلوم کرنے کا قاعدہ)

جب یہ قاعدہ ذہن نشین ہو چکا کہ انسان کے ہر ایک کمال، ہر ایک اِدراک کے لیے ضروری ہے کہ کوئی امر خاص منفعتِ مخصوص اُس سے مطلوب ہو کہ بہ پابندیٔ قیودِ معتبرہ و حدودِ مقررہ وہ غرض اُس کمال سے حاصل کی جاسکے۔ تو اب صفتِ امانت کہ جس کی صحت و فساد کا قاعدہ معلوم کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود ہے، اُس کو بھی ہم اگر اس قاعدے کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں تو الحمدُ لِلّٰہ کوئی خلجان اور دُشواری نظر نہیں آتی، بلکہ جیسا تمام حواسِ ظاہرہ اور عقل و علم کی صحت و سُقم میں اس مختصر قاعدے سے ہم تمیز کر سکتے ہیں، اُسی طرح صفتِ امانت کی صحت و سُقم کو بے تکلف قاعدہ مذکورہ کے ذریعے سے ہم سمجھ سکتے ہیں۔

www.rahimia.org

(صفتِ امانت کا مقصد قوتِ بہیمی کی مُضرَّت سے بچنا ہے)

اوراقِ گزشتہ میں بالتفصیل گزر چکا ہے کہ جوہرِ عقل وعلم جو انسان کو ہر چیز کی حقیقت شناسی اور مرتبہ دانی کے لیے عطا ہوا تھا، اُس کی تائید و تکمیل کے لیے ہم کو قدرت و اختیار عنایت ہوا تھا، تاکہ حسبِ ہدایت علم اپنے قویٰ و اعضا سے اعمالِ حسنہ بھی کرسکیں، لیکن قُوّتِ بھیمیہ جو انسان کی عقل وعلم پر غالب آکر اُس قدرت سے بسا اوقات خلافِ عقل وعلم کام لینے لگتی ہے تو خالق حکیم نے انسان کو اُس مُضرَّت سے محفوظ رکھنے کے لیے عقل وعلم کو ایک مددگارِ خاص مرحمت فرمایا کہ قُوّتِ بھیمیّہ کے تغلُّب (غلبے) سے ہم کو بچائے اور ہماری قدرت و اختیار کو عقل وعلم کی نافرمانی سے روکے اور اسی کا نام فطرت اور امانت ہے۔ انتھی۔ اب اس مضمونِ مذکورۂ اَوراقِ بالا سے صفتِ امانت کا حال بہ خوبی معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ صفتِ امانت سے مقصودِ اصلی کیا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صفتِ امانت کارپردازی کے لیے کون سا احاطہ محدود ہے۔

(صحیح امانت' علم کے تابع اور عقل کی مددگار ہوتی ہے)

دیکھ لیجیے! غرضِ اصلی صفتِ امانت کی تو یہ ہوئی کہ ہم کو قوتِ بہیمی کی مضرت سے بچائے اور بُری باتوں سے روکے اور پہلی باتوں پر چلائے اور اُن کی طرف کھینچے۔ اور حدود اور احاطے کی بابت یہ بات تو واضح ہوگئی کہ یہ امر ضروری ہے کہ صفتِ امانت متابعتِ علم اور اعانتِ عقل سے سرِمُو متجاوز نہ ہو۔ اس کے سوا اگر اَور حدود و قیود بھی اُس کے لیے ہوں تو اُن سے ہم کو انکار نہیں۔

(امانت کی ضد ''فتنہ'' ہے)

ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ اگر صفتِ امانت متابعتِ عقل وعلم سے ذرا بھی متجاوز ہوگی تو وہ امانت صحیحہ نہیں ہوسکتی۔ بلکہ جیسا علم اپنے احاطے سے نکل کر ''علم'' نہیں رہتا، ضدِ علم یعنی ''جہل'' ہوجاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح امانت اپنی حد سے اِدھر اُدھر ہوکر حقیقت میں ''امانت'' نہ رہے گی، بلکہ ضدِ امانت ہوجائے گی، جس کو حقائق شناس ''فتنہ'' کہتے ہیں۔ کیوں کہ جیسا امانت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کو امورِ حقّہ واقعیہ کی طرف راغب بنائے اور غلط اور باطل باتوں سے نفرت دلائے۔ ایسا ہی فتنہ درحقیقت اُس حالت اور کیفیت کا نام ہے، جو ہماری نظروں میں سچی باتوں کو غلط اور غلط باتوں کو سچا کرکے دکھائے اور مرغوباتِ اصلیہ (اصلی پسندیدہ چیزوں) کو مکروہ اور مکروہاتِ اصلیہ (اصلی ناپسندیدہ چیزوں) کو مرغوب بنادے، جو سخت مہلک مرض ہے۔ **نعوذ باللّٰہ من الفِتَن ما ظھر منھا و ما بطن** (ہم ظاہری اور باطنی فتنوں سے اللہ تعالیٰ ہی سے پناہ چاہتے ہیں)۔

(امانتِ صحیحہ اور فطرتِ سلیمہ' علمِ وحیٔ الٰہی کے تابع ہوتی ہے)

اب ان شاء اللہ ہر ایک عاقل منصف بے سمجھائے سمجھ سکتا ہے کہ فطرتِ سلیمہ اور امانتِ صحیحہ کی پوری اور بے تکلف یہ شناخت ہے کہ عقل وعلم کی تابع ہو۔ بالخصوص علم وحی کہ جس میں کسی قسم کی غلطی کا امکان بھی نہیں اور اُس کا مطابقِ واقع — یعنی اُس (وحی) کا علم — ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ اُس کی پیروی اور موافقت تو ''امانتِ صحیحہ'' کے لیے اور اُس کی مخالفت ''امانتِ فاسدہ'' کے لیے اوّل اور قوی تر شناخت ہے۔ اور جیسا کسی کا علم' واقع اور احکامِ خداوندی کے مخالف ہوکر ''علم'' نہیں ہوسکتا، بلکہ

''جہلِ مرکب'' بن جاتا ہے، اسی طرح پر وہ فطرت و امانت جو علم اور عقل اور واقع کے خلاف ہو، ہرگز امانت ہی نہیں ہوسکتی۔ حقیقت شناس بے تأمُّل اُس کو ''فتنہ'' کہیں گے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (32) (اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔)

(ایمان کا حصول علمِ وحی اور صفتِ امانت دونوں پر موقوف ہے)

ہم کو امید ہوتی ہے کہ ہماری تمام معروضات کو سمجھ کر ان شاء اللہ اہلِ فہم و انصاف کو حدیث شریف مرقومہ عنوان کے سمجھنے میں کوئی اِشتِباہ (شک وشبہ) خلجان (پریشانی) میں نہ ڈالے گا۔ اور ایمان کے لیے وحی کو بہ منزلۂ عِلّتِ فاعِلہ اور صفتِ امانت کو بہ منزلہ عِلّتِ قابلہ تسلیم کرنے میں کسی قسم کا تردّد پیش نہ آئے گا۔ اور خوب سمجھ لے گا کہ ایمان کا حاصل ہونا علم وحی اور صفتِ امانت دونوں پر موقوف ہے۔ جس کو ان دونوں کمالوں سے جتنا حصہ ملے گا، اُسی درجے کا اُس کا ایمان سمجھا جائے گا اور ان ہر دو کمال میں سے اگر ایک کمال سے بھی کوئی محروم ہوگا تو پھر حصولِ ایمان کی توقع ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' کا مصداق ہے۔

تمام جہان کے کمالات بھی اگر کسی (انسان) میں تجویز کرلیے جائیں تو ان ہر دو کمال میں سے کسی ایک کمال کی بھی مکافات (بھرپائی) نہیں کرسکتے۔ عاقل، عالم، حکیم، موجد، علامہ، وحیدِ دہر، مصلح قوم، وسیع الحوصلہ، اولوالعزم، دُوراندیش، محقق، ماہر وغیرہ وغیرہ جس قدر خطابات چاہیے، کسی کو دیے جائیں، مگر مؤمن ہونے کا استحقاق کسی کو جب ہی نصیب ہوسکتا ہے کہ ہر دو کمال مذکورہ بالا سے کافی اور ضروری حصہ حاصل کرلے۔

بلکہ حسبِ ارشاد سیّد المرسلین —علیه الصّلوٰة و التّسليم—

"يقال للرّجل: ما أعقله! ما أظرفه! و ما أجلده! و ما فی قلبه مثقال حبّة خردل إيمان" أو كما قال عليه السّلام. (33)

(یعنی قربِ قیامت میں یہ حالت ہوگی کہ بعض لوگوں کی نسبت لوگ کہیں گے کہ: نہایت ہی عاقل، نہایت ہی ظریف، نہایت ہی جری آدمی ہے۔ حال آں کہ اُس کے دل میں ذرّہ بھر ایمان بھی نہیں ہوگا۔)

بغیر حصولِ دولتِ ایمان کوئی کمال اور کوئی خوبی مستحق تحسین اور قابل اعتبار ہی نہیں ہوسکتی۔ یعنی غیر مؤمن کی سچی تعریف بھی ناپسند ہے۔ اگر کوئی شخص دائرۂ ایمانی سے باہر اور احاطۂ احکامِ خداوندی سے آزاد رہ کر کمالاتِ انسانی بھی بالفرض حاصل کرلے اور عالم کے تمام علوم وفنون پر حاوی ہوجائے تو نظرِ حقیقت شناس اُس کو ایسا سمجھے گی، جیسے عمدہ کپڑا بنایا تو گیا تھا پہننے کے لیے، مگر کسی کوتاہ نظر حریص نے اُس کو جلا کر چائے پکالی یا حقہ بھرلیا۔

نعوذ بالله من الجهل و الغباوة (جہل وغباوۃ (حماقت) سے خدا کی پناہ ۱۲)۔

اس پر بھی اگر کوئی علم وحی اور صفتِ امانت کو تمام علوم سے افضل وضروری اور جملہ کمالاتِ انسانی سے برتر اور لا بُد (ضروری) نہ سمجھے تو اُس سے زیادہ جاہل، امانت سے محروم، فتنے میں مبتلا اَور کون ہوگا۔

الحمدللہ! ہماری معروضاتِ سابقہ و لاحقہ سے یہ بات تو خوب محقق ہوگئی کہ ایمان، یعنی اطاعتِ خداوندی جو کہ ہماری، بلکہ تمام دنیا کی آفرینش (پیدائش) سے مقصود ہے، وہ علم وحی اور ملکۂ امانت پر موقوف ہے اور اس موقع پر ہمارا مطلب ضروری بھی اتنی

بات کا عرض کر دینا تھا، جس سے فراغت ہو چکی۔

(صفتِ امانت کے ساتھ ایمان تک رسائی کیسے ہو؟)

اس کے بعد یہ امر بھی ضرور لحاظ و فکر کے قابل ہے کہ حق سبحانہٗ کی مرضیات و غیر مرضیات تک رسائی کہ جس پر ایمان و عبودیت و انجام دہی کارِ خلافت و ہدایت کا مدار ہے، بالخصوص ہم جیسوں کو یقیناً محال اور اس شعر کا مصداق ہے۔ شعر ؎

وہی آئے ، نہ آئے آپ ہم تک
نہ یہاں طالع رسا ، نئے جذبِ کامل [34]

ادھر امانت کی پابندی، یعنی اسیرانِ ہوا و ہوس (خواہشات اور ہوس کے قیدی) کا تمام مفاسد و مظالم اور جملہ خیانات اور بے جا خواہشوں سے پیچھا چھڑا کر جادۂ عدل و اعتدال اور صراطِ مستقیم پر قائم رہنا طاقتِ بشری سے اتنی دور نظر آتا ہے کہ بجز مایوسی کچھ نظر نہیں آتا اور بے اختیار یہی کہنے کو دل چاہتا ہے۔ شعر ؎

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ اند
باز مے گویند دامن تر مکن ، ہشیار باش
(دریا کی منجدھار میں مجھے تختے پر باندھ کر چھوڑ دیتے ہو
پھر کہتے ہیں کہ خبردار ، ہوشیار ، دامن تر نہ کرنا)

اب ادھر تو یہ دونوں امر اس قدر ضروری ہیں کہ اُن کے بدون (بغیر) انسان گدھے اور کُتّے سے بدتر اور
اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ [35] (وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ)
کے لقب کے شایاں، اُدھر ان ہر دو کمال تک رسائی اُن سے مُنتَفَع ہونا ہماری ہمت سے باہر اور طاقت سے دور۔ پھر کام چلے تو کیوں کر چلے۔

اس عُقدۂ لا ینحل (حل نہ ہونے والے مسئلے) کے حل کرنے کے لیے اور بندگان اسیرانِ جہل و ہوس پر ان تمام مشکلات کی سہولت کی غرض سے حکیم علیٰ الاطلاق — جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ — نے اپنے کمالِ قدرت اور وفورِ رحمت سے یہ کیا کہ مُقرّبانِ بارگاہِ الٰہی اور ینابیعِ فیوضِ غیر متناہی (نہ ختم ہونے والے فیوضات کے سرچشمے)، مَہبطِ انوارِ غیبی (اُترنے والے غیبی انوارات)، مخزنِ اسرارِ لاریبی (شک و شبہ سے پاک خفیہ رازوں کے خزانے) یعنی حضرات انبیائے کرام — علیہم الصّلوٰۃ و السّلام — کو تمام کمالاتِ علمی و عملی میں ممتاز اور تمام مَلَکات اور اَخلاقِ حسنہ سے سرفراز اور اپنے تمام بندوں کی محبت و شفقت سے اُن کے قلوبِ مطہرہ کو مالا مال فرما کر، گویا اپنی تمام مرضیات و غیر مرضیات کا اُن کو نمونہ اور نقشہ بنا کر، حسبِ مقتضائے حکمت و ضرورت وقتاً فوقتاً اپنے بندوں کی طرف بھیجا۔ اَور کیا عرض کروں! کہ کس کس طرح سے ہر دو کمالِ مذکورہ علم و امانت اور دیگر امورِ مطلوبہ ضروریہ کی تحصیل و تکمیل کو اپنے بندوں پر سہل (آسان) فرما دیا۔ جس کو دیکھ کر مایوسانِ کم ہمت بھی ''نصیبے بَرم'' (قسمت کا سرچشمہ) کہنے کو تیار ہیں۔

فللّٰہ الحمد، و الثّناء، و لہٗ الشّکر، و الفضل، و السّناء.

(اللہ ہی کی حمد ہے اور ثنا ہے، اور اُسی کا شکر ہے اور فضل ہے اور اُسی کا بلند مرتبہ ہے۔)

(انبیاعلیہم السلام کا احکم الحاکمین کی بارگاہ میں اعلیٰ مقام)

اس کی توضیح اپنی لیاقت کے موافق اور اس مقام کے مناسب یہ ہے کہ بارگاہِ احکم الحاکمین میں جو قرب و امتیاز محبوبیت و اعزاز مقبولیت و وجاہت و کرامت و سیادت حضرات انبیائے کرام —علیهم الصّلوٰة و السّلام — کو حاصل ہے، کسی فردِ بشر کو نصیب نہیں۔ اور جو کمالِ علمی و عملی اُن کو عطا ہوا ہے، کسی کو میسر ہونا محال (ناممکن) تمام حکما و عقلا کے اَخلاق و عقل کو اُن اورنگ نشینانِ محفلِ کمال (کمالات کی محفل میں تختِ شاہی پر بیٹھنے والوں) کی عقل و اَخلاق کے ساتھ وہی نسبت ہے، جو دھوپ کو آفتاب سے اور پانی کی حرارت کو آگ سے ہے۔ بارگاہِ ربُّ الاَرباب میں اُن کا وہی درجہ ہے، جو بارگاہِ سلطانی میں مقرّ بانِ شاہی کا ہونا چاہیے کہ حُکّام ماتحت اور عام رعایا تلک جو اَحکام و انعاماتِ سلطانی پہنچتے ہیں، انھیں کے ذریعے سے پہنچتے ہیں۔ رعایا کی عرض داشت وہی مسموع (قبول) ہوسکتی ہے، جو اُن کے وسیلے سے پیش ہو۔ اُن کی اطاعت بعینہٖ اطاعتِ سلطانی اور اُن سے سرکشی و تمرُّد و بغاوتِ بادشاہی شمار ہوتی ہے۔ خلیفۂ کامل اور نائب بلاواسطہ ہیں تو (صرف) وہی ہیں۔ باقی تمام عالَم کو (کسے باشد، کوئی ہو) بعض کو بہ منزلۂ حُکّام ماتحت اور بعض کو بہ منزلۂ رعایائے سلطانی سمجھنا چاہیے۔

بالجملہ حضرات انبیائے کرام —علیهم الصّلوٰة و السّلام — در بارہ فیوضات اور برکاتِ روحانی اور تحصیلِ سعادت و ہدایت اور تسہیلِ حصولِ جملہ کمالاتِ بشریت (تمام بشری کمالات حاصل کرنے کی سہولت) حق سبحانہ اور اُس کے بندوں کے مابین ایسے ہی واسطہ ہیں، جیسے وہ اشیا کہ آفتاب اور اُن کے درمیان کوئی چیز حاجب (پردہ) ہو اور اُن تلک نورِ آفتاب پہنچانے کے لیے آئینۂ مصفّٰی و مجلّٰی (صاف ستھرے روشن آئینے کی طرح) واسطہ ہوجاتا ہے۔

(انبیاعلیہم السلام کی بعثت کی اصلی غرض؛ دُنیوی انتظام اور اُخروی فلاح ہے)

اور بعثتِ انبیاؑ سے غرضِ اصلی یہی ہے کہ بندگانِ جاہل و گمراہ عِلماً اور عَملاً (علمی اور عملی طور پر) اپنے اصول و فروعِ ایمانی؛ یعنی: علوم و اعتقادات، اَخلاق و حالات، اقوال و افعال، عادات و عبادات، رسوم و معاملات میں ایسے مہذب ہوجائیں کہ دنیا میں انتظامِ معاش اور آخرت میں فلاحِ معاد بہ خوبی و سہولت حاصل کرسکیں۔ جس سے اہلِ انصاف کو معلوم ہوسکتا ہے کہ اتباعِ انبیاؑ کو صرف عبادات کے ساتھ مخصوص سمجھنا' انھیں صاحبوں کا کام ہے، جو بے علمی اور کوتاہ نظریے کے ساتھ صفتِ امانت کو خراب و فاسد کرکے مِن حیث لا یحتسب (بے شمار و بے حد) فتنے میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ اگر وجوبِ اتباعِ انبیاؑ (انبیاؑ کی اتباع کا واجب ہونا) مسئلۂ شرعی اور امرِ دینی ہے تو پھر ارشادِ (نبویؐ) ''أنتم أعلم بأمور دُنیاکم'' [36] (تم اپنے دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو) کے بھروسے (پر) متابعتِ رسول —علیه الصّلوٰة و السّلام — کو صرف عبادت میں منحصر کرنا کس قدر سینہ زوری ہے اور اطاعتِ رسولؐ کو امورِ دُنیوی میں داخل نہ کرنا تو اُسی کا کام ہے، جو احاطۂ آدمیت سے بھی خارج ہوچکا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ:

(الف) ایک تو ''امر'' اور ''حکم'' ہوتا ہے۔ (ب) اور ایک ''صلاح ومشورہ''۔ سو!

(۱) امرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو خواہ کسی چیز کے متعلق ہو، ہم بے شک اُس کے مامور ہیں۔

(۲) اور مشورہ آپؐ کا ہو یا کسی اَور کا، ہم اُس کے مامور ہرگز نہیں۔ یہ امرِ دیگر ہے بہ مقتضائے حُسنِ ادب جو بہ وجہ کمالِ عقل و مقبولیت انبیا علیہم السلام کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اُن کے مشورے کا اتباع بھی مستحب اور اُن کا مشورہ بھی اَوروں کے مشورے سے مُقدَّم ہے، مگر یہ استحباب' خارجی اور عرضی ہے۔ اس اتباع کی نسبت امرِ شرعی ہم کو نہیں ہوا، جو اس کو امرِ شرعی کہا جائے۔ ادھر یہ بات ہے کہ:

(الف) مشورۂ مذکورہ کی گنجائش ہے تو منافع ومضارِ دُنیوی (دُنیاوی نفع نقصان) میں ہے۔

(ب) درباره منافع ومضارِ اُخروی (اُخروی نفع ونقصان میں) انبیاؑ کو مشیر سمجھنا، نبوت کا مدعی بننا یا انبیاؑ کو عوام میں داخل کرنا ہے۔

اور یہ بھی خوب سمجھ لینا چاہیے کہ تحصیلِ منافع دُنیا (دنیاوی نفع حاصل کرنے) کے:

(۱) بعض طُرق (طریقے) فلاحِ آخرت کے معارض (مخالف) ہوتے ہیں۔

(۲) اور بعض (طریقے) موافق (ہوتے ہیں)۔

(۳) اور بعض (طریقے) نہ معارض (مخالف ہوتے ہیں) نہ موافق۔

پہلے دو طریقوں میں حکمِ نبویؐ اور امرِ شرعی کا اتباع کرنا پڑے گا۔ البتہ تیسرا طریقہ یعنی جو فلاحِ آخرت کے نہ مخالف ہے، نہ موافق، صرف اُس میں ہم کو توسُّع (وسعت دی گئی ہے) اور اختیار ہے کہ اُس کے ذریعے سے ہم منفعتِ دُنیوی حاصل کر سکتے ہیں۔ اُس میں فقط یہ ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ کسی نہج (پہلو) سے فلاحِ آخرت کے معارض نہ ہو جائے۔ باقی جس طرح چاہیں، طریقۂ مذکورہ سے منفعت حاصل کریں۔ چناں چہ بُیُوع و اِجاراتِ فاسدہ (ناجائز خرید وفروخت اور معاہدات) وغیرہ کی ممانعت اسی پر مبنی ہے۔

(حدیثِ نبویؐ: ''أنتم أعلمُ بأُمورِ دُنیاکم'' کی صحیح تشریح)

تو اب جو کوئی ''أنتم أعلم بأُمور دُنیاکم'' [37] کے ارشادِ (نبویؐ) سے — جو آپؐ نے ''تأبیرِ نخل'' (کھجور کی پیوند کاری) کی نسبت فرمایا تھا — خود مختار بننا چاہے:

(الف) اوّل: اُس پر یہ لازم ہے کہ یہ سمجھ لے کہ آپؐ نے ''تأبیرِ نخل'' (کھجور کی پیوند کاری) سے جو روکا تھا، یہ حکم اور امر (شرعی) تھا، یا بہ تقاضائے خیر خواہی بہ طورِ مشورہ منع کیا تھا؟

(ب) اس کے بعد یہ دیکھ لے کہ اقسامِ ثلاثہ مذکورہ (کسی دُنیاوی چیز کے حصول کے گزشتہ بیان کردہ تین قسموں) میں سے ''تأبیرِ نخل'' کس قسم میں داخل ہے؟

جس قسم میں داخل ہے، صرف اُسی میں مختار بنے۔ جملہ اقسام میں خود مختاری اس سے حاصل کرنا بالکل یہ کہہ رہا ہے کہ حدیثِ مذکور مَورَد (وارد ہونے کے مقام) اور اس کے مطلب سمجھنے کا قصد بھی نہیں کیا۔

ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ درستیٔ آخرت چوں کہ **مقصود بالذّات** (ذاتی طور پر مقصد) ہے اور انتظامِ معاش دُنیوی **بالتبع مطلوب** (اُس کے تابع ہو کر مطلوب) ہے تو اس لیے اگر کوئی چیز معاشِ دُنیوی کے لیے مفید و نافع اور معادِ آخرت کے لیے مُضر ونقصان دہ ہوگی تو وہ چیز ضرور قابلِ ممانعت اور **واجب الاجتناب** (اس سے بچنا واجب) ہوگی اور اُس کا عکس قابلِ قبول اور **واجب العمل** ہوگا۔

اس مختصر قاعدے کے سمجھ لینے کے بعد انشاء اللہ جملہ اُن امور سے نجات مل سکتی ہے کہ:

(الف) جن سے وحیٔ اِلٰہی تو روکتی ہے اور ہم کو اپنی عقل سے بڑے بڑے نفع ان میں نظر آ رہے ہیں۔

(ب) یا وحیٔ اِلٰہی تو اُس کی طرف شوق و رغبت دلاتی ہے اور ہمارا نفس اُس سے ڈراتا ہے۔

چناں چہ فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے کے بارے میں خود کلامِ الٰہی میں ارشاد ہے:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

(شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگ دستی کا، اور حکم کرتا ہے بے حیائی کا، اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا، اور اللہ بہت کشائش والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔) [38]

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ جب ہماری عقل وخواہش حکمِ الٰہی کے ناموافق ہوں تو ہم کو امرِ خداوندی کی متابعت چاہیے۔ اور یہی ہمارے لیے موجبِ فلاحِ دارین ہے۔ مگر اسی آیت کے متصل يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ [39] (عنایت کرتا ہے سمجھ، جس کو چاہے) ارشاد فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس کو تسلیم کرنا اُنھیں کا کام ہے، جو علم وعمل میں پختہ ہیں۔ جاہل ہوا پرست سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

(صرف عقل پر بھروسہ، علم و امانت سے اجنبی ہونا ہے)

جو نادان اپنی یا کسی دوسرے کی عقل کے بھروسے — کہ جس کو حسب الحکم آیتِ سابقہ' حقیقت میں اغوائے شیطانی کہنا چاہیے — احکامِ وحی کی مزاحمت اور اُن میں تصرفات کرنے پر آمادہ ہو، اُس نادان کو عظمتِ وحی تو درکنار، خود اپنی بھی خبر نہیں۔ وہ بے چارہ علم وامانت سے اس قدر اجنبی اور بے نصیب ہے کہ صاحبِ علم وامانت کو اُس کی نسبت ع

''نیستند آدم غلاف آدم اند''

(وہ آدمی نہیں ہیں ، آدم کے غلاف میں ہیں)

کہہ کر بھی صبر نہ آئے گا۔

ارشادِ خداوندی: وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ [40] (اور راہ سے بچلا دیا اُس کو اللہ نے جانتا بوجھتا) اور ارشادِ نبویؐ: **''اتّخذوا رؤسًا جهّالًا، فسُئلوا، فأفتوا بغير علمٍ، فضلّوا و أضلّوا''** (لوگ جاہلوں کو اپنا سربراہ بنالیں گے، پھر اُن سے مسئلے پوچھیں گے، وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ پس وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے)۔ [41] کی پوری مصداق ایسے ہی لوگ ہیں۔ **و العِیاذُ باللّٰه** (اللہ کی پناہ)۔ شعر ؎

www.rahimia.org

ای جذبہ ہمتے کہ دریں دشت پُر فریب
گم کردہ ایم قافلہ سالار خویش (42)

(یہ ہمت اور جذبہ کہ اس پُر فریب صحرا میں
ہم اپنے قافلہ سالار کو گم کر بیٹھے ہیں)

(انبیا علیہم السلام تمام کمالات کا سرچشمہ ہیں)

جب یہ مضمون محقق ہوگیا کہ تمام عالَم کے لیے سرِ منشائے ہدایت اور سرچشمہ جملہ کمالات بنی آدم اگر ہیں تو انبیائے کرام — **علیہم الصّلوٰۃ و السّلام** — ہیں۔ اور ہر ایک ادنیٰ اور اعلیٰ کو جو احکامات و انعاماتِ خداوندی پہنچتے ہیں، انھیں کی وساطت سے پہنچتے ہیں۔ تو اب کیسے ہوسکتا ہے کہ علم و امانت جن کو انعاماتِ خداوندی میں اعلیٰ اور کمالاتِ انسانی میں تمام کمالوں کے لیے سرِ منشا (منشاءِ خداوندی کا سِرا) کہنا چاہیے، وہ انبیؑا کے ذریعے سے ہم کو نہ پہنچائے جائیں، بلکہ ضرور ہے کہ ان دونوں کمالوں کی ہم کو جس قدر احتیاج (ضرورت) ہے، اُسی قدر بذریعہ انبیؑا ہم تلک پہنچانے میں اہتمام زیادہ فرمایا گیا ہو۔ اور جس قدر اُن کی تحصیل میں دشواری تھی، اُسی قدر بذریعہ انبیؑا ہم پر اُن کی تحصیل کو سہل و آسان کردیا گیا ہو۔

سو الحمدللہ! علم و امانت میں یہی قصہ ہے۔ دیکھ لیجیے!

(الف) اوّل تو انسان کو جوہرِ عقل اور علم عطا فرمایا۔

(ب) پھر اُس کی تائید کے لیے حواسِ ظاہرہ و باطنہ کس قدر عنایت کیے۔

(ج) پھر تعلیم و تعلّم کے ایسے طریقے بتلا دیے کہ انسان ظلوم و جہول سہولت کے ساتھ تحصیل و تکمیل علم کر سکے، بلکہ مختلف علوم و فنون، صنائع بدائع (عجیب و غریب صنعتیں) اپنی سمجھ اور تجربے وغیرہ سے ایجاد کر سکے۔ چناں چہ آج جس قدر علوم و فنون ہماری نظر کے سامنے ہیں، وہ سب ایسے ہی ہیں۔

(د) صرف ایک علم جس کو ''علمِ مرضیاتِ الٰہی'' اور ''علمِ احکامِ الٰہی'' اور ''علمِ وحی'' کہتے ہیں اور اُس کا جاننا مقصودِ اصلی ہے، البتہ اُس تلک رسائی ہماری طاقت سے باہر تھی۔ اور باوجود کمالاتِ مذکورہ انسان کو اُس علم کا حاصل کرنا محال تھا۔ سو اُس کا تکفُّل و اہتمام حق سبحانہ نے خود ایسا فرمایا اور انبیائے کرامؑ کے وسیلے سے ہم پر اس قدر سہل کردیا کہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اللہ کے فضل سے علمِ وحی کی تحصیل میں وہ سہولتیں نظر آتی ہیں، جو بہت سے علوم ایجاد کردہ بنی آدم میں بھی نہیں دیکھتے۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ **سُفَراء معصومین** (معصوم سفیروں) — **أعنی** (میری مراد): **ملائکہ مقربین** — کی وساطت سے احکامِ الٰہی اور کلامِ خداوندی انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل فرمائے جاتے ہیں۔ اور کلامِ الٰہی کا مطلبِ اصلی اور منشائے واقعی اُن کے قلوب میں خوب راسخ فرما کر تبلیغ و ہدایتِ خلق اللہ کا عظیم الشان کام اُن کے سپرد کیا جاتا ہے اور انبیائے کرامؑ کے وہ کمالاتِ جلیلہ شریفہ جن کو بالاجمال ابھی عرض کرچکا ہوں، اُن کمالات پر بھی بس نہیں کی جاتی۔ بلکہ طرح طرح سے احکامِ خداوندی کی تبلیغ اور اُن کی محافظت کا عظیم الشان اہتمام کیا جاتا ہے، جس کی کیفیت بہ خوبی اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا، اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا، لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا(43)

(جاننے والا بھید کا، سو نہیں خبر دیتا اپنی بھید کی کسی کو۔ مگر جو پسند کرلیا کسی رسول کو تو وہ چلاتا ہے اُس کے آگے اور پیچھے چوکیدار۔ تاکہ جانے کہ انھوں نے پہنچائے پیغام اپنے ربّ کے، اور قابو میں رکھا ہے جو اُن کے پاس ہے، اور گن لی ہے ہر چیز کی گنتی۔)

خلاصۂ مضمون آیت کا ہے کہ:

(۱) حق تعالیٰ عالم الغیب اپنے بھید کی باتیں پیغمبروں کے سوا کسی پر ظاہر نہیں فرماتا۔

(۲) اور اپنے رسول کی حفاظت وحمایت سب طرف سے کرتا ہے، تاکہ رسولوں کا احکامِ الٰہی کی تبلیغ کرنا محقّق ہوجائے اور کوئی فتور وقصورِ تبلیغ وحی میں نہ آوے۔

(۳) اور اللہ کا علم وقدرت رسولوں کے احوال اور تمام اشیا کو محیط ہے۔ کوئی امر اُس کے علم وقدرت سے خارج نہیں۔

(۴) اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ احکام بذریعۂ وحی خاص انبیا پر نازل ہوتے ہیں۔

(۵) اور فقط اِرْتَضٰی (اللہ کی رضامندی) سے یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ حضرات انبیائے کرام کے تمام مَلَکَات وعلم واعمال و اَخلاق واحوالِ پسندیدہ جنابِ باری واکمل واعلیٰ ہوتے ہیں۔

(۶) اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ وحیٔ الٰہی اور اُس کی تبلیغ کا ہر طرح سے ایسا انتظام و محافظتِ تامّ مِن جانب اللہ (اللہ کی طرف سے مکمل حفاظت اور انتظام) ہوتا ہے کہ کسی نقصان وخلل کا اُس میں امکان محال ہے، نہ یہ ہوسکتا ہے کہ شیطان کے کسی قسم کے دخل کو وہاں تک رسائی ہو۔ نہ یہ ممکن ہے کہ حضرات انبیؑا سے اُس کے فہمِ مطلب میں غلطی اور اُس کی تبلیغ میں کسی قسم کی کوتاہی یا بھول چوک ہوجائے۔

(انبیا علیہم السلام کو مزید دو کمال: ''عبودیت'' اور ''عصمت'' عطا کیے جاتے ہیں)

اسی کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ مِن جملہ کمالاتِ گوناگوں: (i) عبودیت و (ii) عصمت دو کمال عظیم الشان انبیا علیہم السلام کو خاص طور سے عطا ہوتے ہیں۔

(i۔ عبودیت کا مطلب اور مفہوم)

عبودیت کا خلاصہ تو یہ ہے کہ اپنے تمام کمالات کو محض انعام وعطائے خداوندی اور اپنے آپ کو تمام کمالات وغیرہ میں اُسی کا محتاج اور دستِ نگر سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے اتباعِ احکامِ الٰہی میں ایسے چست اور اس کی رضا جوئی میں اس قدر محو اور چالاک کہ ہر ایک امرِ خداوندی کے بجالانے کو جان ودل سے تیار اور ہر ایک مخالف مرض سے متنفر اور بے زار۔ بجز اطاعت وفرماں برداری نہ راحت کا خیال، نہ تکلیفاتِ شاقہ کا فکر وملال، نہ عزت سے سروکار، نہ کسی کی ایذا رسانی کا دل پر بار۔

(ii۔عصمت کا مطلب اور مفہوم)

اور عصمت کا ما حصل (خلاصہ) یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے اقوال وافعال، عبادات ومعاملات، حالات وعادات، اَخلاق و ملکات جو سر تا پا پسندیدہ اور برگزیدہ اور حق سبحانہ کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں، بہ عنایت وحمایتِ الٰہی وہ سب دخلِ شیطانی اور عوارضِ نفسانی سے معصوم ومحفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اُن کے کسی قول وفعل وغیرہ میں دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاؑ کی تعلیم قولی وفعلی وغیرہ سب قابلِ قبول اور واجب الانقیاد (اُن کے سامنے فرماں برداری واجب) ہیں اور اُن کے کسی قول یا فعل یا عادت یا معاملے سے انحراف موجبِ خسرانِ دارین (دونوں جہانوں کے نقصان کا سبب) ہے۔

(انبیا علیہم السلام کے مقدس قلوب میں تمام اُمت کی خیرخواہی ہوتی ہے)

پھر اس پر بھی بس نہیں، بلکہ کمالِ علم وعبودیت کے ساتھ حضرات انبیا علیہم السلام کے مقدس قلوب میں تمام اُمت، تمام قوم، تمام بنی نوع کی محبت اور سچی خیرخواہی اور ہمدردی اور اُن پر رحمت وشفقت اس قدر اِلقا فرمائی جاتی ہے کہ:

(الف) اُن کی راحت کو اپنی راحت سے اور اُن کی تکلیف اور مُضرَّت کو اپنی تکلیف اور مُضرَّت سے کم نہیں سمجھتے۔

(ب) مثل پدرِ شفیق اُن کی تادیب وتعلیم میں جان ومال کسی چیز سے دریغ نہیں فرماتے۔

(ج) اُن کی آوارگی اور گمراہی دیکھ کر نہایت بے چین وبے قرار ہوتے ہیں، لیکن اُن کی ہمت میں فتور اور اُن کی سعی میں قصور نہیں آتا۔

(د) نااہلوں کے پتھر اور گالیاں کھا کر بھی (یہ دعا دیتے ہوئے یہ جملہ) ''اللّٰھم اِھد قومی فانّھم لایعلمون'' (اے اللہ! میرے قوم کو ہدایت دے دے، وہ نہیں جانتے۔) ہی اُن کی زبان پر آتا ہے۔

(ہ) اور ارشادِ حق عز وجل: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [44] (شاید تُو گھونٹ مارے اپنی جان اس بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے) سن کر بھی اُن کی ہمدردی اور دل سوزی کا جوش فرو نہیں ہوتا۔

(انبیا علیہم السلام کے مزید اَخلاق اور اوصافِ کاملہ)

اس پر زہد وقناعت، استغنا اور استقامت، ہمت وشجاعت، فہم وفراست، فصاحت وبلاغت، فیضِ صحبت وغیرہ اوصاف میں ایسے کامل کہ ہدایت وحق گوئی میں تن تنہا تمام عالم سے نہ مُچیں (نہ رُکیں) اور کسی طمع اور کسی حاجت کے باعث ہرگز ہرگز کسی سے نہ لُچیں (نہ جھکیں اور نہ دَبیں)۔ امرِ حق میں سب سے بے گانہ، خلق اللہ کی مصلحت بینی اور نفع رسانی میں فردِ یگانہ، دوستوں پر عاشق، دشمنوں کے سچے بہی خواہ، اور طالبِ صادق (کی) تعلیم وتفہیم میں وہ کمال کہ مضمونِ دقیق وطویل کو سہل اور مختصر فقروں میں اُمّی صحرانشین (صحرا میں رہنے والے ان پڑھ) کے دل میں ایسا بٹھلائیں کہ قیامت تلک نکالا نہ نکلے اور جاہل سنگ دل ایسا متأثر اور خود رفتہ نہ ہوجائے کہ سنبھالا نہ سنبھلے۔

(انبیا علیہم السلام سے علومِ نبوت حاصل کرنا آسان ہے)

اب اہلِ فہم ان جملہ امورِ مذکورہ بالا کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھ لیں کہ جب علم مرضیاتِ الٰہی بندوں تلک پہنچانے میں اس قدر

اہتمام واحتیاط ہرطرف سے فرمائی گئی ہے کہ حفاظت وحمایتِ الٰہی کا یہ حال ہے۔ اور اُس کے لانے والے ایسے مقرب اور معتمد علیہ ہیں اور حضرات انبیا علیہم السلام کا علم و دیانت، راستی وصداقت، عبودیت وعصمت، اَخلاقِ فاضلہ اور شفقتِ کاملہ، تعلیم وتفہیمِ عِباد میں یہ کمال ہے، جو معروض ہو چکا تو اب ان جملہ انتظاماتِ کاملہ کے بعد فرمایئے کہ علم مرضیاتِ الٰہی کی تحصیل وتسہیل میں کون سی دِقّت (مشکل) اور اُس کے معتبر اور ہر طرح سے قابلِ وثوق ہونے میں کون سی کسر باقی رہ گئی۔

کلامِ الٰہی جو فی نفسہٖ (ذاتی طور پر) ارشادِ (خداوندی): ''اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا'' [45] (ہم ڈالنے والے ہیں تجھ پر ایک بات وزن دار) کا مصداق ہے، اُس کی نسبت اُن سہولتوں کے بعد جو مذکور ہوئیں، صاف صاف اور بار بار وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ [46] (اور ہم نے آسان کر دیا قرآن سمجھنے کو، پھر ہے کوئی سوچنے والا؟) فرما دیتا۔ ہمارے مدعا کی ایسی دلیل ہے کہ پھر کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

(انبیا علیہم السلام کے علوم آج تک محفوظ ہیں)

ہمارے بیانات سے جیسا کہ یہ ثابت ہوا کہ تحصیلِ علمِ وحی بذریعہ انبیائے کرام ہم پر سَهَل، بلکہ اَسهَل (بہت زیادہ آسان) فرما دی گئی، جس کا بیان کرنا اس موقع پر ہم کو مقصود تھا، ایسا ہی یہ امر بھی خوب محقق ہوگیا کہ وحیٔ الٰہی کے نزول اور اُس کی تبلیغ وحفاظت میں اس قدر اہتمام ہر طرف سے فرمایا گیا ہے کہ تمام جِنّ و اِنس، مَلَک (فرشتے) بھی اُس میں ادنیٰ سا خلل ہرگز نہیں ڈال سکتے۔ چناں چہ اس (انبیا علیہم السلام کے علوم کی) حفاظت وحمایت کو ادنیٰ اعلیٰ سب پر واضح کر دینے کی غرض سے حق سبحانہ نے تاکیدی الفاظ میں یہ وعدہ فرما دیا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ [47] (ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں)

اب اہلِ عقل وانصاف اوّل تو نزولِ وحی کے ارکانِ ضروریہ یعنی:

(۱) وحی نازل فرمانے والے (اللہ تبارک وتعالیٰ)

(۲) اور وحی کے لانے والے (حضرت جبرائیل علیہ السلام)

(۳) اور جس پر وحی نازل ہوئی (حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ)

ان تینوں کی جلالت وعظمت ورفعت کو حسبِ بیاناتِ سابقہ ملاحظہ فرمائیں۔

ان سب کے بعد حق تعالیٰ کے اس وعدۂ مستحکم کو دیکھیں۔ پھر فرمائیں کہ اس سنگین، بلکہ آہنی قلعے میں کون خلل ڈال سکتا ہے اور فلسفۂ قدیم کے پٹاخے اور فلسفۂ جدید کی مہتابیاں اس مستحکم قلعے پر کیا اثر پہنچا سکتی ہیں۔

اور (ارشادِ نبویؐ:) ''إنّ من العلم لجَهلاً'' [48] (بعض علم جہالت پر مبنی ہوتا ہے) کے علما اور ''بعض العقل عُقّال'' [49] (کچھ عقلیں عمدہ کام سے روکنے والی ہوتی ہیں) کے عُقَلا اپنی ٹکروں سے اُس کی بنیادوں کو کہاں تک متزلزل کر سکتے ہیں۔ واللہ! اتنا بھی اثر نہیں پہنچا سکتا کہ جتنا پیل مست (مست ہاتھی) کو مچھر کی لات اور رَعد (بجلی کی کڑک) کی آواز کو مکھی کی بھنبھناہٹ۔

(انبیا علیہم السلام میں صفتِ امانت بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے)

جب علمِ وحی کا بذریعہ انبیائے کرامؑ ہم پر طرح طرح سے سہل ہو جانا بالتفصیل معلوم ہو چکا تو اب صفتِ امانت کو بھی اُس پر قیاس فرما لیجیے کہ:

(الف) اوّل تو ملکۂ امانت ہمارے قلوب میں مثل دیگر مَلَکات خِلقتاً اور فِطرتاً (پیدائشی اور فطری طور پر) رکھ دیا گیا۔ اُس کے بعد علم و عقل و جملہ ملکاتِ حسنہ اور اَخلاقِ فاضلہ، حلم و حیا، صدق و صفا، سخاوت و شجاعت، عفت و دیانت، انصاف و مروّت وغیرہ کے ذریعے سے ملکۂ امانت کے کسب و ترقی میں آسانی و سہولت کر دی گئی کہ ان کی اعانت (مدد) سے صفتِ امانت کو تقویت پہنچے اور انسان مغلوبِ ہوا و ہوس جملہ خیانتوں سے اور بے جا خواہشوں سے محفوظ رہ کر صراطِ مستقیم پر بہ سہولت قائم رہ سکے۔

(ب) ان سب سے قوی اور سہل تر ذریعہ امانت کی درستی اور ترقی اور جانچ کے لیے اتباع و فہمِ علمِ وحی ہے۔

(انبیا علیہم السلام نے مَلَکۂ امانت لوگوں کے دلوں میں منتقل کیا ہے)

ان کی تائیدات کے بعد اب کسی دوسری تائید کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی، مگر مضمون امانت حسبِ بیانِ سابق چوں کہ امرِ طبعی ہے اور رغبت و نفرت کا اُس پر مدار ہے اور سب جانتے ہیں کہ بسا اوقات امورِ طبعیہ کے مقابلے میں اور طبیعت کی رغبت و نفرت کے سامنے عقل و علم، انصاف و حیا، مروّت و دیانت سب مغلوب ہو جاتے ہیں اور آدمی مرغوبِ طبعی کے پیچھے کبھی ایسا بے خود ہو کر دوڑتا ہے کہ عقل و علم کی آواز بھی اُس کے کان تلک نہیں پہنچتی اور دیانت و حیا پر نظر ڈالنے کی مہلت بھی اُس کو نہیں ملتی۔

بالکل ایسا قصہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ بلّی دربارِ شاہی میں مشعل منہ میں لیے کھڑی تھی۔ چوہا سامنے سے گزرا تو مشعل کو فرش پر ڈال، چوہے کی طرف بے اختیار دوڑی، جس سے قریب تھا کہ تمام مکان میں آگ لگ جائے۔

اگر تھوڑا سا غور و انصاف کریں تو بلّی کے قصے سے بِدرجہا زائد تعجب خیز اور حیرت انگیز مثالیں اپنے احوال اور افعال میں ہم بے تکلف مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

اس لیے حق سبحانہ جل سلطانہ نے اپنے لطف و رحمت سے ایسی دولت و نعمت ہم کو عطا فرمائی کہ اس دُشواریٔ خاص میں ہم کو اُس سے کامل مدد مل سکے اور اس دُشواری میں خاص سہولت پیدا ہو جائے۔

اور وہ انعام یہی ہے کہ حسبِ معروضہ سابق حضرات انبیاؑ کے واسطے سے جیسے علم مرضیاتِ الٰہی کہ جس تلک ہم کو رسائی غیر ممکن تھی، ہم پر سہل فرما دیا گیا۔ بعینہٖ اسی طرح پر انبیائے کرامؑ کے ذریعے سے حق تعالیٰ نے محض اپنی قدرت و رحمت سے صفتِ امانت کو قلوبِ بنی آدم میں ایسا قائم اور قوی کر دیا گیا کہ خواہشاتِ نفسانی اور مقتضیاتِ طبعی کی دست بُرد سے ہم کو نجات مل سکے اور اُن کی غارت گری سے دولتِ ایمان محفوظ رہ سکے۔ (متنبّی کے شعر میں قدرے تصرف کے ساتھ) شعر ؎

فشکراً له و ابتهاجاً به
و إن قصّر الفعل عمّا وجب (50)

(اللہ کا شکر اور اُس پر کمال خوشی ہے
اگرچہ اُس کی طرف سے جو کچھ واجب ہوا ، میرا فعل اُس سے کم تر ہے)

(انسانیت کے لیے انبیا علیہم السلام کے وجودِ گرامی کی مثال؛ آفتابِ عالَم تاب)

شرح اس معمے کی یہ ہے کہ حضرات انبیا—**صلوات اللہ علیہم و سلامہ** — کے وجودِ سراپا جُود کی مثال ایسی سمجھیے، جیسے آفتابِ عالَم تاب، کہ جب آفتاب اپنے مطلع کے قریب آتا ہے، اُسی وقت سے رات کی تاریکی دُور ہونے لگتی ہے۔ اور جب اُس کا نور عالَم میں پھیل جاتا ہے تو ظلمتِ شب بالکل کافور اور محض معدوم ہوجاتی ہے۔ اور ہر ہر جگہ آفتاب کا نور ایسا سرایت کرتا ہے کہ کوئی موقع اُس کے فیض سے محروم نہیں رہتا اور تاریکیٔ شب اپنی حالت پر کہیں بھی قائم نہیں رہنے پاتی۔ مکانوں کے اندر ہر چند نورِ آفتاب نہیں پہنچتا، لیکن تاریکیٔ شب وہاں بھی نہیں رہ سکتی۔ البتہ اگر کوئی مکان ایسا ہو کہ اُس میں کوئی دروازہ یا روشن دان یا کسی قسم کا سوراخ ہی نہ ہو تو بے شک اُس کو آفتاب سے محرومی ضروری بات ہے۔

(امانت دراصل انبیا علیہم السلام کے قلوب سے پھوٹنے والا نور ہے)

اسی طرح پر یہ مقبولانِ بارگاہِ الٰہی اور چشمہ ہائے فیوضِ غیبی جب عالَمِ نورانی سے اس جہانِ ظلمانی کی طرف **بأمر أرحم الرّاحمين** (اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے) گمراہوں کی ہدایت کے لیے نزول فرماتے ہیں تو ایک خاص برکت اور نورِ ہدایت بھی ان برگزیدگانِ **عالَمُ القُدس و الجبروت** کے ساتھ ساتھ ضرور اس عالم میں آتا ہے اور اپنی اپنی قابلیت کے موافق تمام قلوبِ بنی آدم میں اُس کا اثر پہنچتا ہے اور کوئی اُس سے محروم نہیں رہتا۔ اور خود بہ خود سب کے دلوں میں طلبِ حق کا جوش اور سب کی زبانوں پر **کلمةُ الحقّ** کا خروش (نعرۂ حق) ظاہر ہونے لگتا ہے۔ ہر کوئی خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنے نقائصِ علمی اور مفاسدِ عملی پر خود بہ خود متنبہ اور خبردار ہوجاتا ہے۔ طلبِ حق قلوب میں ایسی موجزن ہوتی ہے کہ کسی قسم کی تکلیف و مشقت اور رنج و مصیبت اُن کو قبولِ امورِ حقہ سے مانع نہیں ہوسکتی۔ اطاعتِ احکم الحاکمین میں ایسے چُست ہوجاتے ہیں کہ ''نفسِ امارہ'' کی مرغوبات اور دنیا کی محبت و حُبِّ جاہ و مال کو یک لخت پسِ پشت ڈال کر اور نام ونشان کو خاک میں ملا کر ہر ایک حکمِ الٰہی کی تعمیل کو اپنا منتہائے مطلوب اور غایتِ مقصود خیال کرتے ہیں۔

ہاں! جو کوئی شقیٔ ازلی (ہمیشہ کا بدبخت) اور محرومِ حقیقی ہوتا ہے، وہ اس سعادت و برکت سے بالکل بے بہرہ اور اس نعمت و دولت سے البتہ بے نصیب رہتا ہے۔ اور اسی برکت اور نورِ ہدایت کو ''امانت'' بھی کہتے ہیں، جس کا بیان ہم کو مقصود ہے۔

(صفتِ امانت انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ہم پر آسان بنا دی گئی)

اب اہلِ فہم انصاف کریں کہ وہ صفتِ امانت جس کی تحصیل و تکمیل میں ہم کو سخت دُشواری، بلکہ ایک طرح کی معذوری و مجبوری نظر آتی تھی، اُس کو حق سبحانہ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ہم پر کس قدر سہل و آسان فرما دیا، جس کی کیفیت دیکھ کر اب تو نہایت مسرت کے ساتھ ہم یہ شعر پڑھنے کو مستعد ہیں۔ شعر ؎

www.rahimia.org

آفتاب اندرونِ خانۂ ما
در مثال ذرّہ میرویم در بہ در [51]
(آفتاب ہمارے دل کے گھر میں
ذرّے کی طرح ہے، لیکن ہم در بہ در پھر رہے ہیں)

چناں چہ حدیثِ نبویؐ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے:

قال النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم:

''إنّ الأمانۃ نزلت فی جذر قلوب الرّجال. ثمّ علموا من القرآن ثمّ علموا من السّنّۃ''. [52]

(لوگوں کے قلوب میں پہلے امانت نازل ہوئی۔ پھر انھوں نے قرآن سیکھا اور پھر سنت سیکھی۔)

اہلِ فہم انصاف فرمائیں کہ اس ارشاد سے ہمارا مضمون مذکورہ سابق جیسا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے، ایسا ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آدمیوں کے قلوب میں اوّل مضمون امانت جاگزیں ہوتا ہے۔ اُس کے بعد علمِ قرآن و علمِ حدیث سے ہدایت نصیب ہوتی ہے۔ اور اسی امانت کو آیت:

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ [53]

(آپ اُسی کو ڈرا سکتے ہیں، جو نصیحت کی پیروی کرے اور خدا سے ڈرے۔۱۲)

اور ارشادِ (خداوندی):

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى [54] (نصیحت وہی قبول کرے گا، جس میں خشیت ہو۔۱۲)

میں لفظ ''خشیت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ [55] وغیرہ آیات میں لفظِ ''تقویٰ'' سے مذکور فرمایا ہے، جن کے ملاحظے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بدون (بغیر) ''خشیت'' (اللہ کے ڈر) اور بلا (بغیر) ''تقویٰ'' (اللہ کے خوف) یعنی بغیر حصول امانت آدمی کو اتباعِ احکامِ الٰہی اور ہدایت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ قرآن و حدیث اُسی کو نافع ہوتا ہے کہ اُس کے دل میں اوّل برکتِ مذکورہ — یعنی امانت — موجود ہے۔

اب ہماری اس تمام تقریرِ پریشان سے صفتِ امانت کی حقیقت اور کیفیت بھی پوری واضح ہوگئی۔ اور حدیثِ شریف مذکورہ عنوان ''لا إیمان لمن لا امانۃ لہٗ'' کی تحقیق بھی خوب واضح ہوگئی۔ اور صفتِ امانت کی تحصیل (حاصل کرنے) میں جو دُشواری اور دِقت نظر آتی تھی، اُس کی سہولت اور آسانی کی تفصیل بھی مشرح معروض (تشریح کے ساتھ بیان) ہوچکی۔

و الحمد للّٰہ و ما توفیقی إلّا باللّٰہ (اللہ کا شکر ہے اور اللہ کے بغیر مجھے توفیق حاصل نہیں ہوئی)۔

(تمام خوبیوں کی جڑ صفتِ امانت ہے اور اسی بنیاد پر ایمان کا درجہ ہوگا)

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی خوب واضح ہوگیا کہ تمام خوبیوں کی جڑ اگر ہے تو صفتِ امانت ہے، اس کے بدون (بغیر) نہ ایمان حاصل ہوسکے، نہ خوف و محبتِ الٰہی، نہ تقویٰ و طہارت، نہ ہدایت نہ سعادت، حتیٰ کہ قرآن و حدیث، یعنی علمِ وحی سے منتفع ہونا، جو کہ تمام عقائد و اعمال، اصول و فروعِ اسلامیہ کی اصل ہے، وہ بھی بہ حکمِ حدیثِ مذکور صفتِ امانت پر ہی موقوف ہے۔

مگر جب یہ ہے تو پھر یہ بھی ضرور کہنا پڑے گا کہ قوی ضعیف جس درجے کی کسی کی صفتِ امانت تسلیم کی جائے گی، اُسی درجے کا اُس کا ایمان بھی مانا جائے گا، بلکہ جملہ امورِ ہدایت؛ عقائد ہوں یا اعمال، عبادات ہوں یا معاملات، اَخلاقِ حسنہ ہوں یا احوال، اُسی درجے کے سمجھے جائیں گے کہ جس درجے کی صفتِ امانت ہوگی۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ اگر کسی کی صفتِ امانت میں کسی قسم کی کوتاہی یا کسی طرح کا نقصان یا کسی نوع کا خلل مانا جائے گا تو اُسی کے موافق اُس کے ایمان اور تمام اصول وفروع ہدایت میں بھی اُس کا تسلیم کرنا ضرور ہوگا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلا کہ تمام خوبیوں کی اصل ''صفتِ امانت'' اور تمام خرابیوں کی جڑ ''فسادِ امانت'' ہے، جس کو ''فتنہ'' کہتے ہیں۔ کسی صاحبِ امانت (حافظ شیرازیؒ) نے کیا خوب فرمایا ہے۔ شعر ؎

گر امانت بہ سلامت ببرم باکے نیست
بے دلی سہل بود ، گر نہ بود بے دینی (56)
(میں اگر یہ امانت سلامتی کے ساتھ لے جاؤں تو پھر کوئی ڈر نہیں ہے
کیوں کہ بے دلی بڑی آسان ہوتی ہے ، اگر بے دینی نہ ہو)

(صفتِ امانت کے حوالے سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں)

اس کے بعد اہلِ عقل کو اس امر کے تسلیم کر لینے میں بھی کسی دلیل کی احتیاج نہ ہوگی کہ وصفِ امانت میں جملہ افرادِ انسانی مساوی نہیں ہو سکتے، بلکہ جیسا علم و ایمان وغیرہ امور میں افرادِ انسانی از حد مختلف ہیں، ایسا ہی صفتِ امانت میں باہم فرق ضروری ہے۔ اور جیسا نورِ آفتاب کو آئینہ اور دیگر اجسامِ لطیفہ و کثیفہ (صاف شفاف اور ٹھوس اجسام) اپنی اپنی قابلیت کے موافق قبول کرنے میں مختلف ہیں، اسی طرح پر قلوبِ بنی آدم امانت و برکتِ مذکور بالا کے قبول کرنے میں از حد متفاوت ہیں۔ اور اسی تفاوت کی وجہ سے مراتبِ ایمانی میں جملہ مؤمنین کو متمایز (امتیازی خصوصیات کا حامل) سمجھنا ضروری ہے۔

(تمام اُمت میں سے نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ اسی امانت کی وجہ سے افضل ہیں)

حضرات صحابہ کرام —— رضوان اللّٰہ علیھم أجمعین —— کا جملہ اُمتِ مرحومہ سے افضل ہونا جو علما میں ایک مہتم بالشان مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور بجز اکابر اہلِ سنت دیگر فرقوں کو اُس کا سمجھنا دشوار ہوا ہے، اُس کا بڑا منشا یہی برکت اور یہی امانت ہے۔

(نبی اکرمؐ کی افضلیت کی وجوہات)

یعنی جنابِ سیّد المرسلین و خاتم النّبیّین جب اُس پُر آشوب وقت میں ہدایتِ خلق اللہ کے لیے بھیجے گئے کہ جس کی نظیر شرک و جہالت میں زمانۂ سابق میں بھی کبھی نہ گزری تھی تو حسبِ قاعدۂ مذکورہ بالا آپؐ کے ساتھ بھی مثل جملہ انبیا علیہم السلام اُسی فیض و برکت و امانتِ مذکورہ کا پورا نزول ہوا۔ مگر یہ فیض و برکت دیگر انبیائے کرام کی برکات و فیوض سے دو وجہ سے بہت فائق اور برتر تھے:

(ا) بڑی وجہ تو یہی ہے کہ حضرت فخرِ عالَم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم أفضل الرّسل اور تمام انبیاؑ کے کمالات کے مرجع

ہیں۔ کیوں کہ آپؐ کے کمالات اور دیگر انبیاؑ کے کمالات میں وہی نسبت ہے، جو نورِ شمس اور نورِ قمر میں تعلق ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپؐ کے زمانے میں چوں کہ جہل و شرکت کو وہ قوت تھی کہ کسی زمانے میں نہ ہوئی تھی۔

تو ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں ایسے ہی اعلیٰ ہادی اور سامانِ قویہ ہدایت کی ضرورت تھی کہ اُس جہل و شرک کو — جو کہ تمام عالَم میں وبائے عام کی طرح پھیل کر قلوبِ بنی آدم میں اپنا سکہ جما چکا تھا — اُس کو نیست و نابود کر کے نورِ ہدایت شرقاً و غرباً (مشرق اور مغرب میں نورِ ہدایت) پھیلا دے۔

شاہانِ دنیا کو بھی جب کوئی بغاوت چھوٹی یا بڑی پیش آتی ہے تو اُس کی مدافعت کے لیے اُسی سردار اور سپہ سالار کو مامور کرتے ہیں، جو اُس کے مناسبِ حال ہو اور اُس کی مدافعت کے لیے کافی سمجھا جائے۔ بغاوتِ عظیم کے انسداد کے لیے کم درجے کے افسروں کو کوئی نہیں بھیجتا۔ یہاں تک کہ اگر بغاوتِ عام تمام مملکتِ سلطانی میں پھیل جانے کی نوبت آتی ہے تو ایسے خاص، معتمد، جلیل القدر سردار کو اپنا قائم مقام بنا کر بھیجنا پڑتا ہے کہ جو تمام خواصِ سلطانی (سلطنت کے خاص لوگوں) میں ممتاز اور ہر طرح سے لائق و فائق سمجھا جائے۔

الحاصل! حضرت خاتم النّبیّین صلّی اللّٰہ علیہ وّسلم کا اس برکت وفیضِ خاص میں جملہ انبیا علیہم السلام پر فائق و ممتاز ہونا مثل دیگر کمالات ضروری التّسلیم ہے۔

(صحابہ کرامؓ کی افضلیت کی وجوہات)

آپؐ بہ حکمِ ربّ العالمین تمام عالَم کی اصلاح و ہدایت کے لیے اس عالَم میں بھیجے گئے اور اعلیٰ درجے کا فیضِ امانت اور نورِ ہدایت آپؐ کے ساتھ ساتھ ایسا ہی تھا، جیسا آفتاب کے ساتھ نور۔ تو اس نورِ ہدایت اور اس برکت و امانت سے حضرات صحابہ کرام — رضوان اللّٰہ علیہم أجمعین — کو وہی حصہ ملا، جو نورِ آفتاب سے کواکب اور آئینۂ مجلّٰی و مصفّٰی کو ملتا ہے۔ حضرات صحابہؓ میں باہم فرقِ مراتب ہو، مگر اَور کوئی اس کمال میں اُن کا ہم پلہ نہیں۔

جن لوگوں کی نظر صرف ریاضات و مجاہدات وا عمالِ صالحہ پر قاصر (بند) رہی، اُن کو بالبداھت ایسے شکوک پیش آئے کہ جن سے افضلیتِ صحابہؓ کو کما حقہ تسلیم نہ کر سکے۔ اور جن کی نظرِ غایر (گہری نظر) ان تمام کمالات کے اصل یعنی ''ملکۂ امانت'' تلک پہنچی، اُن کو افضلیتِ صحابہؓ کی تسلیم کرنے میں کوئی دِقت پیش نہ آئی۔ اور جب حضرات صحابہؓ کو صفتِ امانت میں سب اُمت سے افضل مانا جائے گا تو حسبِ معروضۂ سابق اُن کے ایمان کو بھی تمام مؤمنین کے ایمان سے اعلیٰ اور اکمل کہنا ہوگا۔

ہاں! اگر کوئی شخص ریاضاتِ شاقہ یا عباداتِ بدنی و مالی یا علم جزئیاتِ شرعیہ میں کسی صحابی سے بڑھ جائے تو اُسے تسلیم کرنے میں کوئی تأمّل اور دُشواری نہیں، مگر یہ فوقیت حضرات صحابہؓ کے کمال کے مقابلے میں ایسی ہے کہ کسی قوی البصر (تیز نظر) گوشۂ نشین کو تو مشاہدۂ جزئیاتِ مختلفہ کی نوبت کم آئے۔ اور ضعیف البصر سیاح دائر وسائر (ہر طرف آنے جانے والے کمزور نظر سیاح) کو جزئیاتِ مختلفہ کثیرہ کا مشاہدہ میسر ہو تو ادنیٰ صاحبِ عقل بھی مشاہدۂ جزئیاتِ کثیرہ کی وجہ سے اس ضعیف البصر (کمزور نظر) کو ہرگز قوتِ بصر (دیکھنے کی قوت) میں اُس قوی البصر (تیز نظر) پر ترجیح نہ دے گا، بلکہ قوتِ بصر میں باوجود قلّتِ مُبصَرات شخصِ اوّل ہی کو فائق و افضل سمجھے گا۔

www.rahimia.org

جب یہ بات معلوم ہوچکی کہ ایمان اور تمام اعمالِ صالحہ کا وجود و عدم (ہونا اور نہ ہونا) اور کمال و نقصان ''ملکۂ امانت'' کے وجود و عدم اور کمال و نقصان کے ساتھ وابستہ ہے کہ تو اب اربابِ فہم بلا تأمّل تسلیم کرلیں گے کہ کفر اور تمام اعمالِ بد کا وجود و عدم ''ضدِ امانت''، یعنی ''فتنہ'' کے وجود و عدم پر اسی طرح موقوف سمجھا جائے گا، جیسے ''ہدایت'' کے وجود و عدم کو علم کے وجود و عدم پر موقوف کہنے سے ''ضلالت'' کے وجود و عدم کو جہل کے وجود و عدم پر موقوف کہا جاتا ہے۔

اور یہ اس پر کیا موقوف ہے، جن کو عقل سے کچھ بھی لگاؤ ہے، وہ ایک ضد کی حالت سمجھ لینے سے بے تکلف دوسری ضد کا حال معلوم کرلیا کرتے ہیں۔

تو اب کوئی صاحبِ فہم و انصاف حضراتِ صحابہ —رضوان اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین — کے أفضلُ الاُمّت ہونے میں ان شاء اللہ متأمّل نہ ہوگا۔ کیوں کہ صفتِ امانت اور برکاتِ نبوت میں — جو کہ جملہ امورِ ایمانی کی اصل ہے — حسبِ معروضۂ سابقہ حضراتِ صحابہؓ کا نمبر سب سے اوّل اور افضل ہے۔ اور جب حضراتِ صحابہؓ کی أفضلُ الاُمّت ہونے کی لِمّ اور عِلّت معلوم ہوگئی تو اب یہ بھی واجبُ التّسلیم ہوگا کہ جس کی صفتِ امانت فاسد و خراب ہوگی، اُس سے زیادہ ایمان سے محروم اور بدنصیب کوئی نہ ہوگا، بلکہ اُس کا ناقص الایمان اور بدترین خلائق ہونا ایسا ہی مُسلَّم ہوگا، جیسا حضراتِ صحابہؓ کا أفضلُ الاُمّت اور أکملُ المؤمنین ہونا واجب التّسلیم ہے۔ گو وہ کیسا ہی صاحبِ کمال و عقل سمجھا جائے۔

(''امانت'' ضروری اور بہتر اور ''فتنہ'' مُضر اور بدتر ہے)

خلاصہ یہ نکلا ہے کہ ''امانت'' سے ضروری اور بہتر اور ''فتنہ'' سے زیادہ مُضر اور بدتر ہمارے حق میں دوسری چیز نہیں ہوسکتی۔ اور جس زمانے میں امانت کا غلبہ ہوگا، وہ زمانہ خیرُ القُرون اور جس زمانے میں فتنے کا غلبہ ہوگا، وہ زمانہ شرُّ القُرون کے خطاب کا مستحق ہوگا۔

(رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو جہالت اور فتنوں سے بھی باخبر کیا تھا)

یہی وجہ ہے کہ ہمارے مُربیٔ اوّل، رؤف و رحیم، بشیر و نذیر ﷺ نے جیسے ہدایت کے دونوں ارکان — یعنی علم و امانت — کی حقیقت اور اُن کی ضرورت و منفعت پر ہم کو طرح طرح سے مطلع فرمایا، ایسے ہی اُن دونوں ارکان کی ضد — یعنی جہل و فتنے — کی اصلیت اور اُن کی خرابی و مُضَرَّت سے ہم کو آگاہ فرمانے میں ہر قسم کی تاکید اور تنبیہ سے کام لیا۔

جو حضرات کتبِ علمِ وحی کی ورق گردانی کرتے رہتے ہیں، اُن کو میری تصدیق میں تأمُّل نہ ہوگا۔ اُن ارشادات کے ملاحظے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ نے اُس جہالت و ضلالت کے زمانے میں — کہ جو جہالت و ضلالت میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا — اپنی رحمت سے قلوبِ بنی آدم میں مضمونِ امانت کو اِلقا فرمایا اور اپنے بندۂ خاص سرآمد جملہ خواص ﷺ کو بھیج کر اس کے فیض و برکت سے مضمونِ امانت کو وہ ترقی عطا فرمائی کہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہوگیا اور زنگ خوردہ قلوب کو ایسا مجلّٰی اور مصفّٰی (صاف ستھرا اور روشن) کردیا کہ بھلے بُرے کی تمیز گویا آنکھوں سے سب کو محسوس ہونے لگی۔ اور قلوبِ انسانی کو ہر طرح سے قابلِ قبولِ ہدایت بنا کر علمِ وحی — یعنی قرآن و حدیث — سے مالا مال کرنا شروع کردیا۔ جس کے فیض سے وہی افراد کہ جن

کو جاہل، کافر، مشرک، گمراہ کہا جاتا تھا، چندروز میں رئیسُ المُوَحّدین اور رأس المتّقین اور إمام الأصفیاء و الصّالحین نظر آنے لگے۔ اور جن کی وجہ سے شرک و ضلالت میں وہ زمانہ بے نظیر شمار ہوتا تھا، آج ہم انھیں کے طفیل سے ہدایت و سعادت میں کسی زمانے کو اُس کا ہم پلہ نہیں کہہ سکتے، بلکہ آئندہ کو بھی اُمید نہیں کر سکتے۔

اس کی مثال بالکل ایسی سمجھنی چاہیے، جیسے اوّل زمین کو قابلِ زراعت بنایا جاتا ہے۔ پھر اُس میں تخم ریزی کرتے ہیں۔ جس قدر زمین قابل اور تخم ریزی کامل ہوگی، اُسی قدر زراعت اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ اور ان دونوں جزو میں جتنی خرابی اور کمی ہوگی، اُسی قدر زراعت میں خرابی و نقصان ظاہر ہوگا۔ ایسے ہی جس زمانے، جس گروہ میں علم و امانت جس قدر کامل ہوں گے، اُسی قدر ہدایت و خیریت اُن میں کامل ہوگی۔ اور جس ملک اور جس زمانے اور جس قوم میں جس قدر علم و امانت میں نقصان ہوگا، اُسی قدر اُن میں خرابی اور بُرائی اور گمراہی کا ظہور ہوگا۔

(حضور ﷺ نے آخر زمانے میں پیدا ہونے والی جہالت اور فتنوں سے باخبر کیا)

اسی کے ساتھ اُس بشیر و نذیر، عالِم علومِ اوّلین و آخرین ﷺ نے خوب سمجھا دیا کہ یہ خیریت — جو میرے زمانے میں ہے — ہمیشہ قائم نہ رہے گی، بلکہ کچھ عرصے کے بعد علم و امانت میں خلل آنا شروع ہوجائے گا۔ اور رفتہ رفتہ جہل کا غلبہ اور فتنے کا تسلط قلوبِ بنی آدم پر پورا پورا ہوجائے گا۔ اور علم و امانت کے خراب ہوجانے کے بعد:

(الف) تمام خرابیاں میری اُمت میں عام اور شائع (پھیلی ہوئی) ہوجائیں گی۔

(ب) اور تحریفِ کتاب اللہ اور تغییرِ احکامِ خداوندی اور ہر قسم کی بداعمالی اور فسق و فجور میں یہود و نصاریٰ سے کم نہ رہیں گی۔

(ج) اور تمام گمراہی اور بداَعمالی کی اصل اصول، یعنی فتنے کی تشریح خوب واضح فرما دی اور فتنے کے جملہ اقسامِ ظاہری و باطنی خاصہ اور عامہ متعلقۂ ملک و ملت سب کو ایسا ظاہر فرما دیا کہ آج ہم کو اپنی حالت دریافت کرنے کے لیے اپنے گریبان کی طرف سر جھکانے کی بھی حاجت نہیں۔

(د) اور اَبنائے زمانہ کی بڑی بڑی تحقیقات اور سلف صالحین اور علمائے راسخین پر اُن کے کڑے کڑے اعتراضات اور احکامِ شرعیہ سے اُن کے بڑے بڑے اختلافات اور اُس پر اُن کے مدّاحین کے عظیم الشان عطا کردہ خطابات سب کو دیکھ کر اور سُن کر بجز اس کے کہ ارشاداتِ نبویہ — علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ و السّلام — کی تصدیق آنکھوں سے اور کانوں سے محسوس ہونے لگی۔ بحمدِ اللّٰہ اَور کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔

(علم و امانت اور جہل اور فتنے میں امتیاز کرنا دُشوار نہیں ہونا چاہیے)

اہلِ علم و فہم کو معلوم ہے کہ جہلِ مرکب اور علم میں اور امانت و فتنے میں باہم امتیاز کرنا دُشوار ہے، جو ہر ایک کا کام نہیں، مگر حسبِ معروضاتِ سابقہ پیروانِ قرآن و حدیث اور مُتبّعانِ احکامِ خدا و رسول کو اس میں اس قدر سہولت ہے کہ کوئی دِقت ہی نظر نہیں آتی۔ ہمارے اعمال کیسے ہی بُرے ہوں، مگر قرآن و حدیث کے ہوتے ہم کو دربارۂ علم و امانت کسی مغالطے میں مبتلا ہونے کی بحمدِ اللّٰہ کوئی وجہ نہیں۔

(1۔قرآن و حدیث کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والا احادیث کی روشنی میں)

مثلاً ہم جب بھی دیکھیں گے کہ کوئی مدعیٔ عقل و علم، قرآن و حدیث کا کسی امر میں دیدہ دانستہ خلاف کر رہا ہے یا کوئی ناواقف اپنی خود رائی اور عقل کے زور سے احکامِ شرعیہ میں دخل دیتا ہے تو ارشاداتِ رسول علیہ السلام:

(۱) ''إنّ من العلم لجَهلاً'' [57] (ترجمہ) بعض علم تو سراسر جہل ہوتا ہے۔

(۲) اور ''اتّخذوا رؤسًا جهّالًا، فسُئِلوا، فأفتوا بغير علمٍ، فضلّوا و أضلّوا''. [58]

(ترجمہ) لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے۔ پھر اُن سے مسئلے پوچھے جائیں گے تو وہ بلاعلم کے فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دیکھ کر ہم بِلا توریہ (بغیر کسی لاگ لپیٹ کے) اُس کو جاھِل اور ضالّ و مُضِلّ (خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والا) سمجھنے اور کہنے پر ماموراور مستعد ہوں گے اور اس کے فتوے کو واجب الرّدّ (لازمی طور پر تردید کرنے کا) اعتقاد کریں گے۔

(2۔سلف صالحین سے ہٹ کر قرآن و حدیث سمجھانے والے کے بارے میں ارشادِ رسولؐ)

اور جب کوئی ہم کو قرآن و حدیث کے متعلق ایسے مضامین سمجھائے گا کہ نہ ہم نے کبھی سنے، نہ ہمارے اکابر نے تو حسبِ ارشادِ رسولِ کریم:

''يكون في آخر الزّمان دجّالون كذّابون، يأتونكم من الأحاديث بما لم تسمعوا أنتم و لا آباء كم، فإيّاكم و إيّاهم، لا يضلّونكم و لا يفتنونكم''. [59]

(ترجمہ) آخر زمانے میں بہت سے جھوٹے دجال نکلیں گے، جو تم کو ایسی باتیں سنائیں گے کہ نہ تم نے کبھی سنی ہوں گی، نہ تمھارے باپ دادا نے۔ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا۔ کہیں تم کو گمراہ نہ کردیں اور فتنے میں نہ مبتلا کردیں۔

ہم بے شک اُس کے اقوال سے اجتناب اور نفرت کریں گے اور اُس کو گمراہ کرنے والا اور فتنے میں ڈالنے والا بالیقین (یقینی طور پر) خیال کریں گے اور اُس کو صاحبِ علم و صاحبِ امانت تو وہی کہہ سکتا ہے جو خود پورا جاہل اور پورا مفتون (فتنے میں مبتلا) ہو۔

(3۔کرسی نشین منکرِ حدیث کے بارے میں ارشادِ رسولؐ)

اور اگر ہم کسی کرسی نشین کو دیکھیں کہ وہ اپنے عقلی خیالات سے ہم کو متابعتِ حدیث سے روکتا ہے اور احادیث کو غیر معتبر بتا کر ہم کو صرف کتاب اللہ کی متابعت کی رائے دیتا ہے تو حسبِ ارشادِ مخبرِ صادق:

ألا! إنّي أوتيت القرآن و مثله معه ألا يوشك رجل شبعان علىٰ أريكته يقول: عليكم بهٰذا القرآن! فما وجدتّم فيه من حلال فأحِلّوه، و ما وجدتّم فيه من حرام فحَرِّموه''. [60] (و قال عليه السّلام:) ''ألا و إنّ ما حرّم رسول الله كما حرّم الله''. [61]

(ترجمہ) آگاہ ہوجاؤ کہ مجھ کو قرآن مجید عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اَور۔ دیکھنا ایک بہت پیٹ

بھرا ہوا شخص اپنی مسند پر بیٹھا ہوا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لے لو (اور حدیث وغیرہ کو چھوڑ دو) جو کچھ اس میں حلال پاؤ، اُس کو حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ، اس کو حرام سمجھو۔ حال آں کہ خدا کے رسولؐ نے جس چیز کو حرام بتلایا ہے، وہ بھی ایسا یہ حرام ہے، جیسا خدا تعالیٰ کا (قرآن میں) حرام بتلایا ہوا۔)

ہم پر فرض ہوگا کہ ہم اُس مال دار مسند نشین کے کلام کو لغو اور باطل سمجھیں اور ہرگز ہرگز سوائے تردید و ابطال (باطل کہنے) کے اُس کی طرف توجہ بھی نہ کریں۔

(حضور ﷺ کی احادیثِ صادقہ ہر چھوٹے بڑے فتنے کے بارے میں ہیں)

الغرض! اس پُر آشوب وقت میں جس قدر فتنۂ ظاہری و باطنی خاصہ و عامہ بڑے چھوٹے عالم گیر نظر آ رہے ہیں، انشاء اللہ ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس کی حقیقت اور حالت مُخبرِ صادق، جامع علوم اوّلین و آخرینؐ کی احادیثِ صادقہ میں موجود نہ ہو۔ احادیثِ رسولِ امینؐ کو سرسری نظر سے دیکھ کر بھی ہم کو علم و جہل اور امانت و فتنے میں کوئی التباس، کوئی خلجان نہیں پیش آ سکتا، بلکہ سہولت سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ امر فتنے کی کس قسم میں داخل ہے اور وہ امر کس قسم میں۔

ہاں! جس بدقسمت کو احادیث ہی سے استنکاف (نفرت) اور بے خبری ہو، وہ ضرور (ارشادِ خداوندی):

''وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ''[62] (اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے، جس میں اب پڑ رہے ہیں)

کا مصداق ہوگا۔ حتیٰ کہ ''جہل'' کو ''علم'' اور ''فتنہ'' کو ''امانت'' سمجھے گا۔ سو ایسے لوگ جو چاہیں کریں، وہ جانیں۔ ہم کو تو صرف یہ بتلا دینا منظور ہے کہ جس قدر امانت ضروری اور مفید امر ہے، اُسی قدر فتنہ ہمارے حق میں مُضِر اور تمام خرابیوں کی جڑ ہے اور حسبِ ارشادِ رسولِ کریم — علیہ الصّلوٰۃ و التسلیم — سلف کا زمانہ جیسا امانت و ایمان و علم و صدق و ہدایت و خیریت کا زمانہ تھا، ویسا ہی حسبِ ارشاد مخبرِ صادق — علیہ الصّلوٰۃ و السّلام — یہ زمانہ ہجومِ فتنہ اور فسادِ امانت اور جہل و ضلالت کا زمانہ ہے۔ اور ارشاداتِ حضرت فخرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم:

(۱) ''إنّي لأرى الفتن تقع خلال بيوتكم كوقع القطر''.[63]

(میں تمھارے گھروں میں فتنوں کو گرتے ہوئے ایسا دیکھ رہا ہوں، جیسے بارش گرا کرتی ہے۔)

(۲) اور ''لا تقوم السّاعة حتّٰى يُقبض العلم و تكثر الزّلازل و يتقاب الزّمان و تظهر الفتن''[64]

(ترجمہ) علم ضبط کر لیا جائے گا اور طرح طرح کے فتنے ظاہر ہوں گے۔

(۳) اور ''إنّ من أشراط السّاعة أن يّرفع العلم و يكثر الجهل''.[65]

(ترجمہ) قیامت کی علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم اُٹھا لیا جائے اور جہل کی کثرت ہو۔

(۴) اور ''إذا ضُيِّعت الأمانة فانتظر السّاعة''.[66]

(جب دلوں سے امانت کھو دی جائے تو قیامت کے منتظر ہو بیٹھو۔)

(۵) اور ''تُعرض الفتنُ علىٰ قلوب كالحصير الخ''.[67]

(جیسے چٹائی میں ایک ایک تیلی لگاتے ہیں، اسی طرح یکے بعد دیگرے فتنے دلوں پر پیش ہوں گے۔)

وغیرہ ارشادات کا پورا مصداق ہے،

حتیٰ کہ حضرت سرورِ کائنات — علیه الصّلوٰۃ و التسلیمات — نے فرمایا ہے:

(٦) اور ''لا يُعروف معروفاً و لا يُنكر منكرًا إلّا ما أشرب من هواه''. (68)

یعنی بعض قلوب میں فتنہ اس قدر راسخ ہوجائے گا اور مضمون امانت سے اتنی دور جا پڑیں گے کہ شریعت وعلم وعقل سب سے آزاد ہوکر اپنی خواہشاتِ بے ہودہ کے ساتھ جس چیز کو موافق دیکھیں گے، اُس کو ''معروف'' اور اچھا سمجھیں گے اور جو چیز اُن کی خواہشات کے خلاف ہوگی، اُس کو ''منکر'' اور بُرا کہیں گے۔ یعنی عقل ونقل واقوالِ اکابر سب کو پسِ پشت ڈال کر صرف اپنی ہوا و ہوس کے مُقلّد اور تابع ہوں گے اور اُسی کو مفید اور حق سمجھیں گے۔

سو میرے نزدیک اگر چند لمحے کے لیے ہم گریبان کی طرف سر جھکا کر غور کریں گے تو موجودہ زمانے میں اس أخبــــــث المراتب کے نظائر ملنے میں بھی غالباً ہم کو دُشواری نہ ہوگی۔ و العیاذ باللّٰہ الرّحیم۔

(ہمارے مقدس اکابر نے اسی بدترین حالت کا نقشہ کھینچا ہے)

ہمارے مقدس اکابر اسی بدترین حالت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

''بعض افرادِ انسانی اپنی اصل طبیعت سے ملحد مزاج اور ایسی زندیق فطرت ہوتے ہیں کہ ظاہر میں گو کلمۂ اسلام زبان سے کہتے ہیں، لیکن خدا و رسول، دین و مذہب، حساب و کتاب، عذاب وثواب، دوزخ و جنت وغیرہ امور کا اُن کے دل میں یقین اور ان امور پر اُن کو وثوق و اعتماد نہیں ہوتا۔ صرف نشیب وفرازِ دُنیوی ہی میں سعادت و شقاوت (نیک بختی اور بدبختی) کو منحصر سمجھتے ہیں اور حصولِ جاہ اور تحصیلِ مال کو اصلی کمال اور منتہائے پرواز جانتے ہیں۔ وہ ''عاقل وفہیم'' اُسی کو سمجھتے ہیں، جو تحصیلِ جاہ و مال میں مشغول ہو۔ اور ''حکیم'' و ''مصلحِ قوم'' حتیٰ کہ ''ہادی'' و ''مقتدیٰ'' اُسی کو کہتے ہیں، جن کو نشیب وفرازِ دُنیوی میں مہارت اور مصروفیت ہو۔

اور جس کو ان امور سے مجتنب (دور رہنے والا) اور یکسو پاتے ہیں، اُس کو ''جاہل'' اور ''غبی'' اور ''بے وقوف'' اور ''نکما'' خیال کرتے ہیں۔ جو سعی و جاں فشانی (محنت اور جدوجہد) تحصیلِ دنیا کا باعث نہ ہو، اُس کو ''بے ہودہ''۔ اور جو محنت و مشقت وسیلہ حصول اغراضِ دُنیوی نہ ہو، اُس کو ''بے سود'' تصور کرتے ہیں۔ جو لوگ اتباعِ انبیؑا اور ہادیانِ دین میں سرگرم ہیں، اُن کو ''بے عقل'' اور ''احمق'' کہتے ہیں۔ اور اقوال و افعال و معاملات و عادات میں مذہب کی رعایت اور پابندی کو ''حماقت'' اور ''سفاہت'' بتلاتے ہیں۔ طاعت وعبادت میں جانکاہی اور مشقت کو ''نادانی'' اور صبر وقناعت اور زہد وتوکل کو دلیلِ کمزوری اور ناتوانی سمجھتے ہیں۔ احکاماتِ شرعیہ کو ''رسومِ بے اصل'' سے زیادہ نہیں مانتے اور طرح طرح سے طعن وتشنیع اُس پر کرتے رہتے ہیں۔

مضامینِ شاعرانہ اور دلائل فلسفیانہ وملحدانہ، احکامِ ربانی کے مقابلے اور معارضے میں پیش کرکے ہر طرح سے اُن احکامِ حقہ کی توہین اور اُن پر طعن اور تشنیع کرکے عوام کی نظروں میں اُن کی وقعت و اعتبار گھٹانے کی سعی کرتے

www.rahimia.org

رہتے ہیں۔ اُن کی تحریر وتقریر میں چرب زبانی اور شوخ قلمی کے ساتھ امورِ شرعیہ اور پابندانِ شرع پر طرح طرح سے طنز، و رمز (اشارے)، طعن وتشنیع، استہزا وتلبیس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہوتا۔ اور اپنے مخترعات و ایجادات (گھڑی ہوئی اور ایجاد کردہ باتوں) کو احکامِ حقہ شرعیہ پر ترجیح دینے میں مطلق العنانی و بے باکی و چالاکی سے پورا کام لیتے ہیں۔ دنیا کے جزوی اور احتمالی منافع کی اس قدر رعایت و اہتمام کرتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے احکامِ مصرحہ قطعیہ شرعیہ (واضح طور پر بیان کردہ قطعی شرعی احکام) کے انکار وتحریف وتاویل کی کچھ بھی پرواہ نہیں کی جاتی اور خم ٹھوک کر فخر ومباہات کے ساتھ احکامِ حقہ کی تکذیب وتردید کی جاتی ہے''۔

سو! اَب یہ تو کیا عرض کروں کہ ایسے لوگوں کے حق میں شریعت کیا حکم دیتی ہے اور ہمارے مقدس اکابر نے کیا فرمایا ہے۔ جو طالبِ حق ہو، تحقیق کرلے۔ ہم کو تو اس موقع پر صرف اتنا عرض کرنا مقصود ہے کہ ہمارے مربیٔ اوّلؐ اور اُن کے سچے جانشینوں نے یہ تمام فتنے اور اُن کے تفصیلی حالات واحکامِ مشرح بیان فرما کر ہم کو ایسا بے نیاز فرما دیا تھا کہ آج ہم کو اپنے یا کسی دوسرے کی وسعت خیالی اور اختراعِ عقلی اور رطبُ اللّسانی اور خوش بیانی اور کمالِ علمی اور دور اندیشی اور دلائلِ فلسفی اور شواہدِ ہیئت وطبعی اور طمعِ مفادِ دُنیوی وغیرہ دیکھ کر، یا سُن کر سوا اس کے کہ اپنے مقدس ہادی ﷺ کے ارشاداتِ صادقہ کی تصدیق اَور زیادہ ہوتی، بہ شرطِ فہم وانصاف۔ ان باتوں کا دوسرا کوئی اثر ہم پر نہ ہوسکتا ہے۔

(اس غلبۂ جہل اور فتنے کے زمانے میں جہالت اور فتنے کا نام، علم اور امانت رکھ دیا گیا)

اس سے زیادہ تعجب خیز کون سا امر ہوگا کہ مربیٔ صادق ﷺ نے جن باتوں کو تفصیلی وتحقیقی طور سے ہم کو بتلا دیا تھا، اور ان کے حالات واحکام پوست کندہ سمجھا دیے تھے کہ زمانۂ غلبۂ جہل و فتنے میں ایسا ایسا ہوگا۔ جب آج جو وہ ناپاک امور ہوبہو ہمارے سامنے پیش آئے تو بجائے (رسول اللہؐ کی) تصدیق (کرنے کے)، ہم نے یہ کیا کہ ''جہل'' کو ''علم'' اور ''فتنہ'' کو ''امانت'' یقین کر کے ارشاداتِ صادقہ مربیِ شفیق ورحیم کے مقابلے کے لیے بڑی چستی کے ساتھ کمر باندھ کر کھڑے ہوگئے۔

فنعوذ باللّٰه من شُرور أنفسنا و فساد عِلمنا و أمانتنا.

(ترجمہ) ہم خدا تعالیٰ سے اپنے نفسوں کی شرارت اور علم وامانت کے فاسد ہونے سے پناہ مانگتے ہیں۔

اور اُس غلبۂ جہل و فتنے نے ہم کو ایسا مسخ کر دیا کہ جملہ احکام و معاملات و رسوم و عادات وغیرہ شرعیہ کو طے کر کے نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ جیسی عباداتِ محضہ اور ارکانِ اسلامیہ میں بھی صرف ترک ہی پر ہم کو قناعت نہ ہوئی، بلکہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اپنے علم وعقل کے زور سے ارکانِ مذکورہ میں بھی کاٹ تراش کرنا اور اُن کی ضرورت اور لزوم میں رخنہ اندازی کرنا شروع کر دیا۔

شعر ؎

نخوت نگر کہ مے خلد اندر دلش ز رشک
حرفے کہ در پرستش معبود مے رود (69)

(تکبر نہ کرو، کہ اُس سے دل کے اندر حسد پیدا ہوجاتا ہے
کیوں کہ اس سے عبادت کے لیے کہے گئے حروف میں سے معبود چلا جاتا ہے)

جو حضرات مدعیانِ اسلام خدانخواستہ اس حد تلک پہنچ چکے ہوں کہ جن کی کیفیت بذریعہ حدیث شریف اور ارشادِ ا کابر ابھی عرض کر چکا ہوں، اُن کی خدمت میں تو ناصحانہ ہماری صرف یہ عرض ہے۔ شعر ؎

بہ بال و پر مرو ، از رہ کہ تیر پر تابے
ہوا گرفت زمانے ، ولے بہ خاک نشست (70)

(تُو بال و پر کی قوت کے بل مت چل کیوں کہ
دُور مار کرنے والا تیر تھوڑی دیر ہوا میں رہ کر پھر زمین پر آ گرتا ہے)

اور جو حضرات بِحمدِ اللہ اس حد تلک نہیں پہنچے، بلکہ اُن کے دل میں اسلام کی صداقت اور محبت اور خیر خواہی باقی ہے، مگر اسلام کی صداقت کے ساتھ اپنے علم و عقل، ہمت و تدبیر پر بھی پورا اعتماد ہے۔ اور اس وجہ سے اپنی عقل و فہم کے موافق اسلام کی اصلاح اور مسلمانوں کی درستی کرنا چاہتے ہیں، اُن کی خدمت میں خیر خواہانہ یہ عرض ہے۔ شعر ؎

چو مردِ دیں نہ با نفسِ کافر بر نمے آئی
سکندر نیستی اندیشہ از نیروی دارا کُن (71)

(بطور ایک دین دار انسان آپ کافر روح کے ساتھ نہیں آتے ہیں)
(آپ سکندر نہیں ہیں ، دارا کے بارے میں سوچیں)

ہم مکرر عرض کر چکے ہیں کہ احکامِ الٰہی میں کسی کی عقل کافی تو کیا، دخل دینے کی بھی لیاقت اور منصب نہیں رکھتی۔

(ایک سچی جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی)

اس وقت تلک جو جو ستم و جفا مدعیانِ اسلام کے ہاتھ سے دینِ اسلام پر ہو چکا ہے، سچے اسلام کی نیست و نابود ہو جانے کے لیے کافی سے بھی زائد ہے۔ چناں چہ ادیانِ صادقہ گزشتہ مردہ سب اس کی زندہ نظیر ہیں۔ مگر اُسی مربیِ شفیق اور مخبرِ صادقؐ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ:

''ہر چند اسلام کے اندر اخیر زمانے میں سب ادیانِ سابقہ سے زائد اختلافات و فتنے ظہور پذیر ہوں گے، مگر حق تعالیٰ کی رحمت سے یہ ہوگا کہ ایک جماعت ہر قرن میں ایسی بھی موجود رہے گی کہ اسلام کی حمایت اور اُس کے احکام کی حفاظت سچے ذریعے سے کرتی رہے گی اور درباره دینِ اسلام وہ جملہ اہلِ باطل پر غالب رہے گی۔ اُن کی وجہ سے احکامِ الٰہی اور دینِ اسلام اہلِ باطل اور اہلِ فتنہ کے تصرفات سے محفوظ رہیں گے۔ جو جو اختراعات اور غلط باتیں اربابِ جہالت و فتنہ دین میں وقتاً فوقتاً ملاتے رہیں گے، اُن کو وہی جماعت قلیل اپنے اپنے زمانے میں دینِ حق سے ایسے نکالتے رہیں گے، جیسے دودھ سے مکھی یا خمیر سے بال۔ اور اہلِ فتنہ اور اہلِ ضلالت کا اثر اُن کے متبعین ہی تلک محدود رہے گا۔ اسلام کے خط و خال پر اُس کا اثر نہ آنے پائے گا اور اسی غریب جماعت کی حمایت سے باذن اللہ دینِ اسلام اخیر تلک اپنی اصلی حالت پر محفوظ رہے گا''۔ (72)

سو! یہ محض حق تعالیٰ کا فضل و انعام ہے، جس کا مشاہدہ برابر ہو رہا ہے۔ اور جو کسی دین کو نصیب نہیں ہوا۔ اگر گوشِ حقیقت

نیوش ہو تو غریب اسلام آج اپنے دانا دشمن اور نادان دوست کو (یعنی انھیں دونوں قسم کی جماعتوں کو جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے) خطاب کر کے بہ آوازِ بلند کہہ رہا ہے۔ شعر ؂

قتل ایں خستہ بہ شمشیر تو تقدیر نہ بود
ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نہ بود [73]

(تیری تلوار سے قتل ہونا اُس زخمی کے نصیب میں ہی نہیں لکھا تھا
ورنہ تیرے بے رحم دل نے تو کوئی کسر نہ چھوڑی تھی)

(آخر زمانے کی سچی جماعت علمِ وحی اور صفتِ امانت سے حصہ وافر رکھتی ہے)

اس پر طُرّہ یہ ہے کہ اُس غریب باخیر جماعت سے جیسے احکامِ شرعیہ اور علوم مذہبی اسلامی کی حفاظت اور حمایت کرائی جاتی ہے، ویسے ہی اُس جماعت کو اُس فیض و برکت (صفتِ امانت) میں سے اپنے اپنے درجے کے موافق حصہ عنایت کیا جاتا ہے۔ جو حسبِ معروضاتِ سابقہ ہمارے مربیٔ مقدس اور ہادیٔ اوّل ﷺ کے ہمراہ تھا اور جس فیض و برکت کا اثر قلوبِ بنی آدم میں پہنچ کر مُوجِبِ ھدایتِ عامۂ خلق اللہ (اللہ کی مخلوق کو عام ہدایت کا سبب) ہوا تھا۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ہدایت کے وہی دو رُکنِ اعظم کہ جن کا نام ''علمِ وحی'' اور ''صفتِ امانت'' تھا، اُن دونوں میں سے ہر زمانے میں اُس جماعتِ موصوف کو درجہ بہ درجہ حصہ عنایت ہوتا ہے اور اُن سے نیابتِ رسول اور ہدایتِ مخلوق کا کام لیا جاتا ہے اور جیسے وہ حضرات علمِ وحی کے عالم ہوتے ہیں، ویسے ہی اُن کی مجالست، اُن کے قرب، اُن کے تعلق، اُن کی محبت سے کیفیتِ امانت دلوں میں ظاہر اور ترقی پذیر ہوتی ہے۔ اور یہی حضرات' رسولؐ کے سچے نائب اور (ارشادِ نبویؐ) ''علماء اُمّتی کأنبیاء بنی إسرائیل'' [74] کے واقعی مصداق ہوتے ہیں۔ اِنھیں نفوسِ قدسیہ کی ہمت و برکت سے بقائے دین و ایمان اور اِنھیں کے فیض و حمایت سے جہل و فتنے کی روک تھام ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ حق سبحانہ کا اتنا بڑا انعام ہے۔ جس کی قدر وہی جان سکتا ہے، جس کو مرتبۂ نبوت کی عظمت اور انبیائے کرام کے کمالات کی حقیقت کما حقہ معلوم ہو۔ ورنہ جن افرادِ زمانہ کے قلوب میں خود انبیائے کرام ہی کی کل حقیقت یہ ہے کہ: ''نبی مصلحِ قوم کا نام ہے'' تو اُن کی آنکھوں میں بے چارے غریب نائبوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

فإلی اللّٰہ المشتکٰی من جور الفتن و الھوٰی.

(اللہ ہی سے شکایت ہے فتنوں اور خواہشات کے ظلم سے۔)

(اس سچی جماعت کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوگا)

الحاصل! وہ علمِ وحی اور امانت کہ جو ایمان اور اُس کی تمام اصول و فروع کے لیے مبنیٰ (بنیاد) اور موقوف علیہ تھی، اُس کی تعلیم و تحصیل میں حسبِ بیاناتِ سابقہ پوری وسعت اور سہولت کے فرمائی گئی اور حسبِ ارشاداتِ نبی کریم — **علیہ الصّلٰوۃ و السّلام** — تا بہ قیامت اُس کا ایسا انتظام فرما دیا گیا کہ باوجود غلبہ جہل و ضلالت اور باوجود کثرتِ فتنہ اور عدمِ امانت' ان ہر دو کمال کا سلسلہ کسی حالت اور کسی وقت میں منقطع نہ ہونے پائے۔

و الحمدُ للّٰہ کما ینبغی لجلال وجهه و لعظم سُلطانه.

(اللہ ہی کے لیے سب تعریفیں ہیں، جیسا کہ اُس کی جلالتِ شان اور عظمتِ سلطانی کے شایانِ شان مناسب ہے۔)

(دجالوں، کذابوں اور فتنہ پروروں کا سلسلہ بھی جاری رہے گا)

مگر اسی کے ساتھ اہلِ اذہانِ صافیہ اس کو بھی تسلیم کرلیں گے کہ جیسا ان نائبانِ رسول کے ذریعے سے اہلِ علم کو اپنے اپنے تعلق اور مناسبت کے باعث علمِ وحی اور فیضِ امانت پہنچتا ہے، اسی طرح پر اُن لوگوں کی وجہ سے کہ جن کے وقتاً فوقتاً آنے کی آپ نے خبر دی ہے اور اُن کو ''امامِ فتنہ'' اور ''دجّال'' اور ''کذّاب'' فرمایا ہے، اُن کی مجالست، اُن کی محبت اور مناسبت سے ضرور بہت سے افراد کے قلوب میں اپنی اپنی لیاقت کے موافق جہل و فتنہ اور شر و ضلالت کا اثر ظاہر اور ترقی پذیر ہوگا۔

يُضِلُّ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَهۡدِیۡ مَنۡ يَّشَآءُ [75] (راہ بھلاتا ہے جس کو چاہے اور سمجھاتا ہے جس کو چاہے)

چناں چہ یہ دونوں اثر ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جن کی تصدیق میں کوئی صاحبِ فہم و انصاف متامّل نہ ہوگا۔

(حضور ﷺ کے فرامین کی روشنی میں علم و امانت والی سچی جماعت اور گمراہ جماعت کی شناخت)

ہم اپنی غفلت اور ہوا و ہوس کے نشے سے متنبہ ہوکر انصاف سے دیکھ لیں کہ اہلِ علم و امانت اور اربابِ فتنہ و ضلالت کے بارے میں جو حضرت نبی کریم اور مربیٔ رحیمؐ نے ہم کو باتیں بتلائی ہیں، وہ آج صاف صاف اپنے اندر اور دیگر حضرات کے اندر آنکھوں سے کھلے طور پر ہم کو نظر آتی ہیں یا نہیں؟ جس کے ملاحظے کے بعد ہم کو ایمان و کفر، علم و جہل، امانت و فتنہ کی شناخت میں کوئی دُشواری نہیں۔ ہاں! ہم دیکھنا ہی نہ چاہیں یا دیکھ کر بھی اپنی سینہ زوری کیے جائیں تو اس کا علاج کوئی نہیں کرسکتا، لیکن حق تعالیٰ کے یہاں سب کا علاج ہے اور سب کچھ معلوم ہے۔ جو اُس کا یقین اب نہیں کرتا، عن قریب مجبوراً کرنا پڑے گا۔

(اصلی ایمان معلوم کرنے کا آسان نبویؐ طریقہ)

حضرت فخر الانبیاء — علیہ الصّلوٰۃ و السّلام — سے کسی نے ایمان کی علامت پوچھی۔ یعنی ایمانِ ظاہری کی نہیں، بلکہ ایمانِ اصلی حقیقی کی، جو کہ قلب کے متعلق ہے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

''إذا سرتک حسنتک و ساء تک سیّئتک فأنت مؤمن''. [76]

(جب تمھیں اپنی نیکی اچھی لگے اور اپنی بُرائی بُری لگے تو تم مؤمن ہو۔)

یعنی نیک کام کرکے تیرے دل میں مسرت ہو اور بُرا کام کرکے دل بُرا ہو تو تُو مؤمن ہے۔ اب ہم کم سے کم اپنے ایمانِ قلبی کو — کہ جس کا معلوم کرنا جاننے والے جانتے ہیں کہ کس قدر دُشوار ہے — اسی کسوٹی پر کھینچ کر دیکھ لیں کہ کھرا ہے یا کھوٹا اور کسی امر میں حق تعالیٰ کی اطاعت اور اُس کی عبادت کرنے سے ہم کو مسرت ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو کس قدر۔

علیٰ هٰذا القیاس (اسی طرح) گناہ کرکے ہمارا دل بُرا ہوا یا نہیں۔ اور ہوا تو کس قدر، جس کے ذریعے سے ہم اپنے

ایمان کی قوت وضعف، وجود و عدم کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اور اسی ارشادِ (نبویؐ) سے ہماری سمجھ میں بہ خوبی یہ بھی آ گیا کہ اگر کوئی ایسا ہو کہ عبادت اور نیک کام کر کے بجائے مسرت اُس کے دل میں تنگی اور کدورت اور بڑائی پیدا ہو اور بُرا کام کر کے دل میں انشراح اور مسرت وخوشی پیدا ہو یا کوئی شخص ایسا ہو کہ کسی عبادتِ خاص مثل صوم وصلوٰۃ وحج وزکوٰۃ سے اُس کے دل میں —نعوذ باللہ— اس قدر تنفر اور وحشت ہے کہ کسی حال اُس کے کرنے کا ارادہ بھی نہیں کر سکتا اور اُس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا تو ایسے شخصوں کو کیا سمجھنا چاہیے اور ہم کیا ہر منصفِ فہیم بذریعہ ارشاد مذکور اُس کا حکم سمجھ سکتا ہے۔

اور اس ارشادِ مذکورہ کی حقیقت سمجھنا چاہو تو وہی ہے جو بالتفصیل معلوم ہو چکی۔ یعنی جو شخص نیک کام کر کے مسرور اور بُرا کام کر کے مکدر ومغموم ہوتا ہے، اُس شخص کی رغبت ومیلانِ فطرتی — یعنی صفتِ امانت — معلوم ہو گیا کہ صحیح ہے۔ جس پر ایمان کا مدار ہے۔ اور جو شخص طاعت سے مُکَدَّر (دل میلا ہو) اور معصیت سے مسرور ہوتا ہے، معلوم ہو گیا کہ اُس کی رغبت اور میلانِ قلبی یعنی امانت فاسد ہو چکی ہے۔ اور ''لا إیمان لمن لا امانۃ لہٗ'' کا مصداق بن چکا ہے۔ فإنّا للّٰہ و إنّا إلیہ راجعون۔

(شریعت کے مخالف کام کو اچھا سمجھنا اور اُس پر اظہارِ مسرت' نہایت سنگین جرم ہے)

یہاں سے بہ شرطِ تدبیر وانصاف ہم کو یہ بات خوب دل نشین ہوگئی کہ بہت سے وہ احکامِ جزوی جو لباس وطعام، رفتار و گفتار، عادات و اَوضاع، نشست و برخواست کے متعلق ہیں اور اہلِ اسلام بہ کثرت اُن امور کو ایک حقیر بات سمجھ کر اُن میں خلافِ حکم شریعت اصلاً پرواہ نہیں کرتے، اُن میں دو امر قابلِ لحاظ ہیں:

(۱) ایک: تو خلافِ حکم شریعت کرنا، یہ جس درجے کا گناہ ہو۔

(۲) دوسرے: امر مخالف شرع کا استحسان (شریعت کے مخالف کام کو اچھا سمجھنا) اور اُس پر مسرت۔ یہ نہایت سنگین جرم ہے، جس کا ذکر ابھی گزرا۔

مثلاً ٹخنے سے نیچے پاجامہ پہننا یا داڑھی منڈوانا، یہ ایک گناہ ہے، مگر ان امور کو کر کے دل میں مسرت ہونی اور ان کے خلاف — یعنی شریعت کی موافقت کو — کراہیت اور ناگواری کی نظر سے دیکھنا' یہ نہایت خوف ناک امر ہے۔ جو فسادِ رغبت — یعنی نقصانِ امانت — کی دلیل ہے، جس سے اجتنابِ کلی (پورے طور پر بچنا) سب پر لازم اور ضروری ہے۔

یا فرض کیجیے کہ کسی کے دل میں نماز یا حج یا کسی اور امر شرعی کے کرنے کا کوئی تقاضا اور اہتمام نہیں اور نہ حکم وتاکیدِ خداوندی کا خیال ہے، مگر دبے دبائے، شرما شرمائے یا اپنی کسی نفسانی منفعت یا کسی دُنیاوی مصلحت کی وجہ سے اُس کام کو اپنے ارادے سے ادا کر لیا تو اب غور کرنا چاہیے کہ اُس طاعتِ مفروضہ کو ادا کر کے اُس کے دل میں کیا کیفیت پیدا ہوئی:

(الف) اگر خدانخواستہ کسی قسم کی کراہیت ونفرت یا انقباض (دل کی گھٹن) وکدورت پیدا ہوئی تو یہ اس قدر ردّی علامت اور سخت امر ہے کہ حقیقت میں اُس فرض کے ترک کرنے کا جرم بھی اس جرم سے بہت بڑا گھٹا ہوا ہے۔

(ب) اور اگر اُس فعل کو ادا کر کے مسرت اور استحسان دل میں آیا تو ارشاد فرمودہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہو گیا کہ اُس شخص کے دل میں بحمداللہ مضمونِ ایمان اب تلک موجود ہے۔ گو ایک عظیم معصیت یعنی ترکِ فرضِ خداوندی میں

مبتلا ہے، یعنی فاسق ہے کافر نہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآُولِي الْاَبْصَارِ (77) (سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو!)

و الحذر الحذر (بچو، اس سے بچو)۔

(ہم پر پہلا فریضہ علمِ وحی اور صفتِ امانت حاصل کرنا ہے)

المرام (مقصد یہ ہے کہ) ہم پر اوّل فرض یہی ہے کہ علم وحی اور صفتِ امانت کو اُن طریقوں سے کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے، حاصل کریں اور اُس کی ترقی میں کوشش کرنے سے نہ رُکیں اور اپنی تمام عبادات و معاملات کی باگ اُن کے ہاتھ میں دے دیں۔ اور تاوقتیکہ ہمارے یہ دونوں جزو پورے نہ ہوں گے۔ ہم کو اپنی درستیٔ مذہب اور اصلاحِ دین و ایمان کی توقع ایک خیالِ خام سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی۔ دنیاوی ثروت و وجاہت، حکومت و عزت کسی قسم کا کمال یا دولت ان امور سے ہرگز تحصیلِ ایمان اور ترقی اسلام ممکن نہیں۔ (شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے) شعر ؎

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است (78)
(مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ تک نہ پہنچ سکے گا اے دیہاتی!
اس لیے کہ تُو جس راستے پر چل رہا ہے، یہ ترکستان جاتا ہے)

ہر چند زمانہ غلبۂ جہل و ضلالت کا ہے اور فتنہ اپنا سکہ اکثر قلوب پر ایسا جما چکا ہے کہ کوئی خوش قسمت ہے اس موجِ طوفاں سے نکل سکے تو نکل سکے، مگر حق تعالیٰ کا فضل و رحمت نہ کسی زمانے کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کسی مکان کے ساتھ۔ نہ کسی جماعتِ خاص میں منحصر ہے، نہ کسی ملک میں اُس کا دروازۂ رحمت ہر وقت اور ہر کسی کے لیے رات دن کھلا ہوا ہے۔

اور بہ آواز بلند یہ کہا جا رہا ہے۔ شعر ؎

باز آ باز آ ہر آں چہ ہستی باز آ
گر کافر و رِند و بت پرستی باز آ
(باز آجاؤ، باز آجاؤ، تم جو بھی ہستی ہو، باز آجاؤ
(اگر کافر اور رِند اور بت پرست ہو تو اس سے باز آجاؤ)

ایں درگہِ ما، درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ (79)
(یہ ہماری درگاہ نااُمیدی کی درگاہ نہیں ہے
اگر سو بار بھی تم نے توبہ توڑی ہے تو پھر باز آجاؤ)

(ارشادِ نبویؐ)

''التّائب من الذّنب كمن لا ذنب له'' (80)

(گناہ سے توبہ کرنے والا اُس شخص کی طرح ہے، جس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔)

کا اعلان چارسُو عام جو اس کا مصداق بن سکے۔ **سبحان الله** ۔ توبہ سے کوئی مانع کوئی اُس سے خارج نہیں۔ کسی قسم کی تنگی نہیں۔ ادھر اسباب علم و امانت برابر موجود ہیں۔ پھر دیر کیا ہے۔

و ما علينا إلّا البلاغ. و الله وليُّ التّوفيق .

وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ (81)

و آخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين.

حوالہ جات وحواشی

1. **أخرجه احمد، حديث**: 12567.
2. 33-الاحزاب: 73-72۔
3. تفصیلات کے لیے دیکھئے! **حُجّة الله البالغه، مبحث اوّل، باب سرّ التكليف**، ج: 1، ص: 78، طبع: مکتبہ حجاز، دیوبند۔
4. شرح دیوان حافظ شیرازیؒ، تحقیق و ترجمہ: پروفیسر میاں مقبول احمد، قافیۃ الدال، غزل نمبر 55، ص: 390، طبع: مشتاق بک کارنر، لاہور۔
5. 2-البقرہ: 30۔
6. 2-البقرہ: 30۔
7. 2-البقرہ: 32۔
8. 7-الاعراف: 156۔
9. 20-طٰہٰ: 50۔
10. شرح دیوان حافظ شیرازیؒ، قافیۃ الدال، غزل نمبر 105، ص: 481۔
11. **صحيح بخاری، كتاب الاستيذان، حديث**: 6227۔
12. 2-البقرہ: 31۔
13. 20-طٰہٰ: 50۔
14. تفصیلات کے لیے دیکھئے! **حُجّة الله البالغه** از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، **المبحث الاوّل: باب سرّ التّكليف** اور **باب اختلاف الناس فی جبلّتهم المستوجب لاختلاف أخلاقهم و أعمالهم و مراتب كمالهم**۔
15. **صحيح بخاری، كتاب الجنائز، حديث**: 1385۔
16. 7-الاعراف: 179۔
17. 95-التّین: 5-4۔

www.rahimia.org

18۔ 3- آلِ عمران: 8۔

19۔ 33- الاحزاب: 72۔

20۔ **صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث: 1385۔**

21۔ 2- البقرہ: 31۔

22۔ 39- الزمر: 9۔

23۔ 33- الاحزاب: 72۔

24۔ شرح دیوان حافظ شیرازیؒ، قافیۃ الدال، غزل نمبر 152، ص: 564۔

25۔ 33- الاحزاب: 72۔

26۔ 3- آلِ عمران: 13۔

27۔ یہ دیوانِ متنبّی کا شعر ہے۔ اصل دیوان میں ''الشیء واحد'' کی جگہ ''و الفعل واحد'' ہے۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یعنی بہادر اور نامرد دونوں کا فعل ایک ہی ہے۔ اُن کو اپنی اپنی زندگی سے محبت ہے، مگر اس پر نتیجے مختلف مترتب ہوتے ہیں۔ بہادر خطرے کے مواقع میں اپنے آپ کو داخل کرتا ہے اور نامرد لڑائی کے نام سے کانپتا ہے۔ اور یہ اختلاف اس قدر زیادہ ہے کہ جس چیز پر بہادر کی تعریف کی جاتی ہے، اسی کو نامرد کے لیے بُرا سمجھا جاتا ہے۔
(دیکھئے! دیوانِ متنبّی، قافیۃ الباء، ترجمہ و تشریح: حضرت مولانا محمد اعزاز علی دیوبندیؒ، ص: 32، طبع: مکتبہ امدادیہ، ملتان، پاکستان)

28۔ دیوانِ داراشکوہ، از شہزادہ داراشکوہ، ص: 82، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، 1969ء۔

29۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، ردیف دال، غزل نمبر 141، ص: 545۔ نیز دیوانِ حافظ از حافظ شیرازی، ص: 211، پروگریسیو بکس، لاہور۔

30۔ حضرت شیخ الہندؒ نے نواب یوسف علی خاں کے شعر کو یہاں تصرف کے ساتھ برمحل استعمال کیا ہے۔ نواب صاحب کا شعر اس طرح سے ہے ؎

میں نے کہا کہ دعویٔ اُلفت، مگر غلط   کہنے لگے کہ، ہاں! غلط اور کس قدر غلط
(کلیاتِ ناظم، از سیّد یوسف علی خاں ناظم، ص: 199، مرتبہ و پبلشر: ذکیہ جیلانی، 1985ء)

31۔ کلیاتِ حزیں از شیخ محمد علی حزیں، ص: 454، طبع: منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ۔

32۔ 2- البقرہ: 191۔

33۔ **صحیح بخاری، کتاب الرّقاق، باب رفع الأمانۃ، حدیث: 6497۔**

34۔ کلیاتِ میر، از میر تقی میر، ص: 285، طبع منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، 1941ء۔

35۔ 7- الاعراف: 179۔

36۔ **رواہ مسلم عن انسؓ، کتاب الفضائل، حدیث: 6128**۔ یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ایک دفعہ ایسے لوگوں کے پاس سے گزرے کہ جو ''**تلقیح**'' یعنی مادہ کھجور میں نر کھجور کے گوبھ رکھ رہے تھے۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''**لو لم تفعلوا لصلح**'' (اگر تم ایسا نہ کرو تو ٹھیک رہے گا)۔
حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ اس طرح کرنے سے بڑی ناقص کھجور پیدا ہوئی۔ حضورؐ دوبارہ اُن کے پاس سے گزرے اور ناقص کھجور کو دیکھا تو اُن سے پوچھا: ''**ما لِنخلکم؟**'' (تمھاری کھجور کو کیا ہوا؟) تو انھوں نے کہا کہ آپؐ نے ایسے ایسے فرمایا تھا۔ تو آپؐ نے فرمایا: ''**أنتم أعلم بأُمور دنیاکم**'' (تم اپنے دنیا کے معاملات کو زیادہ بہتر جانتے ہو)۔

www.rahmia.org

37۔ صحیح مسلم، حدیث: 2363.

38۔ 2-البقرہ: 268۔

39۔ 2-البقرہ: 269۔

40۔ 45-الجاثیہ: 23۔

41۔ صحیح البخاری، کتاب العلم، حدیث: 100۔

42۔ کلیاتِ حزیں از شیخ محمد علی حزیں، ص: 320، طبع: منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ۔

43۔ 72-الجنّ: 26-28

44۔ 26-الشّعراء: 3۔

45۔ 73-المزمّل: 5۔

46۔ 54-القمر: 22۔

47۔ 15-الحجر: 9۔

48۔ سنن أبوداؤد، کتاب الأدب، باب ما جاء فی الشّعر، حدیث: 5012۔ امام ابوداؤدؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صعصعہ بن صُوحانؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ: ''اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی جس چیز کا علم نہیں رکھتا، تکلف اور بناوٹ سے اُس علم کا دعویٰ کرے، اس سے اُس کی جہالت ٹپکتی ہے''۔

49۔ دیوانِ متنبّی کے ایک شعر کا جز ہے۔ پورا شعر یہ ہے:

''و قد یلقّبہ المجنون حاسدہٗ إذا اختلطن و بعض العقلِ عُقّالُ''

(اور اُس کا حاسد اس کو مجنون کا لقب دیتا ہے، جب کہ لڑائی میں سیف و سنان آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور بعض عقلیں عمدہ کام سے روکنے والی ہوتی ہیں)۔ دیکھیے! دیوانِ متنبّی، قافیۃ اللّام، ص: 511۔

50۔ دیوانِ متنبّی کے شعر میں قدرے تصرف کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ شعر لکھا ہے۔ اصل شعر یہ ہے:

''و طوعًا لہ و ابتھاجًا بہ ، و إن قصّر الفعل عمّا وجب''

(دیکھیے! دیوان المتنبّی، قافیۃ الباء، ص: 49)

51۔ کلیاتِ عراقی، از شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی، ص: 124، طبع: انتشارات کتاب خانہ سنائی، ایران، ۱۳۷۵ھ۔

52۔ صحیح بخاری، کتاب الرّقاق، باب رفع الأمانۃ، حدیث: 6497۔

53۔ 36-یٰسین: 11۔

54۔ 87-الاعلیٰ: 10۔

55۔ 2-البقرہ: 2۔

56۔ شرح دیوان حافظ شیرازیؒ، ص: 1006۔

57۔ سنن أبوداؤد، کتاب الأدب، باب ما جاء فی الشّعر، حدیث: 5012۔

58۔ صحیح بخاری، کتاب العلم، حدیث: 100۔

59۔ مقدّمۃ صحیح مسلم، باب النّھی عن الرّوایۃ عن الضّعفاء و الاحتیاط فی تحمّلھا، حدیث: 16۔

60۔ سنن أبوداؤد، کتاب السّنّۃ، باب فی لزوم السّنّۃ، حدیث: 4604۔

61۔ **سنن ترمذی، کتاب العلم، باب ما نهٰی عنه أن يقال عند حديث رسول الله ﷺ،** *حدیث:* 2664۔

62۔ 6-الانعام: 9۔

63۔ **صحیح بخاری، کتاب الفتن،** *حدیث:* 7060۔

64۔ **صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء،** *حدیث:* 1036۔

65۔ **صحیح بخاری، کتاب النّکاح،** *حدیث:* 5231۔

66۔ **صحیح بخاری، کتاب العلم،** *حدیث:* 59۔

67۔ **صحیح مسلم، کتاب الإیمان،** *حدیث:* 369۔

68۔ ایضاً۔

69۔ دیوانِ غالب، از مرزا اسد اللہ خان غالب، ص: 227، طبع: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۳۸۴ھ۔

70۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، ردیف تاء، غزل نمبر 23، ص: 149۔

71۔ کلیاتِ حزیں، از شیخ محمد علی حزیں، ص: 616، طبع: منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۲۹۳ھ۔

72۔ اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی چند احادیث درج ذیل ہیں:

(۱) **''لا تزال طائفة من اُمّتی قائمين علٰى الحقّ، لا يضرّهم من خالفهم''.**

(صحیح مسلم، کتاب الإمارة، باب 53، حدیث: 4950).

(۲) **''یحمل هٰذا العلم من كلّ خَلَفٍ عدوله، ينفون عنه تحريف الغالين، و انتحال المبطلين، و تاويل الجاهلين''.**

(مشکوٰة المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، حدیث: 248).

73۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، **قافية الدّال**، غزل نمبر 108، ص: 488۔

74۔ **التّفسیر الکبیر،** از امام فخر الدین رازیؒ، ج: 19، ص: 98، تفسیر سورت ابراہیم، طبع: دار الکتب العلمیہ، طہران۔ **انموذج اللّبیب فی خصائص الحبیب،** از امام جلال الدین سیوطیؒ، ج: 1، ص: 115، **طبع: وزارة الإعلام بجدة الطّبعة الثّالثه،** ۱۴۰۶ھ (مکتبہ شاملہ)۔ اس حدیث کے حوالے سے حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ''مکتوبات'' میں لکھتے ہیں: ''وہم چنیں فرمودہ علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰت و السلام: **''علماء اُمّتی کأنبیاء بنی إسرائیل.''** مراد از علماء علمائے وارث اند۔ (دیکھئے! مکتوبات امام ربانی حضرت مجددالفِ ثانیؒ، دفتر اوّل، مکتوب نمبر 268، ص: 96-495۔ طبع: مطبع ایجوکیشنل، ایچ ایم سعید کمپنی، محرم الحرام ۱۳۹۲ھ)

75۔ 16-النحل: 93۔

76۔ مسند احمد، حدیث: 22166۔

77۔ 59-الحشر: 2۔

78۔ کلیاتِ سعدی، از شیخ سعدی شیرازیؒ، ص: 73، طبع: مؤسسۃ الانتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۴۹ھ۔

79۔ رُباعیات ابوسعید ابوالخیرؒ، ص: 14، ناشر: قادری اکیڈمی، کراچی، 1990ء۔

80۔ **سنن ابن ماجة، کتاب الزّهد،** *حدیث:* 4250۔

81۔ 81-التّکویر: 29۔

☆

www.rahmia.org

مطالعۂ علومِ قرآنیہ

ترجمۂ شیخ الہند ''مُوضحِ فرقانِ حمید''
پر اکابر علما کی تقریظات اور تائیدات

مرتب: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

حرفِ تعارف

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ نے برعظیم پاک و ہند میں سلیس فارسی میں ترجمۂ قرآن کریم —**فتح الرّحمٰن بترجمة القرآن**— کرکے قرآنی مطالب اور مفاہیم کو عام کردیا تھا۔ پھر آپؒ کے صاحبزادگان حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اُردو زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ ''موضح القرآن'' کرکے تمام لوگوں کے لیے اس سے استفادہ ممکن بنا دیا۔ خانوادۂ ولی اللّٰہی نے ایک طرف تو تراجمِ قرآن کے ذریعے دینی فکر کو عام کیا۔ دوسری طرف مساجد میں درس قرآن کا آغاز بھی انھیں حضرات کے زمانے سے ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت اس کا عمومی رواج نہ ہوا تھا۔

مساجد میں حلقہ ہائے درسِ قرآن کریم کا عمومی رواج اس وقت ہوا جب دارالعلوم دیوبند کے فضلا اور علما کی تربیت کے لیے ''ثمرۃ التربیت'' اور ''جمعیت الانصار'' جیسے ادارے وجود میں آئے۔ چناں چہ ان اداروں میں علمائے کرام کو تربیت دے کر تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا اور عام مسلمانوں میں دین کی پختگی پیدا کرنے کے لیے درس قرآن کریم کے حلقہ جات کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

اس کام کو مزید وسعت اس وقت ملی جب دہلی میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' نے اپنے مختصر دور میں ایسے علما کی تربیت کی جنھوں نے بہترین انداز اور منفرد اسلوب میں قرآن کریم کے دروس کا سلسلہ شروع کیا۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی قدس سرہٗ نے علما کو اس نہج پر مطالعہ قرآن کا شوق دلایا کہ آج اس دور میں ہم قرآنی مطالب اور مفاہیم سے کس طرح مستفید ہوسکتے ہیں۔ ہمارے گردوپیش بے شمار انفرادی اور اجتماعی مسائل موجود ہیں۔ قرآن حکیم اس حوالے سے ہماری کس طرح رہنمائی کرتا ہے۔ بالخصوص قومی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے قرآن حکیم کیا پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس طرح کے اہم ترین سوالات کے جوابات قرآن حکیم سے لیے جائیں۔ مسائل پر سوچنا اور فکر و تدبر کرکے قرآن کریم کی روشنی میں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیلِ نو کرنا اسی وقت ممکن ہے جب صحیح تناظر میں غور و فکر کرکے سلف کے طریقۂ کار کے مطابق قرآن کریم کے پیغام کو سمجھا جائے۔

اس منفرد تفسیری اسلوب کے پیچھے جو ذہن اور فکر کام کررہا تھا، وہ حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ اور حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کا تھا۔ ان دونوں حضرات کی باہم مشاورت سے یہ تمام ادارے وجود میں آئے اور کام کرتے رہے۔ یوں دروسِ قرآن کے حلقہ جات کی سرپرستی اور نگرانی کا کام ان حضرات مشائخ نے بڑی خوبی سے سرانجام دیا۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے تربیت یافتہ حضرات نے ملک کے مختلف علاقوں میں درس قرآن کے

حلقہ جات قائم کیے۔ سندھ، پنجاب اور یوپی وغیرہ کے مختلف علاقوں میں مساجد کے ائمہ کے ذریعے اس بات کو یقینی بنانے کی جدوجہد اور کوشش کی کہ وہ فجر یا عشا کی نماز کے بعد درس قرآن ضرور دیا کریں۔

اسی سلسلے میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا حلقۂ درسِ قرآن شیرانوالہ گیٹ لاہور میں قائم ہوا، جو شہرت کے بامِ عروج پر پہنچا۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اس سے استفادہ کیا۔ اسی طرح حضرت مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ کا حلقۂ درسِ قرآن دہلی میں بھی کام کرتا رہا۔ پھر خواجہ صاحبؒ کی سربراہی میں علما کے ایک بورڈ نے پورے قرآن حکیم کا ترجمہ اور مختصر تفسیر مرتب کی، جو آسٹریلیا بلڈنگ لاہور سے پندرہ روزہ ''درسِ قرآن'' کے عنوان سے طبع ہوتی رہی۔ اسی طریقۂ کار پر ان حضرات کے تربیت یافتہ دیگر حضرات نے بھی حلقہ ہائے درس قرآن قائم کیے، جن سے ایک مخلوق سیراب ہوئی۔

درسِ قرآن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے عمومی ذہن کو اپنے بنیادی دینی فکر سے متعارف کرایا جائے اور عام لوگوں میں قرآن سے تعلق اور محبت پیدا کردی جائے۔ نیز اپنے معاشرے کے اجتماعی اور انفرادی مسائل کو زیر بحث لاکر قرآن کریم کی روشنی میں انھیں حل کرنے کا شوق پیدا ہو۔ پھر قرآن کریم جس طرح قومی آزادی کا جذبہ اور شعور پیدا کرتا ہے، وہ بھی اپنی جگہ انتہائی اہم ہے۔ غلامی کے دور میں قوم کی صحیح لائحۂ عمل کی جانب رہنمائی کرنا اور آزادی اور حریت کے جذبے کو فروغ دینا بڑا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس حوالے سے یہ حلقہ ہائے درسِ قرآن کی ساری تحریک بڑے مفید نتائج کی حامل رہی ہے۔

حلقہ ہائے درس قرآن کے ذریعے قرآنی علوم کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کے لیے ضروری تھا کہ عام لوگوں میں استعمال ہونے والی اُردو زبان جس نئے اسلوب اور نہج پر ڈھل چکی ہے، قرآن کریم کا ترجمہ اسی اسلوب میں کیا جائے۔ لیکن یہ کام اس طرح ہو کہ قرآن کریم کے معجزانہ الفاظ اور معانی کی جامعیت اور صحت میں کوئی فرق نہ پڑے۔ ایسا جامع ترجمہ ہو جو لفظی اور معنوی اغلاط سے قطعاً پاک ہو، تاکہ قرآن پاک کے حقیقی مقاصد، مفاہیم اور تقاضے زیادہ واضح اور صحیح شکل میں سامنے آئیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ بعض نادان مترجمین نے ترجمہ کرتے ہوئے بہت سی غلطیاں اور کوتاہیاں کی تھیں۔

اس تناظر میں ہندوستان میں ایک ایسے ترجمۂ قرآن حکیم کی ضرورت پیدا ہوئی، جو اپنی جامعیت اور بہترین اسلوب کے اعتبار سے قرآن حکیم کے کلی مفاہیم کی جامع تفہیم کرسکے۔ اس موقع پر حضرتِ اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ کے سامنے اصرار سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ قرآن پاک کا ایک ایسا بہترین ترجمہ لکھیں، جو قرآنِ حکیم کی آیات کے جامع مفہوم کو بیان کرتا ہو۔ حضرت اقدس رائے پوریؒ کے اصرار پر حضرت شیخ الہندؒ نے اُردو زبان میں قرآن پاک کا ایسا جامع ترجمہ کرنے کا ارادہ فرمایا، لیکن اس شرط پر کہ ترجمے پر حضرتِ اقدس رائے پوری قدس سرہٗ نظر ثانی فرمائیں۔ حضرت اقدس رائے پوریؒ نے اسے منظور فرمالیا۔ اس طرح اس ترجمے کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا سیّد اصغر حسینؒ ''حیات شیخ الہند'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''بعض اہلِ علم کی استدعا اور بہت سی مصالح اور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کی نہایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا شیخ الہندؒ کو ترجمۂ قرآن کرنے کا خیال ہوا۔''(1)

چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت عالی رائے پوریؒ کے اصرار پر ترجمہ قرآن حکیم کا کام شروع کیا اور ساتھ ہی جتنا ترجمہ

کر لیتے، اسے حضرت عالی رائے پوریؒ کو سنانا شروع کر دیا۔ ترجمۂ قرآنِ حکیم کی جامعیت بیان کرتے ہوئے امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ ان دونوں حضرات کی ایک ایسی ہی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں:

''...حضرت شیخ الہندؒ کا (اُردو) ترجمۂ (قرآن حکیم) پڑھنے سے جو مطلب سمجھ میں آتا ہے، وہ فارسی (ترجمے) میں بھی (سمجھ) نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس میں حکمت کے جو کلمے ہیں، وہ ٹھیک ٹھیک ترجمہ کر دیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ حکمت کو حکیم کا دماغ ہی سمجھ سکتا ہے۔

ہمیں اس ترجمے کے چند اَوراق حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند میں سنائے۔ اصل میں تو آپؒ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو یہ ترجمہ سنا رہے تھے، اس طرح ہمیں بھی سننے کا شرف حاصل ہو گیا۔''(2)

اس حوالے سے محدثِ کبیر حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''ہمیں حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی عظمتِ شان کا صحیح طور پر اُس وقت اندازہ ہوا، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ ترجمۂ قرآن تحریر کر کے رائے پور لے جایا کرتے تھے۔ اس وقت ہم متنبہ ہوئے کہ حضرت رائے پوریؒ کا کتنا اونچا مقام ہے، جو ان کی تواضع اور انکساری کی وَجہ سے اب تک ہم سے پوشیدہ تھا۔''(3)

ترجمۂ قرآن حکیم کے آغاز کا پسِ منظر اور مقاصد

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور دیگر حضرات کی مشاورت سے ۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ / 12/ اکتوبر 1909ء کو ''جمعیت الانصار'' دیوبند میں قائم ہوئی۔ اس کے قیام کا پسِ منظر اور مقاصد بیان کرتے ہوئے ''جمعیت الانصار'' کے ناظمِ اعلیٰ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ علم سے محروم مصنّفین کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

''تصنیف و تالیف کا صیغہ بھی ایسا عام ہو گیا کہ مصنف بننے کے واسطے ذی علم ہونا بھی شرط نہیں رہا۔ جو شخص اُردو میں کچھ لکھنے پڑھنے پر قادر ہے، اس کو مصنف بن جانے سے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ آج اگر ہندوستان کی بے شمار تصانیف پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ان میں کا بیش تر حصہ ایسا دیکھا جاتا ہے، جن کے مصنف ہرگز ذی علم نہیں۔ مسلمان بے چارے کیا کریں، ان کے ہاتھ میں اُردو کی کتابیں پہنچتی ہیں، ان کو یہ تمیز کرنا دُشوار ہے کہ قابلِ اعتماد کون سی ہے اور ناقابلِ اعتماد کون سی؟!

پھر لطف یہ ہے کہ تصانیف بھی معمولی مسائل میں نہیں ہیں، بلکہ عقائد و کلام اور اصولِ دین کے غامض (مشکل) اور دقیق (نازک) مسئلوں کے متعلق ہوتی ہیں۔ اس بارے میں یہاں تک جرأت بڑھ گئی کہ جو شخص اخباری مذاق اور طرز کی عبارت لکھنے پر قادر ہو گیا، چند یورپین اور جدید مصنّفین کے معمولی رسالے یا اَقوال اس کی نظر سے گزر گئے، وہ اپنے آپ کو ایسا محقق سمجھنے لگتا ہے کہ تمام متکلمین و مفسرین پر بے دھڑک ردّ کرنے اور طعن کرنے سے اس کو کوئی چیز نہیں روکتی۔

تماشا ہے کہ کسی فن میں تصنیف کرنے کے واسطے اس فن کی واقفیت شرط ہوتی ہے، لیکن خاص مذہبی معاملات میں یہ شرط کسی درجے میں بھی ملحوظ رکھنے کے قابل نہیں ہے؟ حدیث کا ایک لفظ نہ پڑھا ہو، محدثین کی اصطلاحات

سے واقفیت نہ ہو، تفسیریں نہ دیکھی ہوں، مفسرین کے اقوال و مآخذ پر نظر نہ ہو، مگر کسی حدیث کو ردّ اور قبول کرنے کے لیے اپنا ذہنی معیار کافی سمجھا جاتا ہے۔ مفسرین کے تمام اقوال کا یک لخت بُرے پیرائے میں ردّ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اُن کی رائے کے خلاف ہے!؟

مسلمانوں کی آسمانی کتاب (قرآن مجید) جس پر مذہب کا مدار ہے، اس کو طبع اور تصحیح کر کے شائع کرنے کے واسطے مسلم و غیر مسلم کی قید بھی نہ رہی! ترجموں کا تو یہ حال ہوگیا کہ جس نے چاہا، چند ترجمے سامنے رکھے اور ایک نیا ترجمہ بنادیا۔ اس میں جدّت پیدا کرنے کے لیے محاورے کی پابندی اس درجے (اختیار) کی کہ اصل مرادِ خداوندِ عالَم کو بھی بدل ڈالا۔ اس سے بھی آگے ترقی کر کے علمی دنیا میں وقعت پیدا کرنی چاہی تو تمام محدثین وفقہا کے خلاف اپنی رائے سے کچھ باتیں اضافہ کردیں''۔ (4)

''جمعیت الانصار'' کے قیام کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا یہ تجزیہ دراصل حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے افکار کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس تجزیے کی اَساس پر حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ / 12/ اکتوبر 1909ء میں ''جمعیت الانصار'' قائم کی اور اس سے چھ سات مہینے قبل ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ / اپریل 1909ء میں ترجمۂ قرآن حکیم تحریر فرمانا شروع کیا۔ آپؒ نے دیوبند کے قیام کے زمانے میں تقریباً تین سال کی مدت میں ۲۵/ جمادیٰ الثانی ۱۳۳۰ھ / 11/ جون 1912ء کو ''سورت توبہ'' تک قرآن حکیم کے دس پاروں کا ترجمہ فرمایا۔ جیسا کہ خود حضرت شیخ الہندؒ نے ''سورت توبہ'' کے ترجمے کے اختتام پر یہ تاریخ تحریر فرمائی ہے۔

پھر دیگر علمی، فکری اور عملی مصروفیات کے سبب ترجمے کا کام رُکا رہا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہندؒ ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے سلسلے میں ۷/ ذوقعدہ ۱۳۳۳ھ / 16/ ستمبر 1915ء کو حجازِ مقدس روانہ ہوئے اور وہاں سے گرفتار ہوکر مالٹا میں قید کردیے گئے۔ دیوبند سے روانہ ہوتے وقت حضرت شیخ الہندؒ ترجمۂ قرآن حکیم سے متعلق تمام کاغذات اور تفسیریں ساتھ لے کر گئے تھے۔ اس لیے حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے قرآنِ حکیم کے ترجمے کا کام مالٹا میں قید کے دوران بھی جاری رکھا اور شوال ۱۳۳۵ھ / جولائی، اگست 1917ء سے باقاعدہ مالٹا میں ترجمے کا آغاز فرمادیا۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے قرآن حکیم کا ترجمہ ''سورت الاحزاب'' تک کیا تھا تو حضرت عالی رائے پوریؒ کے نام اپنے ایک خط میں ترجمہ قرآن سے متعلق اطلاع دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت (عالی رائے پوری) اور جملہ مکرمین کی دعائے بہبودیٔ دارین (دونوں جہانوں کی کامیابی کی دعا) کا محتاج ہوں۔ دیگر ہیچ۔ احقر اپنے انھی قدیمی مشاغل میں یہاں بھی مصروف ہے۔ آج کل دو سبق پڑھا لیتا ہوں اور کچھ ترجمہ (قرآن حکیم) کرلیتا ہوں۔ سورہ احزاب تک پہنچ گیا ہوں''(5)۔

جب حضرت شیخ الہندؒ نے ۲/ شوال ۱۳۳۶ھ / 11/ جولائی 1918ء میں اسارتِ مالٹا کے دوران ترجمۂ قرآن حکیم مکمل کیا تو اُن کی خواہش رہی کہ حضرت اقدس رائے پوریؒ اس پر نظرِ ثانی فرمالیں۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ ''مقدمہ ترجمۂ قرآن حکیم'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب ایک ثُلُث قرآن (ابتدائی دس پاروں) کا ترجمہ کر چکا تو بوجہ عوارض ایسا طول طویل حرج پیش آیا (یعنی

www.rahnuma.org

مالٹا کی قید) کہ ترجمے کی تکمیل کی توقع بھی دشوار ہوگئی، مگر بہ توفیقِ الٰہی عین ایامِ حرج میں اتنا اطمینان نصیب ہوگیا کہ ترجمۂ موصوف بہ اطمینان ۱۳۳۶ھ (1918ء) میں پورا کرلیا۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہے تو انھی احبابِ مکرمین (جنھوں نے ترجمہ کرنے کا کہا تھا، جیسا کہ حضرت اقدس رائے پوریؒ) کی خدمت میں پیش کرکے تفصیلی نظر کی درخواست کریں گے۔ اگر ہماری یہ پیوند کاری ان حضرات کے نزدیک مفید و مناسب سمجھی گئی تو ان شاء اللہ شائع بھی ہوجائے گا، ورنہ مجبوراً جہاں ہے وہیں رہے گا۔ ع [6]

گو نالہ نا رسا ہو ، نہ ہو آہ میں اثر
میں نے تو درگزر نہ کی ، جو مجھ سے ہو سکا'' [7]

اسی لیے حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن حکیم کی تکمیل کی اطلاع ایک خط کے ذریعے سے مالٹا سے ہندوستان بھیجی اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو یہ مژدۂ جاں فزا سنانے کا تحریر فرمایا۔ اس حوالے سے حضرت مولانا سیّد اصغر حسین لکھتے ہیں:

''مالٹا کی یکسوئی اور گوشہ نشینی میں خدا تعالیٰ کے فضل سے قرآن حکیم کا ترجمہ دو ہی سال میں مکمل ہوگیا۔ اور حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) نے کمال مسرت سے یہ مژدہ ہندوستان کو ۱۹/ شوال ۱۳۳۶ھ (28/ جولائی 1918ء) کے خط میں تحریر فرمایا کہ:

''رمضان المبارک کے دو روز بعد ترجمہ قرآن شریف کا — الحمد للہ کہ — پورا ہوا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب (رائے پوری) کی خدمت میں اطلاع کردینا۔''

مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ کو تعلیم قرآن کا دلی شغف اور خاص اہتمام تھا۔ اور اس ترجمے کے نہایت مشتاق اور آرزومند تھے۔ افسوس کہ حضرت ممدوح کی حیات میں یہ ترجمہ ہندوستان نہیں پہنچ سکا''[8]۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی ترجمۂ قرآن حکیم پر حضرت رائے پوریؒ کی نظرِ ثانی کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے قیامِ مالٹا کے دوران ہی حضرت عالی رائے پوریؒ کا ۲۶/ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ/ 29/ جنوری 1919ء میں انتقال ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کو اس کا بڑا قلق ہوا، جو حضرت رائے پوریؒ کی وفات پر حضرت شیخ الہندؒ کے مرثیے ''مسدسِ مالٹا'' سے ظاہر ہوتا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں ؎

بارِ احباب کون اٹھائے گا
آنکھوں پر کون انھیں بٹھائے گا
ہاتھ کون ان کا اب بٹائے گا
فتنوں کو کون اب ہٹائے گا
زینت و زیب الف ثانی مُرد
شاہ عبدالرحیم ثانی مُرد [9]

حضرت عالی شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کے تقریباً ایک تہائی حصے یعنی دس پاروں پر نظرِ

ثانی فرمائی ہے اور بقیہ پاروں کے ترجمے کے کام پر آپؒ کی قلبی اور روحانی توجہات رہیں۔ الغرض! ترجمہ شیخ الہندؒ حضرت اقدس رائے پوری قدس سرہٗ کی تحریک پر شروع ہوا۔ آج یہ ترجمہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے اور عرب و عجم میں مشہور ہے۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ / 8/ جون 1920ء کو مالٹا سے رہا ہو کر بمبئی پہنچے۔ آپؒ کے ساتھ ترجمۂ قرآن حکیم کے مسودات بھی بہ حفاظت ہندوستان پہنچ گئے۔ پھر ترجمۂ قرآن حکیم پر حضرت شیخ الہندؒ کے ''مقدمۂ ترجمۂ قرآن حکیم'' کی پہلی اشاعت ۱۳۳۹ھ / 1920ء میں ہوئی۔ حضرت شیخ الہندؒ کا اصل مقدمہ اور اُس سے متعلق تفصیلات ہم ''شعور و آگہی'' کے گزشتہ شمارے (جلد نمبر 11، شمارہ نمبر 4، اکتوبر تا دسمبر 2019ء) میں تحریر کر چکے ہیں۔

۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ / 28/ جون 1923ء کو حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کی اشاعت کے حقوق باضابطہ طور پر مولانا محمد مجید حسن مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور نے حاصل کیے اور رجب ۱۳۴۴ھ / فروری 1926ء میں اسے پہلی بار شائع کیا تھا۔ مولانا مجید حسنؒ نے اس کے حقوق حاصل کر کے ترجمۂ شیخ الہندؒ سے متعلق اپنے اَخبار ''مدینہ'' بجنور کے 13/ اگست 1923ء (۳۰/ ذوالحجہ ۱۳۴۱ھ) کے ایک بڑا اور خاصا مفصل اشتہار ضمیمے کے طور پر علاحدہ شائع کیا تھا۔ یہ اشتہار دو بڑے صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ایک جانب ترجمۂ شیخ الہندؒ کی پہلی طباعت کے صفحہ 65 کا عکس ہے۔ دوسرے صفحے پر ''مژدۂ عظیم و بشارتِ عمیم'' کے عنوان سے مفصل تحریر ہے۔ اس پورے اشتہار کی عبارت درجِ ذیل ہے:

بندگانِ اسلام و غلامانِ محمدیؐ کے لیے

مژدۂ عظیم و بشارتِ عمیم

رنگ ہا در طبع اربابِ ''صفا'' آمیختہ
نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ
آں چناں شمعے براہِ ''کج'' رواں افروختہ
ایں چنیں گنجے ، بہ جیبِ ''مفلساں'' انداختہ (10)

(بہت سے رنگ ہیں ، جو صاف دل والوں کی طبیعت میں ملے ہوئے ہیں
بہت سے نکتے ہیں ، جو اہلِ بیان کے خیالات میں ڈالے گئے ہیں
وہ شمع جو گمراہوں کے لیے جلائی گئی ہے
یہ ایسا خزانہ ہے کہ جو فقیروں کی جیب میں ڈالا گیا ہے)

یعنی

شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، رأس المحدّثین، زُبدۃ المفسّرین، حضرت شیخ الهند
مولانا وسیّدنا محمود حسن نوّر اللّٰہ مرقدہٗ کا مقدّس و مطهّر

www.rahimia.org

اُردو ترجمۂ قرآن مجید، موسومہ بہ ''موضحِ فرقان''

جس کے دس پاروں کا ترجمہ، مولانا مرحوم وطن شریف (دیوبند) میں فرما چکے تھے، اس کے بعد حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور اس اہم مقصد کی تکمیل کے لیے مولانا کئی صندوق کتابوں کے بھی اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ چناں چہ باقی بیس پاروں کا ترجمہ، حضرتؒ نے بہ حالتِ اسیری جزیرۂ مالٹا میں مکمل فرمایا۔ ان آخری بیس پاروں کی عربی (تحریر)، مولانا حسین احمد صاحب مدنی [11] (کے قلم کی یادگار ہے) اور (اُردو) ترجمہ حضرت (شیخ الہندؒ) کے مبارک قلم کا لکھا ہوا ہے۔ اس مقدس خدمت کے اندر حضرت مولانا حسین احمد صاحب، مولانا محمد مبین صاحب اور مولانا عزیز گل صاحب کے مبارک ہاتھ بھی شامل ہیں۔

عنقریب نہایت آب و تاب، صحتِ کاملہ و کتابتِ نادرہ

کے ساتھ دفتر اخبار ''مدینہ''، بجنور، یوپی سے شائع ہونے والا ہے۔ اس مقدس ترجمے کی بنیاد جس حسن انتظامی و خوبیٔ اہتمام، جاں فشانیٔ پیہم و عرق ریزیٔ مسلسل سے، حضرت مولانا (شیخ الہند) ممدوح نے فرمائی ہے، وہ ہندوستان بھر میں ایسے عظیم الشان مقصد کی، تکمیل حسنہ کی، بے نظیر مثال ہے۔

قرآن کریم کے تمام موجودہ معتبر و غیر معتبر اُردو فارسی ترجمے، معہ تفاسیر مختلفہ متداولہ و غیر متداولہ کو پیش نظر رکھ کر عالی استعداد اور ذی علم طلبا کو شریکِ کار بنانا، عربی دواوین و کتبِ ادبیات کی اِمداد و اِعانت لے کر، اُردو کی سلاست و بامحاورگی کو اُردو لغات سے مستند کیا۔ علمائے متبحر اس بحث میں شریک ہوتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر قدس سرہٗ کے اُردو ترجمے پر مبسوط بحث فرما کر، اپنا قولِ فیصل دیتے اور پھر ترجمہ ثبت فرماتے۔ صحیح معنی میں یہ ''موضحِ فرقان''، حضرت شاہ صاحبؒ کے ترجمے کی ترمیم ہے، جو حُسن بربالائے حُسن کا مصداق ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کا ترجمہ اور پھر مولانا (شیخ الہندؒ) کی ترمیم، سبحان اللہ!

آج یہ بندۂ ناچیز، عبد خاطی، خادمِ قوم وملت، فقیر مجید حسن، مالک اخبار مدینہ، جمیع برادرانِ اسلام کی خدمت میں، اس نعمتِ عظمیٰ و دولتِ کبریٰ کا اصلی نمونہ رنگین، پیش کرنے کی سعادت وعزت حاصل کرتا ہے۔ نمونہ جملہ کیفیات، مثلاً تقطیع و کاغذ، کتابت وطباعت کی ایک تشریح ہے۔ رنگ پختہ اور چھاپہ کا ہے نہ کہ دستی، جیسا کہ عموماً قاعدہ ہے۔ گویا کل ''موضحِ فرقان'' دومرتبہ چھپے گا۔ ایک مرتبہ رنگین روشنائی سے اور دوسری مرتبہ سیاہ روشنائی سے۔ اس ترجمے کے تمام حقوقِ تالیف واشاعت، حضرت نور اللہ مرقدہٗ کی صاحبزادیوں اور برادرانِ محترم نے، حسبِ قانون مروّجہ باضابطہ بیع ہونے کے بعد، میرے نام محفوظ فرما دیے ہیں۔

نمونہ خدمت میں ارسال ہے

ہدیہ مجلد: پندرہ روپیے۔ جو کرم فرما پیشگی قیمت ادا فرمائیں گے، ان سے دس روپیے ہدیہ لیا جائے گا۔ یہ سہولت ان برادرانِ اسلام کے لیے رکھی گئی ہے، جن کے شوقِ بے پایاں نے، ابھی سے طلبِ صادق کا اظہار شروع کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ اربابِ ذوق، فوراً ہدیہ پیشگی روانہ فرما کر، اپنا اسمِ گرامی درج رجسٹر فرمائیں گے۔

المشتہر: خاکسار مجید حسن، مالک اخبار ''مدینہ''، بجنور (یوپی)

یہ اشتہار اور پہلے پارے کا نمونہ حضرات علمائے کرام کی خدمت میں بھیجا گیا۔ اس پر انھوں نے تقریظات، آرائے گرامی

اور قطعاتِ تاریخی تحریر فرمائے تھے، جنھیں پہلی اشاعت کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کی پہلی اشاعت کے وقت سورت البقرہ اور سورت النساء کے حاشیے پر حضرت شیخ الہندؒ کے لکھے ہوئے فوائدِ تفسیر یہ شاملِ اشاعت کیے گئے تھے۔ ان کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ نے ''مقدمہ'' میں تحریر فرمایا ہے:

''فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ: ''موضح قرآن'' کے جملہ فوائد کو لینے کا التزام کیا ہے، اِلّا ماشاء اللّٰہ کہ کسی وجہ سے کسی فائدے کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی۔ اور فوائد میں چوں کہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے، ترجمے کی طرح قید اور تنگی نہیں تو اس لیے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے اور تقدیم و تاخیر، اجمال و تفصیل وغیرہ کی پرواہ نہیں کی۔ اور بہت سے فوائد بالاستقلال (مستقل طور پر) جو مفید نظر آئے، مختلف معتبر موقعوں سے لے کر بڑھا دیے۔ اور حضرت ممدوح رحمہ اللہ کی تقلید کے باعث اگرچہ ترجمے میں کہیں قدرے تنگی رہ گئی تو اُس کے بدلے میں مکافات (بدلے) سے بھی زائد فوائد میں اُس کی توضیح کردی ہے ع

ہر سخن وقتے ، و ہر نکتہ مکانے دارد

(ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور ہر نکتے کے بیان کی ایک جگہ ہوتی ہے)''

اس لیے جن سورتوں پر حضرت شیخ الہندؒ کے فوائد دستیاب نہ ہوسکے تو ناشرِ ترجمۂ شیخ الہندؒ نے باقی سورتوں پر حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے فوائدِ ''موضح القرآن'' حواشی پر کتابت کرائے تھے۔

مولانا مجید حسنؒ کا عزم اور ارادہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے طرز پر پورے قرآن حکیم پر فوائدِ تفسیر یہ لکھوائیں اور آئندہ کسی اشاعت میں اُسے شائع کیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلے حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا گیا۔ اس لیے کہ وہ مالٹا میں ترجمۂ قرآن حکیم کے لکھنے میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ شریکِ کار تھے، لیکن حضرت مدنیؒ کے مسلسل سفروں میں رہنے، سیاسی اور علمی مصروفیات میں رہنے کی وجہ سے بہ مشکل ایک پارے کے حواشی اور اِفادات قلم بند ہوسکے۔ اس کے بعد یہ کام حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سپرد ہوا اور انھوں نے بڑی جامعیت کے ساتھ مختصر مدت میں ان حواشی کو مکمل کیا۔ اس کا تکملہ لکھتے ہوئے مولانا عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اس ربّ کریم کا شکر کس زبان سے ادا کروں، جس کی خالص توفیق و تیسیر سے آج یہ مہتمّ بالشان کام انجام کو پہنچا۔ الٰہی! آج عرفہ کے مبارک دن اور وقوف بہ عرفات کے وقت میں تیرے کلامِ پاک کی ایک مختصر سی خدمت جو محض تیرے فضل و اعانت سے اختتام پذیر ہوئی، تیری بارگاہِ قدس میں بہ صد عجز و نیاز پیش کرتا ہوں۔ تُو اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرما اور مقبول بنا۔ الٰہی! میں معترف ہوں کہ اس خدمت کی انجام دہی میں حقِ اخلاص ادا نہیں ہوسکا، لیکن تیری رحمت و رأفت جب سیئات کو حسنات سے بدل ڈالتی ہے، اس کے لیے ایک صورتِ حسنہ کو حقیقتِ حسنہ بنا دینا کیا بڑی بات ہے۔ میرا گمان تیرے ساتھ یہی ہے کہ تُو اپنی نکتہ نوازی سے اس ناچیز عمل کو زندۂ جاوید بنائے گا اور اس کے نیک ثمرات سے دارین میں مجھ کو متمتع فرمائے گا۔

اے اللہ! تُو اپنے قرآن پاک کی برکت سے میری، میرے والدین کی، میرے شیوخ و اساتذہ کی، میرے

اقارب واحباب کی اور اُن کی جو اِس کارِ خیر کے محرک و داعی بنے، یا جنھوں نے اس عظیم الشان کام میں رفاقت و اعانت کی، سب کی مغفرت فرمایئے اور سب کو دنیا و آخرت کی بلاؤں سے مامون ومصئون رکھیے اور حضرت مترجم (شیخ الہند) قدس سرہٗ کے ساتھ جنت الفردوس میں جمع کیجیے۔

و نعم ما قیل (حکیم سنائی غزنویؒ کے شعر میں تصرف کے ساتھ) ؎

اوّل و آخر قرآن ز چہ ''با'' آمد و ''سین''
یعنی اندر ''دو جہاں'' رہبرِ ما قرآن بس [12]

(قرآن کے اوّل میں ''ب'' اور آخر میں ''سین'' کیوں آیا ہے؟
اس لیے کہ دونوں جہانوں میں ہمارا رہبر قرآن حکیم ہے)

۹/ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ (16/اپریل 1932ء)، دیوبند

العبد الفقیر، فضل اللہ المدعو بہ شبیر احمد ابن مولانا فضل الرحمٰن العثمانی'' [13]

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ''فوائدِ تفسیریہ'' کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کا پہلا ایڈیشن فوائد کے لکھنے کے تقریباً پانچ سال بعد جمادیٰ الاولیٰ ۱۳۵۵ھ / اگست 1936ء میں شائع ہوا تھا۔

ہمارے سامنے اس وقت حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن پاک کی پہلی طباعت ۱۳۴۴ھ / 1926ء ہے۔ اس اشاعت کے ٹائٹل پیج پر یہ عبارت درج ہے: ''الحمد لِلّٰہ علٰی احسانہٖ کہ اُس فضل وکرم سے **قرآن مجید مترجم**، ترجمۂ مکمل، شیخ المشائخ، قطب الاقطاب، رأس المحدّثین، زُبدۃ المفسّرین، حضرت شیخ الہند، مولانا وسیّدنا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ۔ مع فوائد (مُوضحُ الفُرقان) سورت البقرہ وسورت النساء۔ محمد مجید حسن نے مدینہ پریس بجنور میں طبع کیا''۔ ٹائٹل کے بیک صفحے پر ''نوائے حمد'' ہے۔ پہلے اور دوسرے صفحے پر ''گزارشِ طابع و ناشر'' ہے۔ تیسرے اور چوتھے صفحے پر ''ترجمۂ قرآن مجید پر علمائے ہند کی رائیں'' ہیں۔ پانچ سے بارہ صفحات پر ''مقدمہ'' ہے۔ تیرہ اور چودہ صفحے پر ''مختصر فہرست مضامینِ قرآن مجید بہ طرزِ جدید'' کے عنوان سے مضامینِ قرآن کا صفحات اور سطروں کے اعتبار سے مختصر اشاریہ دیا گیا ہے۔ اس اشاعت کے آخر میں ''تقریظ از قلم سعادت رقم فخر العلماء ومقتدانا حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہٗ العالی جانشین حضرت شیخ الہندؒ'' کے عنوان سے دو صفحات پر مشتمل حضرت مدنی کی تحریر ہے۔ پھر مولانا بدرالحسن جلالیؒ کی ''تقریظ'' اور ''قطعاتِ تاریخ طبع'' درج ہے۔ آخری صفحے پر یہ تحریر درج ہے: ''جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ شیخ المشائخ، امام المحدّثین، زُبدۃُ المفسّرین، حضرت شیخ الہند، مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مکمل ترجمہ قرآن مجید مع فوائد سورت البقرہ وسورت النساء حسبِ قانون رجسٹری کرالیا گیا ہے۔ کوئی صاحب اس کے کل یا جزو کے طبع و شائع کرنے کی جرأت نہ کریں، ورنہ نقصان اٹھائیں گے۔ طابع و ناشر محمد مجید حسن، مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور (یو۔پی، انڈیا) ۱۳۴۴ھ''۔

اس اشاعت کو سامنے رکھتے ہوئے مقالے کی ترتیب ہم نے کچھ اس طرح قائم کی ہے: سب سے پہلے طابع، ناشر اور مالک مدینہ پریس بجنور مولانا محمد مجید حسنؒ کی ''نوائے حمد'' اور پھر ''گزارش طابع و ناشر'' پر مشتمل تحریر شامل کی گئی ہے، جن سے اس ترجمے کی طباعت سے متعلق اہم تاریخی اُمور پر روشنی پڑتی ہے۔ اس ترجمے کی طباعت کے لیے انھوں نے جو کدوکاوشیں کی ہیں، اس کا

اندازہ ہوتا ہے۔ **فجزاهُما اللّٰه خيرَ الجزاء۔**

ترجمۂ قرآن حکیم پر حضرات علمائے کرام کی آرائے گرامی، تحریرات اور تقریظات کے مشکل الفاظ کی بریکٹ میں وضاحت، عناوین اور حوالہ جات کی تخریجات ہم نے کی ہیں۔ ان شخصیات وحضرات کے حالات اور مختصر سوانحات حواشی میں درج کردیے گئے ہیں۔ بعض شخصیات کے بارے میں معلومات حضرت مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی کی تحریر کردہ ہیں، جوانھوں نے اپنی کتاب ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا اصل مقدمۂ ترجمۂ قرآن مجید'' میں لکھی ہیں۔ ان کے شکریے کے ساتھ آخر میں ''حاشیۂ نور'' لکھ دیا گیا ہے۔ بعض شخصیات کے حالات اور اشعار کے حوالہ جات کے لیے جناب انجینئر وسیم اعجاز (کراچی) نے بہت تعاون کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ یہ مقالہ یقیناً ''شعور وآگہی'' کے قارئین کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کی تاریخی اہمیت واضح کرتا ہے۔ مدیرِ اعلیٰ

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم کی اشاعت کا تاریخی پسِ منظر

تحریر: مولانا مجید حسن مالک مدینہ پریس بجنور (اوّلین طابع وناشر)

(ترجمۂ شیخ الہندؒ کی اس پہلی اشاعت کے تیسرے صفحے پر پہلے مولانا مجید حسن کے قلم سے ''نوائے حمد'' تحریر ہے۔ اس کے بعد اُن کی طرف سے ایک ''گزارش طابع وناشر'' طبع شدہ ہے۔ مرتب)

نوائے حمد

پاک ہے وہ ذاتِ حیّ و قیّوم جس کی **عمیم الاحسانی** (بہت زیادہ احسان) نے ایک بندۂ خاطی وعاصی کو نوازا اور اپنے فیوضِ بے پایاں وانعاماتِ بے کراں سے بہرہ اندوز فرمایا۔ یہ گدائے تہی دامن اپنے ربّ قدوس کی بارگاہِ اعلیٰ میں ہزار در ہزار ارمغانِ تشکر ومنت (شکریے اور احسان کا تحفہ) پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے، جس نے محض اپنی توفیق نامتناہی (بے انتہا توفیق) سے ایسے کارِ عظیم کو حسنِ انجام عطا فرمائے۔ ؎

یارائے زبان کو کہ ثنائے تُو کنم
توصیف کمالِ کبریائی تُو کنم
چیزے بہ بساط ما تہی دستاں نیست
جانے کہ تو دادۂ فدائے تو کنم (14)

(زبان کو یہ موقع ملا ہے کہ میں تیری ثنا کروں
میں تیری کمالِ کبریائی کی توصیف کروں

ایک چیز جو میری بساط سے تہی دامن نہیں ہے
ایک جان ہے جو تیری دی ہوئی ہے ، تجھ پر فدا کروں)

شعبان المعظم ۱۳۴۴ ہجری (فروری 1926ء)۔ محمد مجید حسن غفرلہٗ

گزارش طابع و ناشر

اِمامنا و مخدومنا حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے عصرِ حاضرہ کا یہ عظیم الشان کارنامہ علما و فضلائے ہم عصر کے مسلسل تقاضوں پر شروع فرمایا تھا۔ اس کی تفصیل خود اس وجودِ مقدس کی زبان میں، آپؒ کے مقدمہ ترجمہ قرآن میں ملے گی۔ یہاں مجھے چند دوسرے اُمورِ متعلقہ کا تذکرہ مطلوب ہے۔

(ترجمہ قرآن حکیم کا آغاز)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ (اپریل 1909ء) میں ترجمہ قرآن مجید کی ابتدا فرمائی تھی۔ اس وقت آپ دارالعلوم دیوبند میں اِقامت فرما تھے اور درسِ حدیث و شغلِ رُشد و ہدایت سے اس قدر فرصت نہ ہوتی تھی کہ یہ مقدس فرض جلد پایۂ تکمیل کو پہنچتا۔ چناں چہ کامل سوا تین سال کے عرصے میں محض دس پاروں کا ترجمہ ۲۵/ جمادیٰ الثانی ۱۳۳۰ھ (11/جون 1912ء) کو سورۂ توبہ تک ختم ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ قرآن مجید کی خدمت کے لیے، اس مجددِ عصر کو ان تمام منازلِ سعادت سے گزرنا تھا، جو پہلے ائمہ کرام اور مجددینِ عظام کو پیش آچکی ہیں۔ درس و تدریس اور ارشاد و ہدایت کی راہیں دیوبند میں قطع ہوئیں۔ اب چند منازلِ سعیدہ اَور باقی تھیں۔ چند سال تک بعض اوقات نے اجازت نہ دی کہ مزید ترجمہ کریں۔

(حضرت شیخ الہندؒ کی ہجرتِ حرمین شریفین)

اس کے بعد مشائے خداوندی نے امام المحدّثین — رحمة الله عليه — کو منزلِ اوّلین کا رَہ نَورد بنایا، جو اس دنیا میں ہر جلیل القدر مصلح اور امام کو پیش آئی ہے، یعنی هجرت إلى الله (اللہ کے لیے ہجرت)! بعض خاص روحانی، سیاسی اور مذہبی ضروریات کے باعث آپؒ نے ہندوستان سے ہجرت کی تیاری کی اور ۷/ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ (16/ستمبر 1915ء) کو عزمِ بیت اللہ فرمایا۔ حرمین کی سرزمین نے جو مہبطِ انوارِ الٰہی ہونے کے باعث، ہر مقربِ بارگاہ اور سالکِ طریقت کے استقبال کے لیے بے تاب رہتی ہے، کہا ع

آمد آں یارے کہ مے خواستیم
(ایسے یار کی آمد ہوئی ہے ، جسے ہم چاہتے ہیں)

(حضرت شیخ الہندؒ کی حجازِ مقدس سے گرفتاری اور مالٹا کی نظر بندی)

اس وقت خود حجازِ مقدس کا چپہ چپہ ظلم و جور کی قہرمانہ طاقتوں سے ’’الاماں الاماں‘‘ پکار رہا تھا۔ حریتِ خیال اور آزادیٔ اعمال موقوف اور حکومت کی خواہشات و عزائم کے خلاف پیرویٔ اسلام جرم تھی۔ ترکوں کی تکفیر کے فتوے تیار ہو رہے تھے اور ہندوستان

کے سات کروڑ مسلمانانِ مجبور کی عقیدت و محبت کا مرکز، مفکرین کے اِلحاد و طاغوتیت کا گہوارہ بنا ہوا تھا، لیکن اس شیر بیشۂ اِسلام اور بطلِ عسا کرِ ملت نے ان کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور مالٹا کی نظر بندی اور قید کو ترجیح دے دی۔ شریفِ (مکہ) حسین کی بدگمانیاں اور حکومتِ برطانیہ کی بدظنیاں تو محض بہانہ تھیں۔ حقیقت میں خدمتِ قرآن کشاں کشاں قید خانہ کی طرف لیے جا رہی تھی، جس کی عزلت و تنہائی مولانا کے لیے وجہ فارغ البالی بن گئی۔

حضرت مولاناؒ مالٹا پہنچے۔ بحرِ روم المتوسط کا یہ مختصر جزیرہ — جو برطانوی اقتدار کا امین ہے — مسلمانانِ عالم کی محبت و عقیدت کے یوسف عزیز کو اپنی آغوش میں لے کر زندانِ عزیز کے لیے سامانِ رشک مہیا کرنے لگا ؎

بر زمینے کہ نشانے کفِ پائے تُو بود
سال ہا سجدۂ صاحبِ نظراں خواہد بود [15]

(جس زمین پر تیرے کفِ پا کا نشان ہو
وہ سال ہا سال تک اہلِ نظر لوگوں کی سجدہ گاہ رہے گی)

(سمندری طوفان میں ترجمۂ قرآن کی حفاظت کا اہتمام)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے چند خادمانِ وفا شعار (حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عزیر گلؒ، حکیم نصرت حسینؒ اور مولانا عبدالوحیدؒ) کے ساتھ اسکندریہ سے مالٹا لے جائے جا رہے تھے کہ جہاز کو زبردست خطرہ پیش آیا۔ جرمنی کا مشہور تباہ کن اور حشر انگیز جہاز ایمڈن (Emden) نمودار ہوا۔ کپتانِ جہاز نے اس بلائے ناگہانی کے ظہور پر مسافروں سے کہہ دیا کہ موت کا قاصد سامنے آ رہا ہے۔ تیرنے کی پیٹیاں کمر سے باندھ لو اور اشارے پر سمندر میں کود جانا۔

ایسے نازک وقت میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تمام سامان سے قطع نظر کر کے ترجمۂ قرآن مجید کے جملہ اوراق مولانا عزیر گل صاحب کے سینے سے باندھ دیے کہ شاید یہ سرمایۂ گراں اَرز (مہنگی قیمت کا سرمایہ)، حفاظت سے اہلِ عالَم تک پہنچ جائے۔ خدا کی شانِ کبریائی دیکھیے کہ ایمڈن جہاز اپنی رفتار بھول گیا اور اسیرانِ سیاسی کا جہاز صحیح و سالم مالٹا پہنچ گیا۔ قانونِ قدرت کی جملہ طاقتیں اہل اللہ کی خدمت گار ہوتی ہیں۔

(مالٹا کی قید میں ترجمۂ قرآن حکیم کی تکمیل)

مختصر یہ کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقا کے ساتھ ۲۹/ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (22/ فروری 1917ء) کو مالٹا پہنچے اور شوال ۱۳۳۵ھ (جولائی 1917ء) سے ترجمے کا سلسلہ شروع فرمایا۔ مشاغلِ ذکر و مراقبہ اور اَوراد و وظائف و تلاوت کی مصروفیتوں سے جو وقت ملتا، اس میں ترجمہ یا اس پر نظرِ ثانی فرماتے، جس میں مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور مولانا عزیر گل صاحبؒ سے بھی مذاکرات رہتے۔ اس طرح بقیہ بیس پاروں کا ترجمہ ایک سال کی قلیل مدت میں ۲/ شوال ۱۳۳۶ھ (11/ جولائی 1918ء) کو اختتام پذیر ہوا۔

(حضرت شیخ الہندؒ کی ہندوستان واپسی)

ترجمے سے فراغت ہوئی تو حواشی تحریر فرمانا شروع کیے اور سورۂ نساء تک لکھ چکے تھے کہ ۲۲/ ربیع الثانی ۱۳۳۸ھ (14/ جنوری

1920ء) کو ہندوستان روانہ کردیے گئے کہ خود اس ملک (ہندوستان) میں اب ایک مجاہدِ اعظم اور رہنمائے اکبر کی ضرورت تھی، جو ملتِ منتشرہ و قومِ مضطرب کی صحیح رہنمائی کرے اور عزیمت و دعوت کی منزل کا راستہ بتائے۔ ۲۰/ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (7/ جون 1920ء) کو بمبئی کے اُفق سے دوبارہ آفتاب علم و عمل کا طلوع ہوا اور تمام ہندوستان مطلعِ انوار ہوگیا۔

(حضرت شیخ الہندؒ کا وِصال)

اس زمانے میں ہندوستان کشمکشِ حیات میں مبتلا تھا۔ معتقدین و مسترشدین نے ایک جگہ بیٹھنے نہ دیا۔ ترجمۂ قرآن کی خدمت سرانجام ہوچکی تھی۔ عصرِ حاضر کا کارنامۂ اعظم پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ مضطرب و بے چین ملک (ہندوستان) کی رہنمائی کی جا چکی تھی اور رفیقِ اعلیٰ سے وصال کے لیے روح بے تاب تھی۔ حواشی کی تکمیل کی فرصت کیسے ہوتی۔ چناں چہ دو ماہ صاحبِ فراش رہ کر ۱۸/ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ (30/ نومبر 1920ء) کو دنیائے فانی سے دارِ بقا کا سفر پیش آیا اور مُھاجِر إلی اللّٰہ (اللہ کے راستے پر مہاجر) جوارِ رحمتِ خداوندی میں پہنچ گیا ع

پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا

(ترجمۂ قرآن حکیم کا حضرت شیخ الہندؒ کے ورثا سے باضابطہ حصول)

۱۲/ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ مطابق 28/ جون 1923ء کو میری قسمت کا ستارہ چمکا اور بہ صد مشکل حضرت مولانا (شیخ الہند مولانا محمود حسن) رحمۃ اللہ علیہ کے ورثا سے اس (ترجمۂ قرآن حکیم کی) دولتِ دارین کو باضابطہ (قانونی) طور پر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مشتاق نگاہیں بے تاب، تشنہ کامانِ ہدایت مضطرب اور تقاضے شدید تھے۔ اس لیے فوراً ہی طباعت کا انتظام شروع کردیا۔ بعد میں (ترجمے کے) مسودات دیکھنے سے معلوم ہوا کہ حواشی سورۂ آلِ عمران، جن کو مولانا رحمۃ اللہ تحریر فرما چکے تھے، ان میں موجود نہیں ہیں اور اتنی مہلت نہ ملی کہ بقیہ حواشی کی تکمیل کرائی جائے۔ تمام بزرگوں سے مشورہ کرنے کے بعد یہی رائے قرار پائی کہ باقی قرآن مجید میں (موضح القرآن از) حضرت شاہ عبدالقادر (دہلوی) رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی درج کردیے جائیں، کیوں کہ اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔

اب عزمِ مصمم ہے کہ انشاء اللہ بقیہ حواشی بھی اسی تفصیل و خصوصیت کے ساتھ جسے مولانا (شیخ الہندؒ) نے ملحوظ رکھا ہے، کسی معتبر عالم اور دوسرے علما کے مشورے سے پورے کراکے اشاعتِ آئندہ میں درج کردیے جائیں۔ و اللّٰہُ المُستَعان.

(اس اشاعت کی تصحیح کا پورا اِہتمام)

صحت کے متعلق صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ حتی المقدور کوتاہی نہیں کی گئی، قرآن مجید مترجم کا ہر ایک لفظ اور نقطہ متعدد حفاظ کی محتاط نظروں سے گزرا ہے۔ اور خود میں نے دوسروں کی معیت میں بالاستیعاب کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح کی ہے۔

قرآن کی کتابت کے لیے ہندوستان کے مشہور نسخ نویس منشی محمد قاسم صاحب لدھیانویؒ [16] کی خدمات حاصل کیں اور طباعت میں اِمکانی احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ متن کی حنائی زمین کو بھی پتھر پر چھاپا، جس سے چھپائی کا کام دوچند ہوگیا۔ اور باوجود انتہائی کوششوں کے ڈھائی سال کے عرصے میں رجب ۱۳۴۴ھ (فروری 1926ء) میں تکمیل کو پہنچا۔

(ترجمے کے مراحل کی تاریخوں کا اہتمام)

حضرت مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے ہر مسودے کے اختتام پر تاریخ و ماہ وسن لکھ کر کہیں ''**مالطه فی الاُسر الحمد لِلّٰه**'' لکھا ہے۔ کسی جگہ ''**فی مالطه اُسر الحمد للّٰه**'' تحریر فرمایا ہے۔ اور میں نے بھی اس تاریخی شئے کو قرآن مجید کے حاشیے پر لکھوا دیا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں تاریخ اور اتنے عرصے میں آپؒ نے اس قدر اور فلاں حصہ قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا۔ ہر پارہ کو 32 صفحات پر ختم کیا گیا ہے۔

غرض یہ ہے داستانِ ترجمہ وطباعت اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں بہ صد ادب و نیاز گزارش ہے۔ مصنف ترجمہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس عظیم الشان خدمت کے طفیل مجھ عاصی معاصی کو اپنی رحمت ومغفرت کی نعمت عطا فرمائے اور صادقین وصالحین کی معیت نوازش کرے۔

اللّٰهمّ فاطر السّماوات و الأرض، أنت وليّي فى الدّنيا و الآخرة،توفّني مسلما و ألحقني بالصّالحين.

طابع و ناشر: محمد مجید حسن، مالک اخبار مدینہ بجنور (یوپی)

ترجمہ شیخ الہند کی اوّلین اشاعت پر حضرات اکابرین کی تقریظات

(نوٹ: شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے ترجمہ شیخ الہند کی اوّلین اشاعت کے موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے کچھ حالات اور ترجمے سے متعلق چند اُمور تحریر فرمائے تھے۔ یہ ایک نادر تحریر ہے، جس سے شیخ الہندؒ کے ادبی ذوق اور آپؒ کی ہمہ گیر شخصیت کے حوالے سے بڑی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مرتب)

(1)

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی شخصیت اور ادبی ذوق

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کی نادر تحریر

تمہید

حامِداً و مُصَلِّيًا و مُسَلِّماً ! أمّا بعد !

(محبت وبغض کے فطری عجائبات)

فطرتِ انسانی نے جو جو عجائب وغرائب اس عالم شہادت میں ظاہر کیے ہیں، ان میں سے یہ امر بھی ہے کہ انسان کو اپنے محبوب کے بڑے سے بڑے عیوب بھی نظر نہیں آتے۔ آنکھیں فقط اس کے محاسن اور کمالات کو دیکھتی ہیں۔ اور نہ صرف معمولی نظر سے دیکھتی ہیں، بلکہ غیر معمولی طریقے پر چھوٹی سے چھوٹی فضیلت مُحِبّ (محبت کرنے والے) اور دلدادہ کی نظر میں پہاڑ کی

طرح دکھائی دیتی ہے۔ اس کے لیے مدائح اور محامد کے طور پر اور مبالغے سے بھرے ہوئے **قصائد و خُطَب** (قصیدے اور خطبے) بھی بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ دھواں دار تقاریر بھی اس میدان میں رائی کے دانے سے چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔

برعکس اس کے دشمن اور مبغوض کے جملہ کمالات خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، آنکھوں کے سامنے بھی نہیں پڑتے۔ اس کو فقط عیوب دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہ فقط واقعی عیوب دکھائی دیں، بلکہ جس طرح سبز عینک سے تمام اشیا سبز ہی نظر آتی ہیں، اسی طرح بغض و عداوت کی آنکھ حقیقی کمالات اور واقعی فضائل کو بھی معائب (عیبوں) ہی کے رنگ میں دیکھتی ہے۔ کسی واضح سے واضح کمال کا اقرار کرنا عدُوّ (دشمن) اور حاسد کو پہاڑ اُٹھا لینے سے زیادہ تر گراں معلوم ہوتا ہے۔ اس کے محامد اور مدائح کے سننے اور دیکھنے سے نہایت ہی زیادہ کُلفت اور دل تنگی پیش آتی ہے۔ **و لنعم ما مثل (کما قال الإمام الشّافعیؒ)** ؎

وَعَینُ الرِّضا عَن کُلِّ عَیبٍ کَلیلَۃ وَ لٰکِنَّ عَینَ السُّخطِ تُبدِی المَساوِیا [17]

(رضا مندی کی آنکھ ہر عیب چھپا لیتی ہے، لیکن غصے کی آنکھ تمام برائیوں کو ظاہر کر دیتی ہے)

(حقائق کی بنیاد پر تعریف کرنے والے لوگ)

اگرچہ مذکورہ بالا قاعدہ فطری قانون شمار کیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں (ایسے) اشخاص بھی ہر زمانے میں ضرور پائے جاتے ہیں، جو کہ اِفراط و تفریط کی ناگوار موجوں سے محفوظ رہ کر حقائق کو دریافت اور ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ **محبّتِ مُفرِطہ** (حد سے بڑھی ہوئی محبت) کے سواحل (کناروں) سے تحقیق و صداقت نے ان کو دور کر کے **وسطِ بِحار** (سمندروں کے بیچ) میں پہنچا کر واقعی دُرَر (حقائق کے موتی) اور اصلی چمک دار لآلی (ہیرے) کے معدن (خزانوں) تک پہنچا دیا ہے۔

معذرت اور اظہارِ واقعہ

وسیلتی فی الدّارین (دونوں جہانوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف میرا وسیلہ) حضرت شیخ الہند— **قدّس اللّٰہ سرہٗ العزیز** —کے ترجمہ (قرآن حکیم) کے متعلق میرا کچھ لکھنا— خواہ وہ کتنی ہی صداقت پر مبنی کیوں نہ ہو— مجھ کو زیادہ تر اندیشے میں ڈالتا ہے کہ بہت سے اشخاص **اِفراطِ محبّت** (محبت کی زیادتی) پر محمول فرماتے ہوئے غیر واقعی خیال کریں گے۔ میں جہاں تک غور کرتا ہوں، ایسا گمان کرنے والے حضرات ایک بڑے درجے تک معذور ہیں۔

(اظہارِ واقعیت کے طور پر چند سچے کلمات)

ایک نالائق خادم اپنے ولیٔ نعمت اور روحانی و جسمانی آقا، دُنیا اور آخرت کے وسیلے (حضرت شیخ الہندؒ) کے متعلق جو کچھ بھی کہے یا لکھے، افراطِ محبت سے **حسبِ قاعدۂ مذکورۃُ الصّدر** (اوپر بیان کردہ قاعدے کے مطابق) محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے میں اس مقام میں کچھ بھی خامہ فرسائی کرنا مناسب نہیں دیکھتا تھا، مگر مولانا مجید حسن صاحب [18] (ناشر اور طابع ترجمۂ شیخ الہندؒ) کے اصرار اور اظہارِ واقعیت کے خیال نے مجبور کر کے چند سچے کلمات لکھوائے ہیں۔ جن سے ان حضرات کے دماغ پر بھی قدرے روشنی پڑنے کا خیال ہے، جو کہ حسبِ قاعدۂ مشہورہ:

’’اُنظُر إلٰی مَن قالَ، و لا تَنظُر إلٰی مَا قالَ‘‘ [19]

(یہ دیکھو کہ کس نے کہا ہے، یہ مت دیکھو کہ کیا کہا ہے۔)

فقط اسی طرف اپنی عنانِ توجہ منعطف (توجہ کی مہربانی) کرتے ہیں کہ قائل (کہنے والے) میں کن اوصاف کا اجتماع ہے، وہ کیسا شخص ہے؟ اس کی ظاہری تزک (ظاہری شب و روز اور سوانح) کی کیا حالت ہے؟ کلام کی تہہ تک پہنچنا اور حقیقت کے بے بہا موتیوں کا تلاش کرنا، ان کو نہیں آتا۔

شیخ الہندؒ میں جامعیتِ کمال کے قدرتی سامان

مَیں جو کچھ اس مقام میں عرض کر رہا ہوں، بلاکم و کاست ان واقعی اور صحیح معلومات کے بحار (سمندر) سے چند قطرے ہیں، جن کا علم مجھ کو حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مدتوں رہ کر حاصل ہوا ہے۔ میں اس میں ذرا بھی مبالغہ اور اِفراطِ مُحِبّ (محبت کرنے والے کے مبالغے) کو دخل نہ دوں گا۔

(ترجمۂ شیخ الہندؒ کی واقعی شان)

اس سے مقصد اس ترجمے کی واقعی شان کو ناظرین پر حسبِ استطاعت و وقت ظاہر کرنا ہے اور بس۔ قدرت نے جس طرح حضرت مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ میں اُن ذاتی کمالات کا گل دستہ رکھ دیا تھا، جن کا تحقُّق (حقیقتاً پایا جانا) کتاب اللہ کے صحیح ترجمہ کرنے کے لیے ضروری ہے، اسی طرح اس نے بہت سے ایسے خارجی اسباب بھی مہیا کر دیے تھے، جن کا وجود ہر زمانے میں بہت کم افراد کو میسر آتا ہے۔ فطرتاً (فطری طور پر) آپؒ کو نہایت ذکی ذہن، نہایت وقّاد طبیعت (متحرک طبیعت)، نہایت قوی حافظہ، نہایت صحیح دماغ، نہایت قوی اور وسیع دل عطا کیا گیا تھا۔ اَخلاقِ فاضلہ اور تقویٰ و اخلاص وللّٰہیت و پرہیزگاری وغیرہ آپؒ میں گویا کوٹ کوٹ کر بھر دیے گئے تھے۔

(حضرت شیخ الہندؒ کے) استاد اور رہنمائے طریقت

پھر اس پر طُرّہ یہ ہوا کہ حضرت شمس الاسلام، وارثِ حقیقی حضرت خیر الانام — **علیہ الصّلوٰۃ و السّلام** —، حکیم الامت، امام الائمہ، حضرت قطب الوقت، العارف باللہ، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی [20] (ولادت: شوال ۱۲۴۸ھ / مارچ 1833ء/ وفات: ۴/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۲۹۷ھ / 15/ اپریل 1880ء) اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی [21] (ولادت: ۶/ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / 10 مئی 1829ء/ وفات: ۹/ جمادیٰ الثانیہ ۱۳۲۳ھ / 11/ اگست 1905ء) — **قدّس اللّٰہُ تعالیٰ اَسرارَھما** — کی صحبت اور مدت دراز تک فیضِ خدمت اور ان دونوں حضرات کی خاص توجہ و تربیت نصیب ہوئی۔ علم ظاہر اور باطن ہی میں ان دونوں بزرگوں سے مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ فیض یاب (ہی) نہیں ہوئے، بلکہ اکتسابِ اَخلاقِ فاضلہ و ملکاتِ کاملہ [22] بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر حاصل ہوا۔ صحبت جو اعلیٰ ترین شرط و کمالاتِ باطنیہ میں سے ہے، حضرت مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کو **علیٰ أتمّ وجہ و أکملہ** (پورے اور کامل طور پر) نصیب ہوئی۔ مرشدِ عالم، قطب الاقطاب، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب [23] — **قدّس سرّہٗ العزیز** — کی اِرادت اور خلافت طریقت سے حظِ وافر (بڑا حصہ) ملا۔

(حضرت شیخ الہندؒ کے ادبی ذوق رکھنے والے والدِ گرامی اور اساتذۂ کرام)

خوش قسمتی سے والد ماجد (مولانا ذوالفقار علی) مرحوم و مغفور [24] ایسے ملے جو کہ علم و ادب، عربی و فارسی، اُردو کے نہ صرف اساتذہ میں سے تھے، بلکہ ان تینوں زبانوں (عربی، فارسی اور اُردو) کے امام تھے۔ طبیعت علومِ ادبیہ؛ بلاغت و بیان و بدیع وغیرہ میں نہایت رسا تھی۔ ان کی تصانیف ''شروح حماسه''، و ''متنبّی''، ''سبعه معلّقه''، ''(قصیده) بانت سعاد''، ''تذکرة البلاغة'' وقصائدِ عربیہ وغیرہ ان کے عُلُوِّ شان کے شاہد ہیں۔ علاوہ اساتذہ مذکورین کے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ [25] اور مُلّا محمود صاحب [26]، مولانا مہتاب علی صاحب [27] وغیرہ — قَدّس اللّٰه أسرارَهُم — ایسے ایسے اساتذہ ملے جو کہ اپنے زمانے میں بے نظیر شمار کیے جاتے تھے۔

ساتھی بھی اعلیٰ درجے کے فاضل ملے

ہم سبق ایسے ایسے چیدہ اشخاص قدرت نے بہم پہنچائے جو کہ نہایت ذکی اور سلیم الطبع، قوِی الحافظہ، جامع الکمالات تھے۔ مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی [28]، مولانا احمد حسن صاحب امروہی [29]، حافظ عبدالعدل صاحب پھلتی [30]، مولانا (سیّد) عبدالحق صاحب پور (قاضو) ی [31] وغیرہ — رحمهمُ اللّٰه تعالیٰ — مولانا مرحوم کے شرکائے درس اور جُلَساء (ساتھی) تھے۔

دیوبند میں خدمتِ تدریس اور اس میں مہارت و کمال

پھر اس کے بعد مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند میں کتابوں سے فارغ ہونے کے بعد ہی ملازم ہوئے۔ اساتذہ کی موجودگی ہی میں تمام کتبِ درسیہ ابتدائیہ و انتہائیہ متعدد مرتبہ پڑھا ڈالیں۔ مدرسۂ دیوبند ہمیشہ سے ہر قسم اور ہر طرف کے طلبا کا مرکز رہا ہے، اس وجہ سے مستفیدین کا ہر زمانے میں ہجوم رہا کیا۔ (حضرت شیخ الہندؒ کی) ایامِ شباب اور زمانۂ قوت میں اس قدر مشغولی ہوئی کہ دن رات میں کوئی وقت درس و تدریس سے جب فارغ نہ رہا تو تہجد کے وقت بھی سال ہا سال تدریسِ علوم میں مشغول کیا۔

ادھر مدرسے میں کتب خانہ اس قدر وسیع پیمانہ پر موجود تھا کہ کبھی کسی شرح یا حاشیہ یا کتاب کے دیکھنے اور استفادہ کرنے میں کوئی دِقت نہیں پڑی۔ ہر فن اور ہر علم کی کتابیں اس قدر پڑھائیں کہ سب کی مع ابحاث شروح و حواشی تقریباً محفوظ ہوگئیں۔ اسی وجہ سے تھوڑے ہی عرصے میں مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کو کسی کتاب یا حاشیہ و شرح کے دیکھنے کی اصلاً حاجت باقی نہ رہی تھی۔ بلا تکلف بغیر مطالعہ کیے ہوئے تمام معقولات و منقولات، اصول و فروع وغیرہ کو پڑھاتے تھے اور نئی نئی تحقیقات — خصوصاً علمِ حدیث و تفسیرِ آیات میں — ظاہر فرمایا کرتے تھے، جن کو سن کر حاضرینِ مجلس اور اساتذۂ فن دنگ ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر طرف سے علما اور طلبا ٹوٹ پڑے تھے۔ تقریباً دو ہزار سے زیادہ علما اطرافِ عالم میں آپؒ سے بلاواسطہ مستفید ہو کر عالمِ اسلام کی خدمت کر رہے ہیں اور لوگوں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

(عربی ادب کی کتاب) ''مختصر معانی'' کے حاشیہ کا ذکر

دورانِ تدریس مولانا (شیخ الہندؒ) کو (شیخ سعد الدین تفتازانی کی تصنیف) ''مختصر معانی'' کے تحشیہ (حاشیہ) کی بھی

نوبت آئی، جس کی وجہ سے حواشی ''دُسوقی'' (محمد بن احمد بن عرفہ الدسوقی) اور ''بُنانی'' (شیخ مصطفیٰ بن محمد بن عبدالخالق البنانی)، ''مطوّل'' [32] وغیرہ کے ابحاث پر تفصیلاً نظر کرنی پڑی[33]۔ یوں تو (درسِ نظامی کی کتابیں) ''مُطوَّل''، ''مُسلَّمُ الثُّبوت''، ''توضیح و تلویح''، ''(تفسیر) بیضاوی'' وغیرہ مولاناؒ کے زیرِ تدریس اکثر رہا کرتی تھیں، جن کی وجہ سے علومِ عربیہ اور فنونِ تفسیر و بلاغت پر خاص طور سے توجہ کی نوبت آتی رہتی تھی، مگر تحشیہ (حاشیہ مختصر المعانی) کی وجہ سے اَور بھی (ادبی فصاحت و بلاغت کی) قوت دوبالا ہوگئی۔

(اُردو اور فارسی کا) ذوقِ شعر و اَدب

مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کو عنفوانِ شباب میں اُردو اور فارسی شعر و شاعری کا اچھا خاصا چسکا پڑ گیا تھا۔ چوں کہ طبیعت موزوں تھی، اس لیے بہت جلد اس میں غیر معمولی ترقی کر گئے تھے۔ شعر و شاعری میں (میر تقی) میرؔ اور (مرزا اسد اللہ خاں) غالبؔ سے بہت زیادہ مناسبت تھی۔ اساتذۂ اُردو کے اس قدر اشعار اس بڑھاپے اور کمزوری کے زمانے میں بھی یاد تھے۔ اگر وہ سب لکھے جاتے تو بہت بڑا دیوان تیار ہو جاتا[34]۔

علیٰ ہٰذا القیاس (اسی طرح) فارسی اور عربی شُعَرا کے قصائد کے قصائد اور اُن کے دواوین (دیوان) کے اوراق (حضرت شیخ الہندؒ کے ذہن میں) محفوظ تھے۔ بارہا جب اشعار مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے سنانے شروع کیے تو حاضرین کو کثرتِ محفوظات سے تعجبِ شدید ہوا۔ متعدد (مرتبہ) فرمایا کہ: ''اب حافظہ کمزور ہو گیا، پہلے کے سب محفوظات باقی نہیں رہے''۔

مرزا غالب کے شاگرد ہرگوپال تفتہؔ کا حضرت شیخ الہندؒ کے ادبی ذوق اور وسعتِ نظر کا اعتراف

عنفوانِ شباب میں مرزا غالب کے سکندر آبادی مشہور ہندو شاگرد (منشی ہرگوپال تفتہ) [35] کسی تقریب میں دیوبند آئے تھے کہ مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ اُن کا سن کر معہ چند ہمراہیوں کے اُن کے پاس پہنچے۔ دن بھر شعر و شاعری کا چرچا رہا۔ (تفتہؔ) مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی محفوظات اور شاعرانہ مناسبت کو دیکھ کر دنگ ہو گئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنی تمام عمر میں اساتذہ کے کلام کا اس قدر جمع کرنے والا حافظ نہیں دیکھا۔ اُردو محاورات پر بسا اوقات جب مولانا (شیخ الہندؒ) سے اثناءِ ترجمہ (ترجمہ قرآن تحریر کرنے کے دوران) میں کوئی تذکرہ آیا، فوراً میرؔ یا مؤمنؔ خاں، ذوقؔ، غالبؔ وغیرہ کے اشعار سنا دیتے تھے۔ یہ واقعات بہت سی دفعہ پیش آئے۔

حافظ نہ ہونے کے باوجود آیاتِ شریفہ کا غیر معمولی استحضار

مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کو قرآن شریف سے خاص شغف تھا۔ باوجود حافظ نہ ہونے کے اس قدر آیتیں یاد تھیں کہ گویا حافظ ہو گئے تھے۔ بخاری شریف میں ادنیٰ ادنیٰ مناسبت سے لُغات کو لا کر (امام) بخاریؒ (آیات کی) تفسیر کیا کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھے حافظ وہاں چکرا جاتے ہیں اور نہیں بتا سکتے کہ یہ الفاظ کن کن آیتوں میں وارد ہیں۔ (آیات کے) ماسبق (پہلے حصے) اور مابعد (بعد کے حصے) کو پڑھ دینا نہایت مشکل ہوتا ہے، مگر مولانا رحمۃ للہ علیہ بلا تامل بخاری شریف پڑھاتے ہوئے اور خصوصاً کتاب التفسیر کے وقت آیات کو اوّل سے پڑھ دیتے تھے اور تفسیر بیان فرماتے تھے[36]۔ یہی مشغلہ سال ہا سال رہا۔

www.rahimia.org

قرآن شریف کی تلاوت اور خدمتِ حدیث کا ذوق

رمضان شریف میں علاوہ دن کو بڑی مقدار تلاوت کرنے کے، تراویح اور نوافل میں ہمیشہ دس دس بارہ بارہ پارے یا کم و بیش سنا کرتے تھے۔ حُفّاظ سنانے والے تھک جاتے تھے، مگر خود اخیر وقت تک نہ تھکتے تھے۔ کبھی کوئی کمزوری ظاہر نہ ہوتی تھی۔ نہ معلوم کون سی روحانی قوت اور باطنی مناسبت قرآن شریف سے تھی، جو کہ اس طرح ان کو (تلاوتِ قرآنی میں) محو کر دیتی تھی کہ ذرا بھی تکان محسوس نہ ہوتا تھا۔

مالٹا کی اسارت کے زمانے میں غالباً روزانہ ایک قرآن ناظرہ ختم کرنے، یا قریب بہ ختم تو ضرور پہنچا دیتے تھے۔ حدیث شریف جو کہ حقیقتاً قرآن شریف کی تفسیر ہے، آخری وقت تک مولانا (شیخ الہندؒ) کا مشغلہ رہا ہے۔ اسی طرح تدریسی علوم میں تقریباً چالیس برس سے زیادہ مدت مولانا رحمۃ اللہ کی گزری ہے۔

باطنی اشغال پر استقامت، سیرِ سلوک اور حضرت گنگوہیؒ سے اجازت

باطنی اَشغال — جب سے کہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب — قَدّس اللّٰہ سرّہٗ العزیز — سے ۱۲۹۵ھ (1878ء) میں بیعت ہوئے — آخری وقت تک ترک نہ فرمائے، بلکہ اس میں روز افزوں ترقی کرتے رہے اور بہت جلد سلوک کی منزلیں زیرِ تربیت (حضرت) مولانا (رشید احمد) گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تمام کر کے خلافت حاصل کی[37]۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیلی کیفیت حضرت حاجی (امداداللہ مہاجر مکی) صاحب قدس سرہٗ العزیز کے پاس مولانا (شیخ الہندؒ) کے سلوک اور ترقی کے مقامات کی لکھی، جس پر حضرت حاجی صاحب مرحوم نے مکہ معظّمہ سے خلافت نامہ تحریر فرمایا۔ یہ روحانی تربیت اور باطنی کمال وہ چیز ہے، جس سے حقیقی تفسیرِ (قرآن حکیم) کے لیے ہر قسم کی آسانی میسر ہو سکتی ہے۔

ترجمۂ قرآن پاک کے لیے وسیع مطالعہ، محنت اور اِنہماک

خلاصۂ کلام یہ کہ صحیح اور معتبر ترجمہ و تفسیر کے جتنے مَبادی (ابتدائی اور بنیادی اُمور) اور اَسباب تھے، خداوندِ کریم نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں اس طرح مہیا کر دیے تھے کہ ان کا اجتماع عادتاً (عام طور پر) نہایت ہی اَقلّ (بہت کم) ہوا کرتا ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ہر قسم کے کمالات میں جب مراحل کو طے کر لیا اور آخری حصۂ عمر کو پہنچ گئے — یعنی جب کہ جملہ مبادی اور اسباب کا تکملہ ہو گیا — (تو) اس وقت قدرت نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے یہ (ترجمۂ قرآن حکیم کا) کام لیا۔

ابتدائی (سورتوں کے) ترجمے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت چھان بین اور کد و کاوش، کتب بینی، تحقیق و تدقیق سے کام لیا۔ موجودہ ہر قسم کے اُردو فارسی تراجم بھی پاس ہوتے تھے۔ تفسیر کی متعدد کتابیں بھی ہر ہر آیت پر دیکھتے تھے۔ وقت کے گزرنے کا خیال نہ آتا تھا، بلکہ (آیات کی ظاہری اور معنوی) حقیقت پر پہنچنے کا قصد ہوتا تھا۔ غور و خوض میں ادنیٰ تکاسل (معمولی سستی اور کاہلی) کو راہ نہ دیتے تھے۔ ہندوستان میں عرصۂ دراز تک کام کرتے رہے، مگر ہجومِ خلائق اور کثرتِ واردین (آنے جانے والوں کی کثرت) واَشغال نے جب تک تکمیل نہ ہونے دی تو قدرت نے مالٹا میں غالباً اسی کام کے لیے ڈال دیا، جہاں بالکل فرصت ہی فرصت تھی۔

مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں (مالٹا میں) نہایت فراغت کے ساتھ نہ صرف ترجمہ کو تمام ہی کیا، بلکہ مکرر نظر بھی ڈالی اور اصلاح بھی فرماتے رہے۔ جس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو بخاری شریف پڑھاتے پڑھاتے بخاری شریف کے تراجمِ ابواب اور احادیث کے متعلق خاص ملکہ (حاصل) ہوگیا تھا، اسی طرح اس مدت میں تفسیرِ آیات کے متعلق بھی نہایت عجیب اور کامل و مکمل ملکہ ہوگیا تھا، مگر افسوس کہ زمانے نے مہلت نہ دی۔ اگر فوائد کی تکمیل ہوجاتی تو خلائق (لوگوں) کو بہت زیادہ انتفاع کی صورت حاصل ہوتی۔

(حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ موضح القرآن پر اعتماد)

مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے اَسلافِ کرام خصوصاً حضرت مولانا (محمد قاسم) نانوتوی اور حضرت مولانا (رشید احمد گنگوہی — قَدَّسَ اللّٰہُ اَسرارَھُما — کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب[38] رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ (موضح قرآن) پر بہت زیادہ اعتبار تھا اور حقیقت میں وہ ہے بھی تمام متراجم میں زیادہ تر قابلِ اعتماد۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم و مغفور ہر قسم کے ظاہر اور باطنی کمالات کے گلدستہ ہیں۔ اس لیے ان پر اعتماد ہونا ضروری ہے۔ ''مقدمہ'' (مُوضِح فرقانِ حمید) میں مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ اس کا اظہار بھی فرمایا ہے اور زبانی جو کچھ فرمایا کرتے تھے، اس کے لیے دفاتر کی ضرورت ہے۔ اس ترجمے کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا امام (رہنما) بنایا ہے اور حسبِ تغیرِ زمانہ محاورات کے متبدل (تبدیل) ہوجانے کی وجہ سے کچھ تغیر دیا ہے، جس کی تفصیل اور حالت ''مقدمہ'' (مُوضِح فرقانِ حمید) سے ظاہر ہوگی۔

(اس ترجمے کی صحت اور تفسیر کی واقعیت)

اس میں شک نہیں کہ بے عیب فقط ذاتِ خداوندی ہے۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی فقط معصوم ہیں۔ انسان خواہ کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو، عیوب سے مُنَزَّہ (صاف)، خطاؤں سے مُطہّر (پاک) نہیں ہوسکتا۔ (اس لیے) ہم کسی طرح بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ قطعی طریقے پر ہر جگہ خطاؤں سے مُبَرَّا (پاک) ہی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ جو جو سامان اللہ تعالیٰ نے ترجمہ کی صحت اور تفسیر کی واقعیت کے (حوالے سے) مولانا (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ میں جمع کردیے تھے اور جس اخلاص اور کوشش سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو تحریر فرمایا ہے، ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں تو درکنار، پہلے زمانے میں بھی عموماً یہ اُمور کہیں پائے نہیں گئے؟

یوں تو انکار کرنے والے، عیب چینی کرنے والے جن کی قسمت میں ازلی محرومیت لکھی ہوتی ہے، وہ خدا اور رسول اور اس کی سچی کتاب کو بھی نہیں چھوڑتے، اس پر بھی طعنے کستے رہتے ہیں (جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے):

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا[39]

(گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو۔)

اِلّا (جب کہ) یہ خود قرآن میں موجود ہے، مگر ہم نکتہ چینی والے حضرات سے یہ ضرور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ذرا مقامِ ترجمۂ (قرآن حکیم) کی تنگی اور مولاناؒ کے لیے اسباب و وسائل کی فراہمی وغیرہ پر غور کرکے اعتراض اور نکتہ چینی کریں۔

وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَ هُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ [40]

(اور اللہ کہتا ہے ٹھیک بات اور وہی سجھاتا ہے راہ۔)

اس ترجمہ قرآن حکیم کے طابع اور ناشر مولانا مجید حسن کا شکریہ

مولانا مجید حسن صاحب —شکر اللّٰہ سعاھُم— نے اس ترجمے کی تصحیح اور تحسینِ کتابت وطباعت وغیرہ میں جو عرق ریزی فرمائی ہے، وہ بھی انھی کا حصہ تھا۔ خداوندِ کریم ان کو اس خدمتِ کتاب اللہ کا اجرِ جزیل دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے۔ آمین! حقیقت یہ ہے کہ جس طرح یہ ترجمہ واقع میں مکمل تھا، اسی طرح اس کو ظاہری زیور بھی مولوی صاحب موصوف کی سعیٔ بلیغ سے حاصل ہوا۔ اب ہم مولوی صاحب موصوف کی ثنا وصفت اور دعا کرتے ہوئے ناظرین سے سمع خراشی کی معافی مانگتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔

خداوندِ کریم ناظرین کو اپنی رحمتِ خاصہ سے نوازے اور کاتب و طابع اور جملہ سعی کرنے والوں کو دارین (دُنیا اور آخرت) میں خوش وخرم رکھے۔ حضرت مولانا (شیخ الہند مولانا محمود حسن) قدس اللہ سرہٗ العزیز اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب (دہلوی) قدس اللہ سرہٗ العزیز کے لیے یہ ترجمہ بہترین باقیاتِ صالحات ہو۔

و آخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين.

و الصّلوٰة و السّلام علىٰ سيّد المرسلين، و آله و صحبه أجمعين.

كَتَبَهٗ: ننگِ اکابر

حسین احمد غفرلہٗ از سلہٹ

دوم شعبان ۱۳۴۴ھ (16/فروری 1926ء) سہ شنبہ

(2)

از حضرت مولانا بدر الحسن جلالی مراد آبادیؒ [41] مدیر ''مدینہ'' اخبار بجنور

بسم اللّٰه الرّحمٰن الرّحيم

تقریظ بر کلامِ پاک ، عرضِ نیاز بدر

۱۹۲۶ء ۱۳۴۴ھ

الحمد للّٰه الّذی نزّل الكتاب بالحقّ، مصدّقًا لما بين يديه، و أنزل التّوراة و الإنجيل من قبل، و هدى للنّاس، و أنزل الفرقان بيان للنّاس، و هدى و موعظة للمتّقين، و الصّلوٰة و السّلام علىٰ رسوله الكريم، و أهل بيته، و أصحابه أجمعين.

زِ بادہ خوردنِ ''تنہا''، ملول شد حافؔظ
بہ بانگِ بربط و نے رازش آشکارہ کنم (42)
تنہائی میں نشہ پینے سے حافؔظ رنجیدہ ہے
اب ڈنکے کی چوٹ پر اُس کا راز کھلم کھلا بیان کروں گا)

(حضرت شیخ الہندؒ کی رہبری)

کیسی مبارک وہ گھڑی اور کس قدر سعید وہ ساعت تھی، جب کہ حضرت شیخ الہند مرشدنا ومقتدانا، خاتم المفسرین و امام المحدثین، جناب مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ہندوستان کے مسلمانوں کی رہبری اور ہدایت کے لیے ترجمہ کلامِ ربانی جلّ شانہٗ کی ابتدا فرمائی ؎

''خوشا'' وقتے و خرّم روزگارے
کہ یارے بر خورد از وصلِ یارے (43)
(کتنا اچھا ہے وہ وقت اور کتنا خوب ہے وہ زمانہ
کہ ایک دوست دوسرے دوست سے ملاقات کا پھل حاصل کرے)

حضرت شیخ الہند — علیہِ الرّحمۃُ و الغُفران — جو مدرسہ عربی عالیہ دیو بند کی خدمتِ مسلسل اپنی حیاتِ مقدسہ کا مشغلۂ محبوب ترین بنا چکے تھے۔ جن کی زندگیٔ مطہر کے پورے پینتالیس سال، تشنہ کامانِ علومِ دینیہ کے سیراب کرنے میں صَرف ہوئے، ایک لحظہ کے لیے بھی مسلمانانِ عالم کی عموماً اور مسلمانانِ ہند کی خصوصاً ان ضروریات اور احتیاجات سے بے خبر نہ رہے، جو مذہبی اور دینی زندگی کی اصلاح و ارشاد کا مطالبہ حق کر رہی تھی۔ درس و تدریس کے مرغوب ترین شغل کے بعد اَخلاق و روحانیت کے دروس عنایت فرماتے۔ گمراہانِ وادیٔ ضلالت کو صراطِ مستقیم دکھاتے اور تعلیماتِ اسلامیہ کے حقائق و معارف کی تشریح وتفسیر سے جاہل افرادِ ملت کے سینے کھولتے۔

(ہندوستان کے مسلمانوں کی ابتلا اور حضرت شیخ الہندؒ کی بالغ نظری)

ہندی مسلمانوں کی تاریک زندگیوں کا وہ تاریک ترین زمانہ، جب کہ ان کی عظمتِ ماضیہ اور سرمایہ دینی و دُنیوی، دشمنانِ ملتِ بیضا کی دراز دستیوں سے پائمال [پامال] و برباد ہو رہا تھا، جب کہ توحید کا ہر فرزند اور رسالت کا ہر غلام اوامر ونواہیٔ ربانی سے بے نیاز ہو کر، آئے دن کی ابتلاؤں اور آزمائشوں میں گرفتار ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی بالغ و غائر نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ قلبِ سلیم جو امدادیؔ (حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ) اور قاسمی (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے) فیوض و برکات کا مہبطِ خصوصی بن چکا تھا، وہ حریمِ سینہ جس میں قادریؔ (سلسلۂ قادریہ) اور رشیدیؔ (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے) انوار و اسرار مصروف جلوہ پاشی تھے، کیونکر ملتِ مرحومہ کے اس حالِ زبوں پر مُتأسِّف و مُتألِّم (افسوس اور تکلیف کی حالت میں) نہ ہوتا۔ اور اس عِلّتِ مِلّیہ (ملّی بیماری) کا مداوائے صحیح نہ فرماتا۔

(ہندی مسلمانوں کی احکامِ قرآنی سے غفلت کا حال)

(ایسے وقت میں) جب کہ احکامِ قرآنی کی طرف سے غفلت، پابندیٔ شریعت کی طرف سے بے نیازی، اسوۂ حسنہ رسول کو نذرِ بے پروائی کر دینا، سنتِ صحابہ کرام وتقلیدِ ائمۂ عظام کو پس پشت ڈال دینا، تربیتِ دینیہ وتعلیمِ اسلامیہ کی طرف سے تجاہلِ ظالمانہ برتنا، نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ مسلمانانِ عالم کی زندگیوں کا ممتاز کارنامہ بن چکا ہو، جب کہ غلط **تفقُّہ** اور **تجاھُد** (مصنوع فقاہت اور غلط اجتہادات) کی وبائے عام مؤمنوں میں پھیل چکی ہو، تفسیر اور ترجموں کے اندر مادیت اور مغربیت کا الحاد سرایت کر چکا ہو، عقلیات اور فلسفیات نے انسانی دماغوں اور ذہنیتوں پر غلبہ پا لیا ہو، نفسیات اور مرضیات پر افرنجیت (انگریزی سامراجیت) کا شیطان مسلط ہوگیا ہو، جب کہ معتقدات (عقائد) کے اندر اختلاف و افتراق کا طوفانِ ہفتادِ ملت (ستر فرقوں کا طوفان) برپا ہوگیا ہو، **تحدُّث** (خود ساختہ محدث) اور قیاس نا اہل زبانوں اور لبوں کا دعویٰ بر خود غلط بن کر اجماعِ گمراہ کن تسلیم کیا جا چکا ہو، کیسے ممکن تھا کہ چودھویں صدی کا یہ مجددِ اعظم اور ملتِ نادار کا سب سے بڑا سرمایہ دارِ علمِ لدنی خاموش رہتا۔ ع

یکا یک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت

(حضرت شیخ الہندؒ کی طرف سے اس کا علاج)

سب سے پہلی تجویز جو اس طبیبِ ملت کی حذاقتِ کامل (کامل دانائی) کو اِلقا فرمائی گئی، وہ ترجمۂ قرآن مجید تھا، جو تمام امراض وعِللِ مِلّیہ کا واحد اور بنیادی علاج تھا۔ **الحمد للّٰہ** فثمّ **الحمد للّٰہ** کہ ربیع الاوّل ۱۳۲۷ھ (1909ء) کو اس مبارک و مسعود کام کی طرح اندازی ہوئی اور حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست نے اس جامۂ شایستۂ اُردو کو سِیا.....

آں نافۂ مراد کہ مے خواستم ز بخت
در چینِ زلفِ آن بتِ مشکین کلالہ بود (44)

(وہ نافۂ مراد جسے میں بخت سے چاہتا تھا
وہ اس مشکیں گیسو والے محبوب کی زلفوں کی خم میں تھا)

(شیخ الہندؒ کا ترجمۂ قرآن ولی اللّٰہی فکر کا تسلسل)

حضرت شیخ الہندؒ نے ان اکابر مرحومین وعلمائے متدیّنین (حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ) کا تذکرہ اپنے خود نوشتہ مقدمے میں فرمایا ہے۔ جنھوں نے کلامِ ربانی کا ترجمہ اُردو اور فارسی میں فرما کر اسلام اور اسلامیوں کی بہترین خدمت انجام دی ہے۔ انھی حضرات کامل الصفات کے تراجم پر حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ بھی بنی ہے، جن کی صحت اور درستگی پر خود آپ کو بھی کامل اعتماد تھا۔ بعض مروّجہ تراجم آپ کے نزدیک مستند نہ تھے۔ آخر کار یہ خدمتِ حقہ تین برس کی محنت اور عرق ریزی میں ثلثِ قرآن تک پہنچی۔

اس کے بعد ہی وہ حادثۂ عظیم پیش آیا، جو محض تائیدِ ربانی سے خود حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ میں:

''سرمایۂ اطمینانِ قلب اور ارشادِ (ربانی) عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (45) کی صداقت

اور دعائے: رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ (46) کی اجابت (قبولیت)''

دکھانے والا بن گیا۔ یعنی ۱۳۳۳ھ (1915ء) میں حضرت شیخ الہندؒ عازمِ ارضِ مقدس ہوئے۔

(شیخ الہندؒ کی گرفتاری، شریفِ مکہ کی استبدادیت کا اظہار)

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس ہجرت الی اللہ کی بِنا (بنیاد) کون سی بدعتِ سیاست وحکمرانی تھی، لیکن دارالامن (حرمین شریفین) میں بھی ایک ننگ خاندانِ ہاشمی ناموسِ نبویؐ کا بیچنے والا (شریفِ مکہ، حسین) سببِ مصائب وآلام بنا۔ حضرت ابراہیمؑ کی وادیٔ غیرِ ذی ذرع (مکہ مکرمہ) میں استبدادیتِ شریف (حسین) کا طوفان برپا تھا، جس نے حضرت شیخ الہندؒ کو بھی اسیرِ مالطہ (مالٹا) کا غیر قانونی خطاب دلوا دیا۔ مالطہ (مالٹا) کی اسیری میں ایک گونہ طمانیت وفراغت حاصل ہوئی۔ دو برس کے قلیل عرصے میں ۲/ شوال ۱۳۳٦ھ (17/ جولائی 1918ء) کو (ترجمۂ قرآن کی) یہ عظیم الشان دینی خدمت درجۂ تکمیل کو پہنچی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (47)

(یہ بڑائی اللہ کی ہے، دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔)

(حضرت شیخ الہندؒ کی ہندوستان آمد)

۱٦/شوال المکرّم (25/ جولائی 1918ء) کو یہ بشارتِ سعید خادمانِ ہند کے گوش متمنی تک پہنچ گئی اور تمام ہندوستان کے مسلمان اس سعادتِ کبریٰ ونعمتِ عظمیٰ کے لیے چشم براہ بن گئے۔ ہزاروں تمنائیں اور لاکھوں آرزوئیں اس مُہتَمّ بالشّان (عظیم) انسان کے حضور میں عریضۂ نیاز پیش کرنے لگیں اور اس امانت کے جو جبلستانِ ارض کو خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (وہ دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے ڈر سے) (48) کا منظر بنانے کے لیے کافی تھی، نشر وطبع کا بار سنبھالنے کے لیے مستعد نظر آنے لگیں۔ لیکن ..... ؎

یہ ''رُتبۂ'' بلند ملا جس کو مل گیا
ہر ''بوالہوس'' کے واسطے دار و رسن کہاں (49)

(مولوی مجید حسن کی سعادت اور خوش بختی)

قدرتِ کاملہ کا یقین اس وقت ہوتا ہے جب کہ انسانی ارادے تارِ عنکبوت (مکڑی کے نازک جال) کی طرح ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' کی سعادت اور خوش بختی نے ہنگامۂ انتخاب میں پہلے ہی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ شاید روزِ ازل ہی میں یہ مقدر ہوچکا تھا کہ ہندوستان کے تاج المفسرین کا یہ سرمایۂ گراں اَرز (مہنگی قیمت کا سرمایہ)، اس سعید شخص کی امانت میں دیا جائے گا۔ اور انھی خوش نصیب ہاتھوں کے ذریعے یہ گوہرِ شاہوار مسلمانانِ ہند کو لٹائے جائیں گے۔

تقدیر کی رہنمائی نے 1923ء کے وسط میں دیوبند پہنچا دیا اور حضرت شیخ الہندؒ کے وارثانِ نیک سیرت سے یہ دولتِ لازوال حاصل کی۔ 28/ جون 1923ء کو مولوی مجید حسن صاحب نے جملہ اُمورِ رسمیہ سے فراغت حاصل کرکے توکُّلاً علی اللّٰہ (اللہ پر توکل کرتے ہوئے) انطباع وکتابت کی اہم ترین ابتدا کردی۔ کامل ڈھائی سال کی محنتِ شاقہ اور دل فریب نشیب وفراز کے بعد

فروری 1926ء کے اختتام پر یہ روزِ سعید دیکھا کہ ترجمۂ قرآن کریم کی آخری کاپی بفضلہٖ تعالیٰ زینت دہ مجلّہ مظہرہ ہوئی۔

(ترجمۂ قرآن کی اس اشاعت کی طباعتی خصوصیات)

اللہ، اللہ! دامانِ نظر کی موج پیمائیاں کہ سرور و بہجت کے سمندر میں محو جلوہ آرائی ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں! گلکار سرورق جس پر قوس قزح نثار، مطلاّ و مشجّر شگوفہ کاری جس پر بہارِ بے خزاں صدقے۔ سبحان اللہ! یہ نظر فریب جلد، یہ دیدہ زیب تحریر، خط نسخ کا یہ نمونۂ کمال، نستعلیق کا یہ حسن و جمال، حِنائی زمین اور نُقرئی جبیں، پختہ روشنائی، مجلّا و منوّر کاغذ، واضح اور روشن الفاظ، بے ساختہ اور حسین حروف، بہترین نشست، اعلیٰ ترتیب، بلند مرتبہ مناسبِ نظم —صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ — ان ظاہری خوبیوں، آراستگیوں اور باصرہ نوازیوں کے ساتھ، ترجمہ کی روانی، سلاست اور بے ساختہ پن تحت اللّفظی التزامِ ممتنع، صحت و سند، پُر معارف و حقائقِ معنویت، شانِ رہنمائی و جمالِ ایقان، فوائدِ بالغہ کی حاشیہ آرائی، قرآنی غوامض و حقائق کی شرحِ مکمل، نورٌ علیٰ نورٍ کا مصداق۔ خوش نصیب ہیں وہ مسلمان جو اس ترجمہ کو پڑھیں، غور کریں اور عمل کریں۔ سعید ہیں وہ ہاتھ، جنھوں نے اس کی اشاعت کی اور تبلیغِ حقہ کی خدمت انجام دے کر سرخروئی دارین (دنیا و آخرت کی کامیابی) حاصل کی۔

(ناشر اور طابع کے لیے دعائے خیر)

یا ربّ العالمین! جب تک تیری دنیا میں توحید کے ڈنکے بجتے رہیں، جب تک تیری خلقت میں حق اور باطل کی تمیز باقی رہے، جب تک تیری دنیا میں وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ (50) (اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا) کی شانِ جمالی کا ظہور ہوتا رہے، جب تک تیری آغوش اُن نفوسِ قدسیہ کو نوازتی رہے، جو تیری راہ میں مٹ گئے ہیں، جب تک تیرا کلام غیر فانی تیری حفاظت و سرپرستی کا مستحق رہے، یا اللہ اس وقت تک ہم کو تبلیغِ حق و اشاعتِ صداقت کی اہلیت عطا فرما اور حضرت مخدومنا و سلیتنا فی الدّارین مولانا شیخ الہندؒ کی روح پرفتوح کو اپنی قُربت سے سعید فرما۔ اور مالک اخبار مدینہ مولوی مجید حسن کو اپنے دَربارِ دُربار سے انعامات فراواں بخش، جس کی محنتوں اور کاوشوں نے ہم تہی مایوں تک یہ سرمایہ دارین پہنچایا۔

ربّنا إهدنا الصّراط المستقيم، ربّنا فاغفرلنا و ارحمنا، ربّنا فانصرنا علىٰ القوم الكافرين.

فقیرِ بے نوا نیاز آگیں، احقر بدر الحسن جلالی مراد آبادی، مدیر مدینہ اخبار بجنور

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن مجید کی اوّلین اشاعت پر حضرات علمائے کرام و مشائخ عظام کی آرائے گرامی

(مولانا مجید حسن نے جب حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن حکیم کی اشاعت کا آغاز کیا تو پہلے ایک پارے کے ترجمے کی کتابت اور صفحات کی تزئین و آرائش کے ساتھ ایک جز تیار کرایا۔ حاشیے پر حضرت شیخ الہندؒ کے فوائدِ تفسیر یہ بھی کتابت کروائے۔ جہاں حضرت شیخ الہندؒ کے فوائد نہیں تھے، وہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے فوائدِ

موضح القرآن کے نمونے کے چند صفحات بھی کتابت کروائے گئے۔ پھر اُسے مختلف حضرات علمائے کرام کی خدمت میں ارسال کیا، تاکہ وہ اس پر اپنی آرائے گرامی اور تقاریظ تحریر فرمائیں۔ چناں چہ درج ذیل حضرات نے اس پر مولانا مجید حسن کے نام خطوط لکھ کر اپنی آرائے گرامی تحریر فرمائیں۔ بعد میں چھپنے والے ایڈیشنز میں مولانا محمد مجید حسن ان آرا کے شروع میں لکھتے ہیں: ''حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے بے مثال ترجمۂ قرآن مجید کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۴ھ مطابق 1925ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کے حواشی بھی حضرت شیخ الہندؒ ہی کے قلم سے تھے۔ باقی پورے قرآن شریف کے حواشی حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے تھے۔ ذیل میں جو رائیں درج کی جاتی ہیں، اسی پہلے ایڈیشن سے متعلق ہیں''۔ مرتب)

(1)

جامع الشریعت والطریقت، فخر المحدّثین مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ [51] کی رائے

''نفسِ ترجمہ کے متعلق حضرت مترجم (حضرت شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کی طرف نسبت کے بعد، کسی مزید توصیف و توضیح کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے کہ ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ دیو بندی کا ہے۔ مولانا (شیخ الہندؒ) کا **جامعُ العُلُوم، کَنزُ العُلُوم، بَحرُ العُلُوم** ہونا ہر شخص پر روشن ہے۔ اسی وجہ سے اس ترجمے کی طباعت سے پہلے ہی شائقین سراپا انتظار ہیں۔

البتہ وہ خاص اہتمامات جو حضرت مؤلفؒ نے اس ترجمے میں فرمائے ہیں اور مقدمہ ترجمہ میں مختصراً ذکر فرمایا ہے، اجمالاً ان کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ وہ خاص اہتمامات یہ ہیں:

(1) ترجمہ سلیس و مطلب خیز و بامحاورہ۔

(2) خللِ لفظی و معنوی سے محفوظ۔

(3) مشہور اور مستعمل الفاظ کا خاص طور سے لحاظ فرمایا ہے۔

(4) ان اَغلاط سے مُبَرّا (پاک ہے)، جو آزادی پسند لوگوں کے ترجمے سے عوام میں پھیل گئے ہیں۔

(5) اس ترجمے کا ماخذ حضرت شاہ عبدالقادر (دہلوی) صاحبؒ کے ترجمے کو فرمایا اور گویا اسی کی واضح شرح فرمائی ہے۔

(6) ترجمے میں (اُردو) محاورہ کا اہتمام فرماتے ہوئے محاورات کو ترجمے کے تابع فرمایا ہے، نہ یہ کہ ترجمے کو محاورات کے تابع کر کے خواہ مخواہ محاورات کا اضافہ کیا ہو۔

(7) باوجود اہتمامِ محاورہ کے ترتیبِ قرآنی کی بقا کا حتیٰ الوسع اہتمام فرمایا ہے۔

(8) حواشی پر شاہ صاحبؒ کے ''حواشی موضح القرآن'' کی تفصیل و توضیح کما حقہ فرمائی ہے۔

(9) موضح القرآن کے علاوہ مستقل حواشی مفیدہ ضروریہ کا بھی اہتمام فرمایا ہے۔

(10) حواشی پر مختصراً اختلافِ علما کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ چوں کہ فوائد اس کثرت اور استقلالِ عبارت کی وجہ سے مستقل

ہو گئے ہیں، اس لیے ان فوائد کا نام ''موضح الفرقان'' تجویز فرمایا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ان سب کے علاوہ مولانا مجید حسن صاحب کی قدر دانی نے، جو اس ترجمے کے ظاہری حسن کو دوبالا کر دیا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا نے جس قدر زرِ کثیر اس کی خریداری و اہتمامِ طباعت میں صَرف کیا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

(2)

قدوۃ العلما، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی رائے گرامی

جناب (مولانا مجید حسن) کے مُرسَلہ (ارسال کیے ہوئے) پارۂ اوّل مترجم بہ ترجمہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر بے اختیار جناب کی عالی ہمتی اور جاں فشانی پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خط نسخ (عربی خط) اور خط نستعلیق (اُردو خط) دونوں میں جو حُسن اور صفائی موجود ہے، وہ اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ صحتِ الفاظ، حسنِ طبع، پائیداری و خوب صورتیٔ اوراق، طرزِ تزئین وغیرہ کو بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر پاتا ہوں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ جناب نے نہایت دریا دلی اور اولوالعزمی سے کتاب اللہ کی خدمت انجام دینے کا ارادہ فرما لیا ہے۔

خداوندِ کریم آپ کو دارین (دونوں جہانوں) میں جزائے خیر عطا فرمائے اور آپ کے لیے یہ مقدس خدمت ہمیشہ ہمیشہ صدقہ جاریہ بنی رہے۔ آمین! میں اُمید کرتا ہوں کہ جملہ اجزائے قرآن شریف انھی محاسن کے ساتھ مُتّصِف ہو کر بہت جلد منصۂ ظہور (منظرِ عام) پر جلوہ گر ہو جائیں گے۔ ع

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ''تو'' (52)

(تمھاری اس ہمتِ مردانہ پر آفرین ہو)

(3)

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا مکتوبِ گرامی

مکرم بندہ سلمہ! السّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ!

اوّلاً: عنایت نامہ، ثانیاً: پارہ الم مع نمونہ اشتہار قرآن مجید مترجم بہ ترجمہ حضرت اُستاذی (شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ) قدّس اللّٰہ سرّہٗ پہنچ کر موجبِ مسرت و مِنّت ہوا۔ آپؒ نے حسنِ ظن سے مجھ کو اظہارِ رائے کا امر فرمایا ہے، مگر غالباً آپ کو حضرتؒ کا اور میرا تعلق معلوم نہیں، یا اس وقت ذہن میں نہیں رہا، ورنہ میرے لیے ایسی جسارت کو تجویز نہ فرماتے۔

مجھ کو حضرتؒ سے جو تعلق ہے (جس کا نام تلمذ ہے)، وہ علوم میں محض تقلید کا ہے، نہ کہ تنقید کا۔ اور رائے اس شخص کی معتبر ہے، جس کو حقِ تنقید ہو، ورنہ مقلد کا کچھ کہنا قطع نظر اس کے خلاف مقتضائے (بقول شیخ سعدی شیرازیؒ) ع

باوجودش زِ من آواز نیاید کہ منم (53)

(اس کے ہوتے ہوئے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کچھ ہوں)

ہونے کے سبب سوءِ ادب (بے ادبی) ہے۔ (مثنوی معنوی کے) اس مضمون کا مصداق ہے ؎

مادحِ خورشید مدّاحِ خود است
کہ دو چشمم روشن و نامُرمد است (54)

(سورج کی تعریف کرنے والا خود اپنی تعریف کر رہا ہوتا ہے
کہ میری دونوں آنکھیں روشن ہیں اور صحیح سالم ہیں)

(نیز مثنوی معنوی میں مولانا رومؒ نے کہا ہے:)

ایں ثنا گفتن زِ من ، ترکِ ثنا ست
کاین دلیلِ ہستی و ہستی خطا ست (55)

(میری طرف سے اُن کی تعریف کرنا ، دراصل تعریف نہ کرنا ہے
کہ یہ اپنی ہستی کی دلیل ہے اور ہستی خطا ہے)

(4)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی رائے گرامی

''حق تعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ جس چیز کی آرزو مدتوں سے دلوں میں پنہاں تھی، وہ آج مولوی مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور کی عرق ریزی اور مالی قربانی سے منصۂ شہود (منظرِ عام) پر بہ صد آب و تاب جلوہ گر ہو رہی ہے۔

یعنی حضرت الاستاذ العلامہ سیّد الطائفہ شیخ الہند مولانا الحاج المولوی محمود حسن صاحب عثمانی دیوبندی — **قُدِّس سرُّہٗ و نُوِّر ضریحُہ** — کا ترجمۂ قرآن، جس کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے شغف کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مالٹا جاتے وقت جس وقت جہاز کو ایک سخت خطرہ لاحق ہوگیا تو آپ نے تمام سامان سے قطع نظر کر کے صرف ترجمے کے مسودے کے اوراق ہمارے بھائی اور حضرتؒ کے رفیق خادم مولوی عزیز گل صاحب کے سینے سے باندھ دیے کہ شاید کوئی صورت بچاؤ کی نکل آوے اور یہ اوراق ضیاع (ضائع ہونے) سے بچ جائیں۔ وہ آج مولوی مجید حسن صاحب کی سعی اور جاں فشانی سے بہ کمالِ حسن و خوبی مشتاقوں کی آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور بن رہا ہے۔

ترجمے کی نسبت میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں قرآن کے جو تراجم موجود ہیں، شاید ہی کوئی (ترجمہ) ہوگا جو نہایت صحیح اور مستند ہونے کے باوجود اس قدر موجز (مختصر)، پُرمغز، شگفتہ اور نظمِ قرآن کی پوری پوری رعایت کرنے والا ہو''۔

(5)

حضرت مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقی [56] تلمیذ حضرت شیخ الہندؒ و امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ سابق شیخ التفسیر جامعہ ملیہ دہلی و اسلامیہ کالج لاہور کی رائے گرامی

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کو یہ اوّلین فخر حاصل ہے کہ انھوں نے اس ظلمت آباد ہند میں ''ترجمۃُ القرآن'' کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو پھر اس چشمۂ حیات کی طرف لے آئے جو عربی سے ناواقف ہونے کی بناء پر اللہ کی کتاب سے بُعد و ہجر (دوری) اختیار کرچکے تھے۔ اس کے بعد ان کے سایۂ روزگار فرزندِ سعید حضرت شاہ عبدالقادر (دہلویؒ) نے اس کو اُردو کا جامہ پہنا کر بقائے دوام کا زرّیں تاج اپنے سر پر رکھا۔ اور یہ بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے آج سرزمینِ ہند میں قرآن کریم کے جس قدر تراجم ملتے ہیں، سب کے سب اسی ''موضح القرآن'' کے خوشہ چیں ہیں۔

اس ترجمے پر پوری ایک صدی گزر چکی تھی۔ (اُردو) زبان میں صدہا تغیرات رونما ہوچکے تھے، باوجود یہ کہ شاہ عبدالقادر (دہلویؒ) کا ترجمہ (موضح القرآن) اپنے وقت کی ٹکسالی (اُردو) زبان میں تھا، مگر اب مرورِ زمانہ اور محاورے کی تبدیلی کی وجہ سے وہ عَسیرُ الفَہم (سمجھنا مشکل) ہوگیا تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اسی ترجمے میں ایسی مناسب اصلاح کردی جائے، جو باوجود تحتُ اللّفظ (لفظی) ہونے کے ایک حد تک بامحاورہ ہوجائے۔ اس کے سمجھنے میں کسی کو دِقّت نہ ہو اور اس کے ساتھ ان عقائد و یقینیات پر کوئی زد نہ پڑے، جو اصل و اَساسِ اسلام ہیں۔

خداوندِ قدوس نے اپنے کام کے لیے ہمیشہ مخصوص افراد کو چن لیا ہے، جو اس کا دستِ عمل بن جاتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن — رضی اللّٰہ عنہٗ — ان عظمائے رجال (بڑے آدمیوں) اور ائمۂ اِسلام میں سے ہیں، جن کی تمام زندگی کتاب و سنت کے درس و مطالعہ اور اُن کے اَسرار و معارف کی نشر و اشاعت میں گزری اور ان کا جب خاتمہ ہوا تو خدمتِ ملک و ملت اور ترجمۃُ القرآن پر ہوا۔

حضرت مولانا الامام (شیخ الہندؒ) کے ترجمے کا پہلا پارہ میرے زیرِنظر ہے اور وہ یقیناً اُن تمام نقائص سے پاک ہے، جنھیں ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ سلیس اور بامحاورہ ہونے کے ساتھ ساتھ تحتُ اللّفظ (لفظی ترجمہ) بھی ہے۔ اس لیے ہر شخص اس سے پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حواشی نہایت معنی خیز اور بصیرت افروز ہیں۔ ان کے پڑھنے سے نہ صرف ربطِ آیات پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ نہایت ہی مشکل اور عَسیرُ الفَہم (مشکل سمجھے جانے والے) مطالب آسانی اور سہولت سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ لطیف و دل آویز طریق سے بعض جگہ اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے کہ فوراً ذہن نشین ہوجاتا ہے۔

(6)

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ [57] کی رائے گرامی

شیخ الہند مولانا محمود حسن مغفور کی علمی عظمت یقیناً میری مُعرِّفی (تعریف کرنے) کی محتاج نہیں۔ ان کے ترجمۂ قرآن پر مجھ

جیسے جاہل کا اظہارِ رائے کرنا بڑی ہی گستاخی ہے، تاہم امتثالِ امر (حکم کو پورا کرنے) میں مجبوراً چند لفظ عرض کرنے پڑتے ہیں۔

پارۂ اوّل کے ترجمے کو مع حواشی کے میں نے دوسرے مشہور تراجم کے ساتھ جا بہ جا مقابلہ کرکے پڑھا اور پڑھنے کے بعد شیخ الہند مغفور کی نکتہ وَری کی داد دِل سے بے اختیار نکلی۔ خدا کے کلام کا بالکل صحیح ومکمل ترجمہ کسی بندہ کا کام نہیں۔ خدا کے الفاظ کو جب کبھی انسان اپنی عبارت میں ادا کرے گا تو معنی ومفہوم کے کچھ نہ کچھ پہلو یقیناً نظر انداز ہوجائیں گے۔

تمام معانی ومطالب کی جامعیت محض قرآن ہی کا اعجاز ہے اور اس اعتبار سے اس کی ہر شرح، ہر تفسیر، ہر ترجمے کا ناقص رہ جانا ناگزیر ہے۔ تاہم خدائے کریم اپنے فضل وکرم سے اپنے بعض بندوں کا شرح صدر فہمِ قرآنی کے لیے کردیتا ہے۔ اور ان کے قلوب میں ایک ملکۂ راسخہ پیدا کردیتا ہے، جس سے وہ معانی ومطالبِ قرآنی کی بہت ہی گہرائیوں تک پہنچ جاتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں کو قرآن فہمی میں بہت کچھ مدد دے سکتے ہیں۔

شیخ الہند مغفور کا شمار بھی انھیں بندگانِ حق میں تھا۔ پس ان کا ترجمہ قدرتاً اس معیار پر پورا اُترتا ہے۔ فارسی اور اُردو میں بعض اچھے ترجمے پیشتر (پہلے) سے بھی موجود تھے۔ یہ جدید ترجمہ ان کی بہت سی خوبیوں کا جامع ہے اور بعض حیثیات سے ان پر اضافے کا حکم رکھتا ہے۔ خدائے قدوس اُمتِ اسلامیہ کو اس سے مستفید ہونے کی سعادت نصیب کرے۔

(7)

مولانا نصراللہ خاں [58] (معاون مدیر اخبار ''مدینہ'' بجنور) کی رائے گرامی

فخرُ المُحدِّثین، إمامُ العارِفین، شیخُ المُسلِمین، حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ترجمہ قرآن مجید میری نگاہ میں اتنا بلند پایہ اور عالی مرتبہ ہے کہ اس پر اظہار کرنے کے لیے بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سے علم وفضل اور بصیرتِ دینی کی ضرورت ہے۔ قطع نظر اس لاجواب خوبی اور حُسنِ ترجمہ کے جو بہ یک وقت تحت لفظی اور بامحاورہ ہونے کے باعث اسے حاصل ہے۔ اس ترجمے کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان باریک نکاتِ تفسیر کو لفظوں میں ادا کردیا ہے، جن کو سمجھ لینے کے بعد بھی مستقل فوائد کی ضرورت ہوتی۔ عربی زبان کی کثیر النوع خوبیاں ترجمے میں **بِجِنسِها** (پورے طور پر) پیش کردینا صرف اسی قادر الکلام اور ماہر علومِ شرعیہ کا کام تھا۔

(8)

مولوی محمد حسین لاہوری کی رائے

ترجمہ اور فوائد مطالعہ کیے۔ اللہ اللہ! کس حسنِ انتظام واہتمام سے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ ترجمہ اور فوائد کے متعلق میرے ایسے ہیچ مداں کا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ جہاں جانشین حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ سیّدنا مولانا حسین احمد صاحب مہاجر مدنی کے ایسے علامۂ دہر اور حکیم الامت جیسے یکتائے روزگار خاموش ہوں، وہاں میرا منہ کھولنا اپنی کم علمی اور بے

بضاعتی پر دَالّ (دلالت کرتا) ہے۔ ہاں! البتہ اس کے ظاہری محاسن، دل فریب طباعت اور خوش رنگی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ایسا خوش نما اور دیدہ زیب قرآن مجید آج تک ہندوستان میں طبع نہیں ہوا۔

غرض! یہ کہ ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔ اور آپ یقیناً تمام اسلامی ہند کے بے حد شکریے کے مستحق ہیں کہ آپ نے حضرت مولانا ممدوح (حضرت شیخ الہندؒ) کی اس نعمتِ عظمیٰ اور دولتِ کبریٰ کو برادرانِ اسلام تک اس کی شایانِ شان حالت میں پہنچایا۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور آپ کے اِرادوں میں برکت عطا فرمائے۔ آمین!

(9)

مولوی محمد شفیع (ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) کی رائے

آپ کے مرسلہ ترجمے کو آج میں نے دیکھا۔ نہایت دل کش چھپائی ہے اور تقطیع بھی موزوں ہے۔ آج میں نے ترجمے کو خوب غور سے پڑھا۔ بہترین ترجمہ ہے اور حاشیے پر نہایت مفید مضامین درج ہیں۔

(10)

سیّد جالب دہلوی [59] (ایڈیٹر اَخبار ''ہمدم'' لکھنؤ) کی رائے

ہمیں ایک پارۂ کلامِ مجید مترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ — مطبوعہ مدینہ پریس بجنور — برائے اظہارِ رائے موصول ہوا ہے، جس کی کتابت و طباعت ہندوستان میں لیتھو چھپائی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہم مولوی مجید حسن صاحب مالک مدینہ پریس کو مبارک باد دیتے ہیں، جنھوں نے اس محنت و جاں فشانی اور صَرفِ زرِ کثیر سے یہ قابلِ قدر تحفہ برادرانِ اسلام کے سامنے پیش کیا ہے۔ ترجمے کے متعلق ہماری طرف سے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ حضرت شیخ الہندؒ کا وہی ترجمہ ہے، جس کے لیے سارے ہندوستان کی نگاہیں چشم بہ راہ تھیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کا نام نامی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ اس ترجمے پر ہر اعتبار سے اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ جس سلاست و سہولتِ زبان کے ساتھ تحت اللفظ صحیح ترجمے کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور دیگر تراجم سے کئی پہلو سے قابلِ ترجیح ہے، اس ترجمے کے ساتھ حاشیے پر ''فوائد موضح القرآن'' اس کے فوائد کو دوبالا کرتا ہے۔ ایسے گراں قدر صحیفے کے لیے طباعت میں اسی اہتمام کی ضرورت تھی، جس کا کارکنانِ مدینہ پریس نے اظہار کیا۔ اس نسخے کی اشاعت کے بعد یقیناً یہ اندازہ کیا جاسکے گا کہ ہندوستان میں لیتھو کی چھپائی کو کس حد تک ترقی دی جاسکتی ہے۔ لوح کے نقش و نگار، مختلف رنگوں کا میلان، فاتحۃ الکتاب کے صفحے کی آرائش اور متن کی شانِ کتابت، یہ تمام باتیں فنِ طباعت کی بہترین خصوصیات کا نمونہ ہیں۔

www.rahimia.org

(11)

سیٹھ یعقوب حسن (60) (ممبر لیجسلیٹو اسمبلی، مدراس) کی رائے

یہ میری گستاخی ہوگی اگر میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ (کے کیے ہوئے ترجمہ قرآن) پر رائے زنی کرنے کی جرأت کروں۔ قرآن کریم کے تمام اُردو تراجم پر اس ترجمے کی فوقیت اظہر من الشّمس ہے۔ اس کے مستند اور صحیح ہونے میں کس کو کلام ہوسکتا ہے؟ باوجود اس کے کہ تحت لفظی ہے، مگر مولانا (شیخ الہند) علیہ الرحمۃ کی اعلیٰ قابلیت نے سر رشتۂ سلاست کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

طباعت کی صحت، خوش نمائی اور پاکیزگی کے لیے آپ کی ہمت اور کوشش قابلِ صد مبارک باد ہے۔

ترجمہ شیخ الہندؒ مع حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ''فوائدِ تفسیریہ'' کی اشاعت پر

حضرات اکابر علما کی آرائے گرامی

(ترجمۂ شیخ الہندؒ مع حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ''فوائدِ تفسیریہ'' کی پہلی اشاعت ۱۳۵۵ھ / 1936ء پر مولانا مجید حسن نے یہ نوٹ تحریر کیا تھا: ''قرآن پاک مترجم و محشّٰی از شیخ المشائخ حضرت مولانا محمود حسنؒ (شیخ الہند) و زُبدۃ المفسّرین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی۔ اس قرآن پاک میں ترجمہ تو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیرِ مالٹاؒ کا مکمل ہے اور اُن کی تفسیر بہ قدر چار پاروں کے ہے۔ باقی ۲۶ پاروں کی تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے قلم سے ہے۔ اس ترجمہ اور تفسیر کی حقیقت مروّجہ تراجم اور تفاسیر کے مقابلے میں ستاروں میں درخشاں چاند جیسی ہے۔ ہندوستان کے مقتدر علما اور دوسرے علم دوست اصحاب نے بے انتہا پسند کیا ہے۔ 1926ء سے اب تک ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوچکا ہے اور ملک میں بہ کثرت اس کی مانگ ہے۔ لکھائی، چھپائی بے مثل ہے''۔

اس نوٹ کے بعد پہلی اشاعت کے موقع پر حضرات علما کی آرا درج کی گئی ہیں۔ پھر ''فوائدِ تفسیریہ'' از حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ پر حضرات علمائے کرام کی درجِ ذیل آرا شائع کی گئیں۔ مرتب)

(1)

مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ (61) کی رائے گرامی

مکرمی و محترمی جناب مولانا محمد مجید حسن صاحب دام مجدہم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

قرآن مجید مترجمہ بہ ترجمہ سیّدی مولائی حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز و محشّٰی بہ ''فوائدِ تفسیریہ'' مؤلفہ افضل المفسّرین

مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی مَدَّ فُیُوضُہم پہنچ کر موجبِ امتنان ہوا۔ حضرت مترجم — طاب اللّٰہ ثراہ (اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کی مٹی کو تر و تازہ رکھے) — کے ترجمے کے متعلق کچھ کہنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔

''فوائدِ تفسیریہ'' کے متعلق اس قدر عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ معارفِ قرآنیہ کو اُردو زبان میں اس خوبی، خوش نمائی، شگفتگی، متانت، سلاست، فصاحت، بلاغت کے ساتھ منصۂ شہود پر لانا حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی ہی کا حصہ تھا۔

آپ کی سعی مقبول ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل و کرم نے مولانا موصوف کے قلم حقیقت رقم سے معارف وحِکمِ قرآنیہ کا یہ بیش بہا ذخیرہ اہلِ ہند کے لیے مہیا فرما دیا۔ میں خلوصِ دل سے آپ کو اور حضرت مولانا (شبیر احمد عثمانی) کو اس دینی خدمت کی انجام دہی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ تقطیع مناسب، خط موزوں، وضع تحریر خوش نما اور دل پسند ہے۔

جزاکم اللّٰہ و شَکَر مساعیکم، و نفع المسلمین بہ نفعًا کثیرًا، آمین!

(اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے اور مسلمانوں کو اس سے بہت زیادہ نفع پہنچائے۔)

فقیر: محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ، دہلی

(2)

حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ جانشینِ حضرت شیخ الہندؒ کی رائے گرامی

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے علامۂ زماں، محققِ دوراں، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی زید مجدہم کو دنیائے اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا ہے۔ مولانائے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب و غریب حافظہ، عجیب و غریب تبحُّر وغیرہ کمالاتِ علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص منصف مزاج ان میں تأمُّل کر سکے۔ جن حضرات کو مولانا سے کبھی بھی کسی قسم کے استفادہ کی نوبت آئی ہے، وہ اس سے بہ خوبی واقف ہیں۔

ان ازمنۂ أخیرہ (آخری زمانے) میں حسبِ وعدۂ ازلیہ

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ (62)

(ہم نے آپ اُتاری ہے یہ نصیحت اور ہم آپ اس کے نگہبان ہیں۔)

اور ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿ؕ۱۹﴾ (63)

(پھر مقرر ہمارا ذمہ ہے اُس کو کھول کر بتلانا۔)

قدرتِ قدیمہ نے جس طرح امام الائمہ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ العزیز کو بامحاورہ ترجمۂ قرآن کی طرف متوجہ فرما کر اصلاحِ عباد کے لیے عظیم الشان سامانِ ہدایت مہیا فرما دیا تھا، اسی طرح اس کے بعد مولانا شبیر احمد صاحب موصوف کی توجہ تکمیل فوائد اور ازالۂ مُغلَقات (مشکلات کے حل) کی طرف مُنعَطِف (متوجہ) فرما کر تمام عالمِ اسلامی اور بالخصوص اہلِ ہند کے لیے عدیم النّظیر (بے مثال) حُجّۃِ بالغہ (پختہ دلیل) قائم کر دی ہے۔ ان حواشی اور مہتمّ بالشان فوائد سے نہ صرف ترجمۂ مذکورہ میں چار

چاند لگ گئے ہیں، بلکہ ان بے شمار شکوک وشبہات کا بھی قلع قمع ہوگیا ہے، جو کہ کوتاہ فہموں کو اس کتاب اللہ اور دینِ حنیف کے متعلق پیش آتے رہتے ہیں۔ یقیناً مولانا نے بہت سی ضخیم ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندروں کو کوزے میں بھر دیا ہے۔

پھر مولانا مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' کی مساعیٔ جمیلہ اور حسنِ توجہ نے وہ خوبیاں اس میں اضافہ فرما دی ہیں، جو کہ سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہیں۔ اس نسخے کی تمام خوبیاں صرف دیکھنے اور غور کرنے پر معلوم ہوسکتی ہیں۔ تحریر اور تقریر اس پر پوری روشنی ڈالنے سے عاجز ہے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ شائقینِ علومِ صادقہ جلد تر اِس نسخۂ عجیبہ سے استفادہ کر کے اپنے دل و دماغ کو منور فرمائیں گے۔

ننگِ اسلاف: حسین احمد غفرلہٗ، خادم العلوم، دارالعلوم دیوبند

(3)

حضرت مولانا خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کی رائے

حضرت شیخ الہند مرحوم نے قرآن پاک کا جو ترجمہ اُردو میں کیا تھا اور جس کے طبع و اشاعت کی توفیق اللہ تعالیٰ نے مولانا مجید حسن صاحب کو عطا فرمائی تھی، وہ قریب قریب حواشی کے بغیر تھا۔ وہی مترجم قرآن پاک پھر طبع کیا گیا ہے، مگر اس مرتبہ اوّل سے لے کر آخر تک سب جگہ حواشی ہیں۔ توضیحات ہیں اور تشریحیں ہیں۔

یہ تمام تر اس بزرگ کے فیوض و برکات کا نتیجہ ہے، جو آج ہندوستان میں بلا ریب (بلاشبہ) سرتاجِ مفسرین اور قرآنی حِکم و بصائر کے سب سے بڑے واقف مانے جاتے ہیں، یعنی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے اپنے قلمِ حقیقت رقم سے ایک طرف بلاغتِ قرآن کے دریا بہا دیے اور دوسری جانب معارفِ فرقانی کے انمول موتی اوراق پر بکھیر دیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا مدظلہم کو عمرِ جاودانی عطا فرمائے کہ فرزندانِ اسلام کو آپ سے دیر تک مستفید ہونے کا موقع ملے۔ میں حضرت مولانا کی اس خدمتِ سعید پر مبارک باد دیتا ہوں اور مولانا محمد مجید حسن کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مسلمانوں کو ان بے بہا خزائن سے فائدہ پہنچانے کی سعی و کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید حسنِ عمل کی توفیق دے۔

عبدالحیٔ استاذِ تفسیر (ناظم دینیات جامعہ ملیہ، دہلی)

(4)

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ [64] ناظم جمعیت العلما ہند کی رائے

محترمی جناب مولانا محمد مجید حسن صاحب زاد اللہ مجدکم، السلام علیکم!

آپ کا مطبوعہ قرآن شریف فقیر کو پہنچا۔ شکریہ! جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کا تعلق ہے، اس کے متعلق تو کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمے میں محاورے کی جو رعایتیں رکھی ہیں اور جس خوبی کے ساتھ حضرت مولانا

شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ کے ترجمے میں مناسب تبدیلی فرمائی ہے، اس کے حُسن کی تعریف تو مجھ جیسے بے بضاعت اور کم علم شخص کی طاقت اور قابو سے باہر ہے۔

اس ترجمے کا مقتضا (تقاضا) یہ تھا کہ اس کے ساتھ ایک مختصر تفسیر بھی ہوتی، جو زمانۂ حال کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ''موضح القرآن'' سے وسیع ہوتی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اس کی سعی فرمائی تھی، جو سوءِ اتفاق سے مکمل نہ ہوئی، لیکن ''کُلّ أمرٍ مرهونٌ بأوقاتِها'' (ہر کام اپنے مقررہ وقت پر ہوتا ہے)۔ آپ کی سعی اور کوشش سے حضرت رئیس المفسّرین مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دامت برکاتھم نے اس ضرورت کو بأحسن الوُجوہ (بہترین طریقے پر) پورا کردیا۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا تبحرِ علمی اور تحریر و تقریر کا خداداد ملکہ محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مدظلہٗ کی یہ مختصر تفسیر جو آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ساتھ شائع کی ہے، بعض اہم اور مشکل مقامات سے میں نے مطالعہ کی ہے اور مَیں بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ معارفِ قرآنیہ اور مسائلِ مُهِمّہ (اہم مسائل) کو جس حسنِ بیان کے ساتھ زبان کی سلاست اور شگفتگی کی رعایت رکھتے ہوئے عام فہم اُردو میں مولاناؒ نے ادا فرمایا ہے، وہ مولانا ممدوح ہی کا حصہ ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے اس حاشیے نے اہلِ علم کو صدہا کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کردیا ہے۔ اُردو زبان میں قرآن شریف کے مطالب کا اس قدر بہترین مختصر، جامع ذخیرہ اس وقت تک فقیر کی نظر سے نہیں گزرا۔ آپ نے اس ذخیرہ کی اشاعت و طباعت میں جو سعی فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مشکور فرمائے اور مولانا کی اس خدمتِ علمی اور کلامِ الٰہی کی تفسیر کو عام مقبولیت حاصل ہو۔ فقیر: احمد سعید کان اللہ لہٗ

(5)

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی رائے

الحمد للّٰه و کفیٰ و سلام علیٰ عباده الّذین اصطفیٰ، أمّا بعد!

نظامِ عالم میں خیر و شر کے دو سلسلے چلے آرہے ہیں۔ انسانوں کی بھی دو قسمیں ہیں: بعض سلسلۂ خیر کی کڑی بنتے ہیں اور بعض سلسلۂ شرّ کی۔ وہ وجود مبارک ہیں، جنھیں سلسلۂ خیر کی کڑی بننے کی توفیق نصیب ہو۔

سلسلۂ خیر کے غیر متناھی (ختم نہ ہونے والے) مدارج ہیں اور سب سے اعلیٰ و افضل درجۂ خیر، یہ ہے کہ اشاعتِ قرآن حکیم کی توفیق عطا ہو۔ چناں چہ ارشادِ نبوی — علیٰ صاحبه الصّلوٰة و السّلام —:

''خیر کم من تعلّم القرآن و علّمه'' [65] (تم میں سے بہتر وہ ہے، جو قرآن سیکھائے اور اُسے سیکھے۔)

اس پر شاہد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے احیائے دین کی جہاں اور بہت سی خدمات لیں، وہاں آخر عمر میں اسیرِ مالٹا بنا کر خلقُ اللّٰہ (اللہ کی مخلوق) کے اِزدحام (بھیڑ) سے چھڑوا کر تخلیہ (تنہائی) میں بٹھایا اور ''فرقانِ حمید'' کا بہترین ترجمہ کروایا۔ سورت البقرہ اور سورت النساء کے حواشی بھی لکھوائے۔

خدائے قدوس وحدہٗ لاشریک نے اس بابرکت اور مقبول ترین ترجمے اور حواشی کی اشاعت کے لیے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں سے مولانا محمد مجید حسن مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور کو انتخاب فرمایا۔ حال آں کہ حضرت شیخ الہندؒ کے متوسلین میں ہزاروں آدمی ایسے نکل سکتے تھے، جو اس خدمت کو انجام دیتے، مگر ؎

این سعادت بہ زورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس سعادتِ عظمیٰ کے عطیے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی کمائی باعثِ قبولیتِ بارگاہِ الٰہی ہے۔ مولانا ممدوح نے پہلے تو حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ بڑی تقطیع کے قرآن پر شائع فرمایا۔ بعد ازاں مولانا موصوف کی فرمائش پر علامہ دوراں رئیس مفسرینِ زماں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دامت برکاتھم نے بقیہ چھبیس پاروں کے حواشی مرتب فرمائے۔ وہ حواشی ایک مختصر مگر جامع تفسیر ہیں، جو باوجود اختصار کے تمام تفاسیر کی ضخیم جلدوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب دام مجدھم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے، جنھوں نے محنتِ شاقہ برداشت فرما کر مضامینِ قرآن حکیم کا ایک بہترین نچوڑ تشنگانِ علومِ معارفِ قرآنیہ کے سامنے رکھ دیا۔ آخر میں ہر دو بلند پایہ مصنّفین اور طابع کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں کہ یہ خدمت ان حضرات کے لیے نجاتِ آخرت کا ذریعہ ہو۔ اور سب مسلمانوں کے لیے ذریعۂ ہدایت ہو جائے۔ آمین یا اللّٰہ العالمین! احقر الانام: احمد علی عفی عنہٗ (امیر انجمن خدام الدین لاہور)

(6)

حضرت مولانا سیّد محمد میاںؒ (66)

سابق ناظمِ عمومی جمعیت علمائے ہند کی رائے گرامی

اگر میں کوئی مقدس ترہدیہ اپنے علم دوست عزیز ترین رفیق یا بزرگ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں تو اس کے لیے سب سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب کی تفسیر والا قرآن پاک منتخب کروں گا، جس کو مولانا مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور نے طبع کرایا ہے، کیوں کہ:

(1) یہ ترجمہ اس مقدس بزرگ کا ہے، جو علمائے زمانہ کا سرتاج تھا اور بجا طور پر امامِ محدثین، رأسِ مفسرین، جس نے اسارتِ مالٹا کی معتکفانہ زندگی میں کامل مراقبہ اور مکمل توجہ إلیٰ اللّٰہ کی حالت میں اس کو اِرقام (تحریر) فرمایا ہے۔

(2) صرف یہی ترجمہ، قرآن پاک کے ترجمے کا حق ادا کرتا ہے، یعنی یہ کہ ربّ العالمین اَحکم الحاکمین کے کلامِ مقدس کی صحیح مراد

کو حاصل کر کے اس کو ایسے بجے تلے الفاظ میں ادا کرنا کہ ہر عام و خاص اس سے صحیح روشنی حاصل کر سکے۔

(3) درحقیقت ایک کرامت ہے کہ باوجودیکہ ترجمہ تحتُ اللّفظ (لفظی) ہے، مگر ہر قسم کی اُلجھن سے پاک۔ آپ عموماً ترجموں میں جا بہ جا بریکٹ دیکھیں گے، جن میں مترجم حضرات نے کچھ الفاظ اپنی جانب سے زائد کر کے مراد کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بغیر تو گویا چارہ ہی نہیں ہوتا کہ کلام کو بامحاورہ کرنے کے لیے آیت کے آخری حصے کا ترجمہ اوّل میں کر دیا جائے، یا پہلے ٹکڑے کا ترجمہ آخر میں ہو، لیکن ہر لفظ کا ٹھیٹ ترجمہ اس کے نیچے ہوتے ہوئے کلام کا بامحاورہ اور عام فہم رہنا، صرف اس ترجمے ہی کا کمال ہے، جس کو کرامت کے سوا کسی لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

(4) چوں کہ کتابت میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ لفظ کا ترجمہ اسی لفظ کے نیچے رہے، لہٰذا ایک غیر عربی داں بھی اس ترجمے کی برکت سے عربی الفاظ کا ترجمہ کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔

(5) اس ترجمے کے صحیح اور مستند ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ سیّد عالم، استاذ العلما، مولانا شاہ عبدالقادر (دہلوی) صاحب قدس سرہٗ العزیز کا ترجمۂ قرآن (موضح القرآن) — جو حضرت شاہ صاحب موصوفؒ نے بارہ سالہ طویل اعتکاف کی حالت میں کامل مراقبہ اور کامل غور و خوض کے بعد تحریر فرمایا تھا — جس کے متعلق علمائے ہند کا متفقہ عقیدہ تھا کہ یہ ترجمہ الہامی ہے، جس پر آج تک نہ کوئی اعتراض کیا جا سکا، نہ کوئی نکتہ چینی کی گئی۔ وہ بعینہٖ اس ترجمے کے مطابق ہے۔

(6) اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی صحت پر علمائے اسلام کامل ایک صدی سے متفق ہیں اور یقیناً اس ترجمے کا صحیح خطاب بھی یہ ہی ہوگا کہ ’’حضرت شیخ الہندؒ والا الہامی ترجمہ‘‘۔

(7) یہ ترجمہ اگرچہ بہ ذاتِ خود تفسیر تھا، مگر اس کے مضمون کو پورے طور سے واضح کرنے کے لیے ایک ایسے متبحر عالم نے اس کی تفسیر فرمائی ہے، جس کے متعلق مسلمانانِ ہند کا صحیح علم یہ ہے کہ فہمِ قرآن، غور و فکر اور پھر سلاستِ کلام، دلچسپی تحریر، دل پذیریٔ تقریر میں اپنا نظیر نہیں رکھتا، یعنی شیخنا و استاذنا، مفسرِ اعظم، قاسمِ ثانی، حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی شارح مسلم شریف۔

(8) معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری خوبیوں میں بھی یہ قرآن پاک نظیر و مثال سے بہت بالا ہے۔ خط پاکیزہ، طباعت نہایت صاف، تعریف سے بے نیاز، کاغذ بیش قیمت، وزنی، پائیدار، خوب صورت اور ان سب سے بڑھ کر یہ وثوق (اعتماد) کہ متنِ قرآن کی کتاب غلطی سے پاک۔ خادم محمد میاں عفی عنہٗ

(احد اَرکان التّدریس فی الجامعة القاسمیة الشّاھیه فی مراد آباد)

(7)

حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی رائے

اخبار ’’مدینہ‘‘ کے مالک، سرکارِ مدینہ کے خادم محمد مجید حسن بجنوری پر بے اختیار رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ خدمتِ قرآن کی کیسی کیسی سعادتیں اپنے لیے سمیٹ رہے ہیں۔ کئی سال ہوئے ترجمہ جو چھاپا تو شیخ الہندؒ کا، اب تحشیہ جو شائع کیا تو ان

کے شاگرد اور ایک عالَم کے استاذ، دیوبند کے سابق اور ڈابھیل کے موجودہ شیخ الحدیث کا، وہ (موضحِ فرقانِ حمید ترجمہ از شیخ الہندؒ) ہمیشہ مسلمانوں کے لیے ایک تحفۂ بے نظیر! یہ (فوائدِ تفسیر یہ از مولانا شبیر احمد عثمانیؒ) جدید خیالات والوں کے حق میں اکسیر، ایک اپنے رنگ میں نایاب، دوسرا اپنے طرز میں لاجواب، نقشِ اوّل ایک جلوۂ نور، نقشِ ثانی بلاشائبۂ تکلُّف نورٌ علیٰ نور! رشک نہ پیدا ہو کر رہے تو اَور کیا ہو! ذٰلک فضلُ اللّٰہ الخ.

تفصیلی معروضات کا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی — شارح صحیح مسلم — کے حواشی اگر ایک طرف پُرمغز ہیں اور مسلک اہلِ سنت کے مطابق محققانہ، تو دوسری طرف ضروریات کے موافق ہیں اور حکیمانہ۔ پڑھتے جائیے اور معاندین اسلام کے پیدا کیے ہوئے شبہات کی جڑ از خود کٹتی چلی جائے گی۔ اور اہلِ باطل کی اختراع کی ہوئی کج راہیاں آپ ہی آپ ھَبَاءً مَّنثُورًا (بکھری ہوئی گرد) ہوتی جائیں گی۔ پھر کسی فریق کی دل آزاری ہونا کیا معنی۔ ان کا نام تک نہیں آنے پایا، زبان اور طرزِ بیان نہ خشک، نہ مغلق (پیچیدہ)، نہ مولویانہ، بلکہ عموماً سلیس، شگفتہ، دل کش اور جا بہ جا ادیبانہ۔

شکریہ کے ساتھ شکوہ صرف اتنا ہے کہ وہ جو تقریباً چار پارے حضرت شیخ الہندؒ کے حواشی کے تھے، انھیں مولانا شبیر احمد صاحب نے فرطِ ادب سے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ یوں ہی چھوڑ دیا ہے۔ میں ایسی افراطِ تعظیم کا قائل نہیں۔ ضرورت تھی کہ خود اِن حواشی پر مولانا اپنے قلم سے مزید حواشی کا اضافہ کرتے۔ اس لیے کہ وہ حواشی ایک دوسری دنیا کے لیے تھے اور چھبیس پارے والے حواشی دوسری دنیا کے لیے ہیں۔ استاذ اگر کسی مریض کو دِق (دمہ) کا نسخۂ حاذقانہ (ماہر طبیب کا نسخہ) لکھ گیا ہے اور اب اسے مرضِ ہیضہ لاحق ہو گیا ہے تو شاگرد کا اسی پرانے نسخے پر قناعت کیے رہنا سعادت مندی نہیں، سعادت مندی کا غلو (حد سے زیادہ) ہے۔

دعا ہے کہ ربِّ مجید اپنے بندۂ مجید کی اس خدمتِ مجید کو مرتبۂ قبول عطا فرمائے اور اسے ان کے ازدیادِ مراتب اور اُمتِ اسلامیہ کے رفاہ و فلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین!۔ عبدالماجد دریابادی

(8)

حضرت مولانا اکبر شاہ خانؒ مؤرخ اسلام نجیب آبادی کی رائے

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی علمائے دیوبند میں اپنی قرآن دانی اور ''تدبُّر فی القرآن'' (قرآن میں غور و فکر) کے متعلق جو خصوصیت رکھتے ہیں، اس نے مولانا کو میرا محبوب اور ان کے تصور کو میرے دل کی راحت بنا دیا ہے۔ انھوں نے قرآن مجید کو عام اُردو داں لوگوں کے لیے قریبُ الفَہم (سمجھنے میں آسان) بنانے کی غرض سے مختصر اور جامع و مانع (بھرپور) تفسیر بہ طور حواشی لکھی ہے۔ سلیس و سادہ و فصیح و عام فہم زبان میں آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم و مطالب کو سمجھانے کے لیے ضرورت سے زیادہ عموماً کچھ نہیں فرمایا گیا ہے۔ اور کسی مقام کو لا ینحل (بغیر حل کیے ہوئے) اور تشنۂ تحقیق نہیں چھوڑا گیا۔

کوئی مسلمان گھر اس باترجمہ و باتفسیر قرآن مجید سے بے نصیب نہیں رہنا چاہیے، جس کا ترجمہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ کا رقم زدہ اور تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب کی تحریر فرمودہ ہے۔ اکبر شاہ خاں نجیب آباد

(9)

حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ (67) کی رائے گرامی

الحمد للّٰہ و کفیٰ و الصّلوٰۃ و السّلام علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ، أمّا بعد!

اما بعد! خدائے تعالیٰ کا شکر! دفتر ''مدینہ'' کو دیکھا۔ جناب محترم محمد مجید حسن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اپنی زندگی میں قرآن کا سب سے بڑا اور عظیم الشان کارنامہ نظر سے گزرا۔ اپنے، آپ کے اور سب کے بزرگ، **شیخُ العالَم** حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن مجید، وفوائد عصرِ حاضر کے متبحر عالم، فقیہ، محدث ومفسر، حضرت الاستاذ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی **طال بقائہ** کے تکمیل کردہ فوائد یک بہ یک میرے سامنے آئے۔ میری مشتاق نگاہیں دیر تک وارفتگی کے ساتھ ان سے سعادت اندوز ہوتی رہیں۔

میں کیا! میری علمی بضاعت کیا۔ ایک طرف اپنے شیخ اور استاد کا علمی کارنامہ اور دوسری طرف میری کم مایہ رائے۔ بہرحال دل یہ کہتا ہے کہ دونوں بزرگوں نے سلف صالحین کے ان خزانوں کو جو موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، جامع و مانع شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ حق تعالیٰ جناب مولوی مجید حسن صاحب کو جزائے خیر دے، جنھوں نے ایک بڑے کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا اور اس کی تکمیل میں اب تک ساعی ہیں۔ **و لِلّٰہ الحَمدُ و المنّۃ.**

محمد یوسف بنوری عفا اللہ عنہٗ (مقیم پشاور گڈھی میر احمد شاہ مرحوم)

(10)

حضرت مولانا حکیم محمد مشتاق علی اجڑاڑویؒ کی رائے

ہندوستان کے گزشتہ قرون اُخریٰ میں سب سے پہلے حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے قرآن حکیم کے ترجمے کی ضرورت' الہامِ الٰہی سے محسوس کی اور فارسی میں اپنا عدیم المثال ترجمہ مرتب کیا، جس کو آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اور اس درمیان میں اب تک قرآن حکیم کے بہت سے تراجم ہو چکے ہیں، لیکن پھر بھی ایک ایسے عام فہم اور بامحاورہ ترجمے کی ضرورت تھی، جو دوسرے تراجم کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ موجودہ زبان کی تمام رعایتوں کو بھی پورا کردے۔

چناں چہ رئیس المحد ثین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے اپنے فہمِ حقائق و معارفِ قرآنیہ وضروریات اور احتیاجاتِ وقت کو ملحوظ رکھ کر قرآن حکیم کا یہ اُردو ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم، معنی خیز، حقیقت فرما عبارت میں مرتب فرمایا، جس کو مولانا محمد مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ اگرچہ یہ ترجمہ متن کے ساتھ تحت اللفظ تھا اور حضرت شیخ الہندؒ نے جو چند پاروں کے فوائد حواشی ارقام (تحریر) فرمائے تھے، وہ بھی ترجمے کے ساتھ طبع ہو چکے تھے، لیکن مولانا مجید حسن صاحب کی یہ دلی خواہش تھی کہ بقیہ پاروں کے فوائد لکھوا کر قرآن مجید کے حواشی کو مکمل کیا جائے۔

الحمدللہ کہ وہ نیک آرزو آج منصۂ شہود پر جلوہ گر ہے اور حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے کے ساتھ شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد صاحب

عثمانی کی وہ **محیطُ الکُلّ** (پوری) تفسیر القرآن بھی شائع ہوگئی، جس نے بڑی بڑی تفاسیر سے بے نیاز کردیا ہے۔ اور قرآن حکیم کے حقائق و معارف کو اس قدر سلیس اور شگفتہ زبان میں زمانۂ حال کے موافق تحریر فرمایا ہے، جو اُردو دنیا کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور بلکہ ایک ایسا بیش بہا مذہبی سرمایہ ہے، جس پر اُردو داں طبقہ قیامت تک جتنا فخر کرے، کم ہے۔ کیوں کہ تفسیر کا طرزِ تحریر ابتدا سے لے کر انتہا تک ایسا سلجھا ہوا اور مدلل ہے کہ قرآن عزیز کے وہ دشوار مقامات جن کے سمجھنے سے عام انسان قاصر تھے، وہ اب بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

غرض! یہ تفسیر جس طول اور تفصیل سے بچتے ہوئے لکھی گئی ہے، اُسی کے ساتھ ایسی مختصر مگر جامع ہے، جس کی آج دنیائے اسلام میں مثال نظر نہیں آتی۔ اور مجھ جیسے شخص کے لیے اس قرآن پاک کے محاسن کو ایک جگہ جمع کرنا بھی دشوار ہے۔ بہرحال مولانا محمد مجید حسن صاحب مالک اخبار ''مدینہ'' بجنور کی اس قرآنی خدمت پر ہدیۂ تبریک پیش کرنا اَخلاقی اور اسلامی فرض تصور کرتا ہوں۔ اللہ رب العزت اُن کی دینی مساعی کو قبول فرمائے اور ملتِ اسلامیہ کو اس عظیم الشان قرآن مجید کی تلاوت و عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! (حکیم) محمد مشتاق علی، قصبہ اجڑاڑہ، ضلع میرٹھ

حواشی و حوالہ جات

1۔ حیاتِ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، از مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، ص:236۔ ادارہ اسلامیات، لاہور۔

2۔ امالی عبیدیہ، املا امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مرتبہ: شیخ بشیر احمد لدھیانویؒ، بہ قلم مولانا مقبول عالم، ص:206، طبع: رتن پبلی کیشنز، اسلام آباد، 2006ء۔ امالی عبیدیہ جلد اوّل کا اصل قلمی نسخہ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس قلمی نسخے کا عکس راقم السطور کے پاس موجود ہے۔ قلمی نسخے کا صفحہ نمبر 194 ہے۔

3۔ یہ روایت ہم نے کئی بار اپنے مشائخ رائے پور سے سنی ہے۔ اس کی تفصیل حضرت سیّد انور حسین نفیس الحسینی (مجاز حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ) نے اپنے ایک مضمون میں بیان کی ہے۔ دیکھئے! مضمون ''تحریکِ ریشمی رومال کے سرپرستِ اعلیٰ؛ شاہ عبدالرحیم رائے پوری'' از سیّد انور حسین نفیس الحسینی۔ مطبوعہ: ماہنامہ تذکرہ، لاہور۔

4۔ جمعیت الانصار کے قواعد و ضوابط، خطبات و مقالات، از امام عبیداللہ سندھیؒ، مرتب: مفتی عبدالخالق آزاد، ص: 96-95، طبع: دارالتحقیق و الاشاعت، لاہور، ستمبر 2002ء۔

5۔ مکاتیب شیخ الہندؒ اور ان کی سیاسی تحریک کا ایک مطالعہ۔ مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوریؒ، ص:126، طبع: کراچی۔

6۔ مقدمہ ترجمہ قرآن از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ، طبع اول، مشمولہ تفسیری فوائد ''موضح الفرقان''۔

7۔ دیوانِ درد از خواجہ میر درد، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، ص: 125، طبع: مجلس ترقی ادب، لاہور، 1988ء۔

8۔ حیاتِ شیخ الہندؒ از میاں اصغر حسین محدث۔ ص:131۔ طبع: لاہور۔

9۔ کلیاتِ شیخ الہندؒ، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوریؒ، ص: 111، طبع: مجلس یادگارِ شیخ الاسلام، کراچی، 1994ء۔

10۔ مرزا اسداللہ خاں غالب کے ان اشعار کو قدرے تصرف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تصرف برمحل ہے۔ اصل اشعار اس طرح ہیں:

رنگ ہا در طبع اربابِ قیاس آمیختہ　　نکتہ ہا در خاطرِ اہلِ بیاں انداختہ
آں چناں شمعے براہِ شب رواں افروختہ　　ایں چنیں گنجے ، بہ جیبِ بے دلاں انداختہ

(کلیاتِ غالب از مرزا اسداللہ خاں غالب (فارسی)،ص: 161،طبع: مطبع منشی نول کشور،لکھنؤ، 1925ء)

11۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ: ۱۹/شوال ۱۲۹۶ھ / 16/اکتوبر 1879ء میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی سیّد حبیب اللہ ایک مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ابتدائی تعلیم قصبہ ٹانڈہ میں والد صاحب کی نگرانی میں حاصل کی۔ 1891ء میں آپؒ کو مزید تعلیم کی غرض سے والدِ گرامی نے دیوبند بھیج دیا۔ آپؒ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ،مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ،مولانا عزیزالرحمٰنؒ اور مولانا غلام رسولؒ شامل ہیں۔ دارالعلوم میں قیام کے دوران آپؒ حضرت شیخ الہندؒ کی توجہات کا خصوصی مرکز بنے رہے۔ 1898ء میں اپنے خاندان کے ساتھ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور اپنے سفرِ حجاز کے دوران حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے سلوک کی منزلیں طے کیں۔حضرت شیخ الہندؒ جب 1915ء میں تحریک ریشمی رومال کے سلسلہ میں حجاز تشریف لے گئے تو اس دوران آپؒ کا قیام حضرت مدنیؒ کے ہاں رہا۔1916ء میں جب حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا تو حضرت مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی معیت اور خدمت کے لیے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ نومبر 1920ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے وصال کے بعد حضرت مدنیؒ نے ملکی سیاسی میدان میں بھرپور کردار ادا کیا۔ 1921ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرّس اور جامعہ اسلامیہ سلہٹ (بنگال) میں شیخ الحدیث کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔تحریکِ ترکِ موالات میں بھرپور حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی کے مشہور مقدمے میں زیرِ دفعہ 120,131,505 آپؒ کو مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، مولانا نثار احمد کانپوریؒ اور جگت شنکر اچاریہ کو گرفتار کر کے 26/ستمبر 1921 کو خالق دینہ ہال کراچی میں مقدمہ چلایا گیا اور 21/نومبر کو 2 سال قیدِ بامشقت ہوئی۔ 1932ء میں جمعیت علماءِ ہند کی جانب سے ''ڈکٹیٹر'' بنائے گئے۔ 1926ء تا1957ء دارالعلوم دیوبند میں پانچویں شیخ الحدیث، صدر مدرّس اور ناظمِ تعلیمات رہے۔ 1940ء سے 1957ء تک جمعیت علماءِ ہند کے صدر بھی رہے۔وطن عزیز کی آزادی میں آپؒ کی جدوجہد کے اعتراف کے طور پر جب انڈین گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز ''پدم بھوشن'' پیش کیا گیا تو آپؒ نے یہ کہہ کر منع فرمادیا کہ: ''میں نے اپنی تمام زندگی جو کچھ بھی کیا، وہ شرعی حکم اور ملکی فرض کی ادائیگی کے لیے کیا ہے۔کسی اعزاز و منزلت کے لیے نہ تھا''۔آج انھیں ''شیخ الاسلام'' کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے۔آپؒ کا وصال ۱۲/ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ /5/دسمبر 1957ء کو دیوبند میں ہوا۔قبرستانِ قاسمی میں حضرت شیخ الہندؒ کے برابر آسودۂ خواب ہیں۔

12۔ حکیم سنائی غزنوی کے شعر کے دوسرے مصرعے کو یہاں قدرے تصرف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اصل شعر اس طرح ہے:

اوّل و آخر قرآن ز چہ ''با'' آمد و ''سین''　　یعنی اندر رہ دین رہبرِ تُو قرآن بس

(دیوانِ سنائی غزنوی، از ابوالمجد د بن آدم سنائی غزنوی،ص: 309،طبع: کتاب خانہ ملّی، ایران،۱۳۶۲ھ)

13۔ تفسیر عثمانی از حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ،ص: 804،طبع: دارالقرآن، لاہور۔

14۔ کلیاتِ حزیں از شیخ محمد علی حزیں لاہیجی،ص: 2،طبع: منشی نول کشور،۱۲۹۳ھ۔

15۔ شرح دیوانِ حافظ شیرازیؒ، تحقیق و ترجمہ: پروفیسر میاں مقبول احمد، ردیف دال، غزل نمبر 29،ص: 340،طبع: مشتاق بک کارنر، لاہور۔ و دیوانِ حافظ، از حافظ شیرازیؒ،ص: 130، طبع: شیخ مبارک علی، اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، 1920ء۔

16۔ مولانا محمد قاسم صاحب لدھیانوی بن مولوی اللہ دین واعظ: محلّہ اقبال گنج لدھیانہ میں ولادت پائی۔ یہ مولانا بشیر احمد لدھیانوی (تلمیذ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ) کے بڑے بھائی تھے اور بہت اچھے کاتب تھے اور ''سلطان القلم'' کے نام سے مشہور ہوئے۔انھوں نے خط نسخ سیّد امیر الدین دہلویؒ اور مولوی محمد ممتاز علی ''نزہت رقم'' مہاجر مکی (مالک مطبع مجتبائی دہلی) سے حاصل کیا تھا، مولوی محمد قاسم برصغیر

ہندو پاک کے مسلم الثبوت خطاطِ قرآن تھے۔ 1907ء میں انھوں نے ایک ہفت رنگ قرآنِ پاک اپنے مطبع قاسمی سے طبع کیا، جس کا انتساب انھوں نے خان حبیب اللہ خاں والی افغانستان کی طرف کیا تھا۔ یہ نسخۂ قرآنِ پاک خطاطی کا عظیم الشان نمونہ ہے۔ ''سلطان القلم'' نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ اور تفسیر عثمانی کی بھی کتابت شروع کی تھی۔ ترجمۂ شیخ الہندؒ کے آخر میں خود انھوں نے لکھا ہے: ''کتبہ خاکسار محمد قاسم بن مولوی الٰہ دین مرحوم لودیانوی''۔ (ترجمہ شیخ الہند، ص: 806، طبع: دارالتصنیف، صدر کراچی) یہ قرآنِ پاک ''سلطان القلم'' کے اعجازِ قلم کا عظیم الشان نمونہ ہے۔ سلطان القلم اخیر زمانہ میں انجمن حمایت اسلام کی دعوت پر لاہور آ گئے تھے۔ اس سے قبل انھوں نے لدھیانہ اور دہلی کے علاقہ دریا گنج میں بھی ایک طویل عرصہ قیام کر کے خطاطی کی تھی۔ ان کا انتقال ۱۳/محرم الحرام ۱۳۵۱/ 19 مئی 1932ء بروز جمعہ کو ستر برس کی عمر میں ہوا۔

(دیکھیے مضمون: ''خطاطانِ قرآن''، از سیّد نفیس حسینی رقم، مطبوعہ: سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر، ج: 2، ص: 320 طبع: لاہور، مئی 2006ء)

17۔ **دیوان الامام الشّافعی**، از امام شافعیؒ، ص: 157، طبع: مکتبہ ابن سینا، قاہرہ۔

18۔ مولانا محمد مجید حسن بجنور کے رہنے والے تھے۔ 1883ء میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام اولاد حسن تھا۔ قرآن پاک اور عربی و فارسی کی تعلیم آبائی شہر بجنور میں حاصل کی۔ 1903ء میں ''اخبار الحکم'' میں کتابت کا کام کرنے لگے۔ خوش نویس اور ڈرائنگ میں ماہر تھے۔ آپؒ کی کتابت اتنی عمدہ تھی کہ محض اسی وجہ سے ''پانسو بیوپار'' نامی کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔ انبالہ اور قادیان میں کتابت کا کام کرتے رہے۔ (اخبار مدینہ، جوبلی نمبر 1939) ہفت روزہ ''الخلیل'' بجنور میں کتابت سے عملی زندگی شروع کی۔ 1911ء میں ''صحیفہ'' نامی اخبار سے وابستہ ہوگئے۔ باقاعدہ عالم اور مولوی نہ تھے، بلکہ یہ اعزازی خطاب قوم کی طرف سے انھیں ملا تھا۔ ''متین'' تخلص کرتے تھے۔ یکم/ مئی 1912ء میں ''مدینہ'' اخبار جاری کیا۔ ''مدینہ'' جو ہفت روزہ تھا، بعد میں سہ روزہ ہوگیا تھا۔ ہندوستان کا بہت مقبول، طاقت ور اور مؤثر اخبار تھا، جو جمعیت علما اور کانگریس کے نظریات کا ترجمان تھا۔ اس کے اداریے اہمیت اور توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ مولوی مجید حسن نے مدینہ اخبار اور اپنے طباعتی سلسلے کو ترقی دینے کے لیے بجنور میں ایک پریس ''مدینہ پریس'' کے نام سے قائم کیا، جو حسنِ طباعت میں بہت ممتاز اور مشہور ہوا۔ مولوی مجید حسن معقول آمدنی اور پیسے کی فراوانی کے باوجود بہت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ مولانا مجید حسنؒ کے پوتے جناب منیر حسن نے بتایا کہ: ''مولوی مجید حسن صاحب نے ترجمۂ شیخ الہندکی طباعت کے لیے مدینہ پریس کا سب سے عمدہ حصہ اور اعلیٰ ترین پریس علاحدہ کردیا تھا۔ اس پر 1947ء تک ترجمۂ شیخ الہندؒ کے علاوہ کچھ نہیں چھپا۔ سال کے بارہ مہینے اس پر ترجمۂ شیخ الہندؒ کی طباعت جاری رہتی تھی۔ ہر ایک سائز اور ہر ایک اعلیٰ، درمیانی اور عام حصہ ایک مرتبہ میں پانچ ہزار چھپتا تھا۔ ابھی اس کی طباعت کا کام ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسری قسم کی طباعت کی ضرورت سامنے آجاتی۔ وہ ختم ہوتا تو کسی اَور کا نمبر لگ جاتا۔ اس طرح پریس کا اعلیٰ ترین بڑا حصہ پورے سال اسی بابرکت خدمت میں مشغول رہتا تھا''۔ مولانا مجید حسن کی تقریباً اسّی سال کی عمر میں ۲۷/رجب ۱۳۷۲ھ/ 11/نومبر 1966ء کو بجنور میں وفات ہوئی۔

(معلومات از جناب منیر حسن (پوتے مولانا محمد مجید حسنؒ)، دیکھیے! حاشیہ کتاب ''شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کا اصل مقدمہ ترجمہ قرآن مجید''، مرتب: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، ص: 35 و 204، طبع: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، محلّہ مولویان، کاندھلہ، ضلع شاملی)

19۔ یہ مقولہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے۔ اس کے معروف جملے یہ ہیں: ''**انظر الیٰ ما قال و لا تنظر الیٰ من قال**'' (یہ دیکھو کیا کہا گیا ہے، یہ مت دیکھو کس نے کہا ہے)۔ (شرح کلمات امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ، عبدالوہاب، ص: 12)

غُرَرَ الحِکَم از عبدالواحد تمیمی، ص: 58، شمار نمبر 612، طبع: مرکز الابحاث والدراسات الاسلامیہ، ایران۔

20۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: آپؒ کی پیدائش ۱۲۴۸ھ / 1833ء میں قصبہ نانوتہ ضلع سہارن پور میں ہوئی۔ والدِ محترم کا نام اسد علی صدیقی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے نسبی سلسلہ ملتا ہے، اس لیے نسباً صدیقی تھے۔ ابتدائی کتب حضرت شیخ الہند

مولانا محمود حسنؒ کے چچا مولانا مہتاب علیؒ سے دیوبند میں پڑھیں۔ 1843ء میں آپؒ سہارن پور تشریف لے گئے۔ 1844ء میں آپؒ کے رشتے کے چچا مولانا مملوک علیؒ آپؒ کو دہلی لے آئے اور دہلی عربک کالج میں داخل کروادیا۔ دیگر کتب کی تحصیل مولانا مملوک علیؒ سے اور امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے شاگرد مفتی صدر الدین آزُردہؒ سے کی۔ حدیث کی تعلیم امام شاہ اسحاق دہلویؒ کے شاگردوں؛ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ اور حضرت مولانا احمد علی سہارن پوریؒ سے حاصل کی۔ 1846ء میں مطبع احمدی میں کتابت کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔

1857ء کی جنگِ آزادی کے وقت آپؒ کی عمر 24 سال تھی۔ تھانہ بھون میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی، جس میں آپؒ کو فوج کا سپہ سالار بنایا گیا تھا۔ آپؒ نے انتہائی جرأت اور بہادری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی۔ جنگِ آزادی کے دوران آپؒ نے اپنے ایک معتقد نواب شبّر علی خاں کے ذریعے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جنگ پر آمادہ فرمایا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے، لیکن پولیس باوجود کوششوں کے آپؒ کو گرفتار نہ کرسکی۔

1861ء میں نانوتہ میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ آپؒ کے شاگردوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا فخرالحسن گنگوہیؒ، مولانا احمد حسن لاہوریؒ، مولانا حکیم منصور علیؒ قابلِ ذکر ہیں۔ اسی دوران تصنیف اور مطبع مجتبائی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کا کام بھی 7 سال تک سرانجام دیا۔ 30/مئی 1866ء کو دیوبند میں چھتّہ کی مسجد میں انار کے درخت کے سائے میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی تو ادارہ کی پہلی مجلسِ شوریٰ کے رُکن منتخب ہوئے۔ دارلعلوم کے علاوہ مظاہر العلوم سہارن پور کی بنیاد بھی آپؒ کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد اور مدرسہ شاہی امروہہ کا قیام بھی آپؒ ہی کا مرہونِ منت ہے۔ حاجی صاحبؒ نے ایک دفعہ فرمایا: ''اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداداللہ! کیا لے کر آیا؟ تو مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو پیش کردوں گا کہ یہ لے کر آیا ہوں''۔

77-1876ء میں مذاہب کانفرنسز میں اسلام کی حقانیت انتہائی مدلل انداز میں ثابت کی۔ ہندو پنڈتوں اور عیسائی پادریوں کے ساتھ آپؒ کے مناظروں نے بہت شہرت حاصل کی۔ چناں چہ ''حجۃ الاسلام''، ''تقریر دل پذیر''، ''انتصار الاسلام'' انھی مباحث کے دوران آپؒ کی تقریروں پر مشتمل ہیں۔ آپؒ کو شاعری سے بھی شغف تھا۔ اُردو اور فارسی میں شعر کہے۔ قاسم تخلص تھا۔ آپؒ کا زیادہ تر کلام حمد و نعت پر مشتمل ہے۔ آپؒ نے ۴/ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ / 15/ اپریل 1880ء میں 47 سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپؒ کی تدفین سہارن پور میں ہوئی۔

21۔ قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ: آپؒ کی پیدائش ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / 10/ مئی 1829ء کو قصبہ گنگوہ ضلع سہارن پور میں ہوئی۔ آپؒ کے والدِ محترم مولانا ہدایت احمدؒ اپنے دور کے مشہور محدث تھے۔ آپؒ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ فارسی کی تعلیم اپنے ماموں مولانا محمد تقی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مولانا محمد بخش رامپوریؒ سے حاصل کی۔ 1845ء میں دہلی عربک کالج میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم جماعت ہوگئے۔ آپؒ کے اساتذہ میں مولانا مملوک علیؒ، مفتی صدر الدین آزُردہؒ، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی دہلویؒ اور حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلویؒ شامل ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔

1857ء کی جنگِ آزادی نے حریت کے اس جذبے کو مزید ترقی دی، جس کا عملی اظہار تھانہ بھون میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے مجلسِ شوریٰ میں ہوا۔ اس مجلس میں حاجی امداد اللہؒ، حافظ محمد ضامنؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور آپؒ کے علاوہ دیگر اکابرینؒ نے انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگی اقدامات کے لیے انتہائی منظم طریقۂ کار اختیار کیا گیا۔ فوج، حفاظت، عدل اور قانون کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ حافظ محمد ضامنؒ بھی اسی معرکے میں شہید ہوئے۔ جنگِ آزادی کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ یکم/ نومبر 1858ء کو عام معافی کے نمائشی اعلان کے باوجود جولائی 1859ء کو حضرت گنگوہیؒ کو گرفتار کرلیا گیا۔ 20 دن سہارن پور کی کال کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ 6/ ماہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد جنوری 1860ء کو رہا ہوئے۔ آپؒ کا شمار

دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ 1880ء میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے وصال کے بعد دارالعلوم کی سرپرستی فرمائی۔ آپؒ فقہ، اصولِ حدیث اور تفسیر کے ساتھ ساتھ تصوف کے مجدد تھے۔ تقریباً 50 برس درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔
''تذکرۃ الرشید'' میں آپؒ کی 15 کتب کا تذکرہ ملتا ہے۔ آپؒ سے استفادہ کرنے والوں میں حضرت مولانا حافظ محمد احمدؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 11/ اگست 1905ء کو گنگوہ میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

22۔ **اَخلاقِ فاضلہ:** حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''البدور البازغۃ'' میں سات اَخلاقِ فاضلہ تحریر فرمائے ہیں: 1۔حکمت، 2۔عفت، 3۔سماحت، 4۔شجاعت، 5۔فصاحت، 6۔دیانت، 7۔سمتِ صالح۔ (**البدور البازغہ، المقالۃ الاولیٰ، الفصل الثانی،** ص: 47، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ) **ملکاتِ کاملہ:** حضرت شاہ صاحبؒ نے ''**حُجّۃُ اللّٰہ البالغہ**'' میں چار ملکاتِ کاملہ تحریر فرمائے ہیں، جنھیں اَخلاقِ اربعہ سے تعبیر کیا ہے: 1۔طہارت، 2۔اِخبات، 3۔سماحت اور 4۔عدالت۔
(دیکھیے! **حُجّۃ اللّٰہ البالغہ، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مبحث السّعادۃ الحقیقیۃ**)

23۔ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ: ولادت: ۲۲/صفر ۱۲۳۳ھ / 13/ جنوری 1818ء/ وفات: ۱۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ / 18/ اکتوبر 1899ء۔ دارالعلوم دیوبند کے بانی و سرپرست، حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے تربیت یافتہ اور علمائے دیوبند کے سید الطائفہ ہیں۔ مشائخ چشت اور ولی اللّٰہی سلسلے کی مشہور شخصیت ہیں۔ دس بارہ عارفانہ کتابوں کے مصنف، بے شمار علما کے مرجع و مقتدا اور سلوک و معرفت میں اس عہد کے امام اور سرگروہ مشائخِ کاملین تھے۔ حضرت موصوف کے احوال و کمالات و کرامات پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔
(مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ''برصغیر میں تجدیدِ دین کی تاریخ'' از امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، اردو ترجمہ: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، ص: 85-384، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

24۔ مولانا ذوالفقار علی خلف شیخ فتح علی دیوبندی (والد ماجد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ): تقریباً ۱۲۳۷ھ / 1821ء میں ولادت ہوئی۔ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ اور دوسرے علما سے تعلیم حاصل کی۔ بریلی کالج میں عربی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ بعد میں سلسلۂ تدریس سے تعلیم کے انتظامی شعبے میں منتقل ہو کر انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ آخر میں ضلع سہارن پور کے مدارس کے انسپکٹر تھے۔ دیوبند میں قیام رہا۔ تمام عمر وہیں گزاری۔ دارالعلوم دیوبند کا جن بزرگوں نے منصوبہ بنایا اور اس کو اخلاص و للّٰہیت سے پروان چڑھایا، ان میں ایک ممتاز نام مولانا ذوالفقار علیؒ کا بھی ہے۔ مولانا تمام زندگی مدرسے کے اہم رُکن، سرگرم معاون اور اس کی مجلسِ منتظمہ کے بنیادی ممبر رہے۔
مولانا کا برصغیر کے عربی کے ممتاز فاضلوں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا نے عربی ادب کی ممتاز ترین درسیات اور معروف قصائد کی شروحات لکھیں۔ بعض کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ مولانا کی اہم تالیفات میں ''**تسھیل البیان فی شرح الدّیون**''، ''**تسھیل الدّراسہ شرح حماسہ**''، ''**التّعلیقات علیٰ السّبع المعلّقات**''، ''**عطر الوردہ شرح قصیدہ بُردہ**''، ''**الارشاد الیٰ بانت سعاد**'' سرِ فہرست ہیں۔ ''**تذکرہ البلاغت**'' اور ''**تسھیل الحساب**'' بھی مولاناؒ کی تصانیف میں مشہور ہیں۔ تقریباً پچاسی سال کی عمر میں ۱۳۲۲ھ 1904ء میں دیوبند میں وفات ہوئی۔ (حیاتِ شیخ الہند از مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندی، ص: 15-13 (لاہور: 1977)، تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ، محمد ایوب قادری، ص: 45 (حاشیہ) کراچی: 1961ء)

25۔ حضرت مولانا محمد یعقوب خلف مولانا مملوک العلی نانوتویؒ (ولادت: ۱۳/صفر ۱۲۴۹ھ / 2/ جولائی 1833ء): اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی۔ تمام علوم میں کامل ہوئے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ اور مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ سے حدیث پڑھی۔ تعلیم کے بعد اجمیر کے سرکاری مدرسے میں مدرّس ہوئے۔ 1857ء تک تمام وقت تعلیمی خدمت میں گزرا۔ 1857ء کے بعد دارالعلوم دیوبند کو ترقی دینے، آگے بڑھانے میں اپنے معاصرین اور رُفقا کے ہم قدم رہے۔ مولانا مدرسہ عربیہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند کے پہلے صدر مدرّس

www.rahimia.org

اور علوم میں فخرِ اماثل تھے۔ سلوک و معرفت میں حضرت حاجی امداداللہ سے مجاز تھے۔ تالیفات، تراجم، مکتوبات، (بیاضِ یعقوبی کے مندرجات و مکتوبات کے علاوہ) اور مختلف موضوعات پر مضامین علمی یادگار ہیں۔ سینکڑوں طلبا نے مولانا سے استفادہ کیا، جس میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا نام بہت ممتاز ہے۔ یکم ربیع الاوّل ۱۳۰۲ھ (20/دسمبر 1884ء) کو طاعون میں مبتلا ہو کر وفات ہوئی۔ نانوتہ میں دفن کیے گئے۔ (بیاضِ یعقوبی، مرتبہ: امیر احمد عشرتی نانوتوی، ص: 5، نیز ص: 153، طبع اوّل: تھانہ بھون 1929)۔

26۔ مولانا ملا (سیّد) محمود: مولانا ممتاز علی دیوبندی کے فرزند اور دیوبند کے خاندانِ سادات کے فرد ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے تعلیم حاصل کی۔ مولانا شاہ عبدالغنی مجددیؒ سے حدیث پڑھی۔ مؤخر الذکر کے خاص تربیت یافتہ اور ''انجاح الحاجہ حاشیہ سنن ابن ماجہ'' کی تصنیف میں استاذِ جلیل (شاہ عبدالغنی مجددیؒ) کے معاون و شریک تھے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابوں کے مصحّح، حاشیہ نگار تھے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں سب سے پہلے مدرّس مقرر کیے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے اوّلین اساتذہ میں سے ہیں۔ بعد میں مدرّسِ سوم ہوگئے تھے۔ یہ معلومات مختلف ذرائع سے اَخذ کی گئی ہیں اور اس میں کئی معلومات پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔ (حضرت شیخ الہندؒ کا اصل مقدمہ ترجمہ قرآن، حاشیہ: از مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، ص: 208)۔ آپؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد اور قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ آپؒ زندگی کے آخری لمحات تک دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے قیام ۱۲۸۳ھ / 1866ء سے ۱۳۰۳ھ / 1886ء تک پڑھاتے رہے۔ ۱۳۰۴ھ / 1886ء میں دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔ تدفین دیوبند میں کی گئی۔ (کاروانِ رفتہ از اسیر ادروی، ص: 229، طبع: دارالمؤلفین دیوبند، یو۔ پی، 1994ء)

27۔ مولانا مہتاب علی خلف شیخ فتح علی دیوبندیؒ: (مولانا ذوالفقار علی کے بڑے بھائی) ممتاز عالم اور دیوبند میں سرکاری مدرّس تھے۔ مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند کے قیام کے فیصلے کے بعد اس کے مقصد کے لیے سب سے پہلا کام اہلِ قصبہ کا تعاون اور نظم کی فراہمی تھی۔ ۱۵/محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (30/مئی 1866ء) کو حضرت حاجی عابد حسین نے دارالعلوم دیوبند کے لیے سب سے پہلا چندہ کیا۔ حاجی صاحب کے بعد چندہ کی سب سے پہلی رقم مولانا مہتاب علی نے دی تھی۔ مدرسہ کے افتتاح کے بعد ۱۹/محرم ۱۲۸۳ھ (3/جون 1866ء) کو مدرسے کے تعاون کے لیے جو سب سے پہلی اپیل اور اشتہار چھپا، اس میں حضرت عابد حسین اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بعد تیسرا نام مولانا مہتاب علی کا ہے، جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا مدرسے کے سب سے پہلے محرکین اور سرگرم معاونین میں سرِفہرست تھے۔ اس وقت سے وفات تک مدرسے کے معاون اور رفیق رہے۔ مولانا قاری محمد طیب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے لکھا ہے کہ مولانا مہتاب علی ۱۳۰۴ھ / 1887ء تک مجلس منتظمہ (شوریٰ) کے رُکن تھے (دارالعلوم کی صد سالہ زندگی، ص: 102، دیوبند (۱۳۸۵ھ)، لیکن سیّد محبوب رضوی کی اطلاع یہ ہے کہ ''مولانا مہتاب علی کی ۱۲۹۳ھ (1876ء) میں وفات ہوئی۔'' (تاریخ دیوبند، حاشیہ، ص: 331، دیوبند: 1972) واللہ اعلم۔ (حاشیہ: مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی، حوالہ بالا، ص: 308)۔

28۔ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ خلف شاہ عبدالرحمٰن: گنگوہ میں مقیم ممتاز انصاری خاندان (اولادِ سیّدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ) کے فرد ہیں، جس سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہ کو بھی نسبت ہے۔ قیاساً 1846ء (۱۲۶۲ھ) میں ولادت ہوئی ہوگی (فخر العلماء، ص: 176)۔ ابتدائی اور متوسط درسی کتابیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے پڑھیں (ص: 168)۔ بعد میں دیوبند سے درسیات مکمل کیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے خاص استفادہ کیا اور اُن کے اہم شاگردوں میں سے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ان کے تین اہم ترین اور ممتاز ترین شاگردوں کا ذکر کیا ہے، جس میں پہلا نام شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا اور دوسرا مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''وارستگیٔ مزاج میں مولانا (شیخ الہند) کے قدم بہ قدم بلکہ کچھ بڑھ کر ہیں۔ عمدہ استعداد ہے۔ انھوں نے بھی دیوبند میں تحصیل کی ہے اور اوّل جناب مولوی رشید احمد صاحب سے تحصیل کی تھی''۔ (حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم، ص: 33-32)

مولانا فخر الحسن کو جو سند دی گئی تھی، اس کی نقل ۱۲۹۰ھ (1873ء) کی روداد میں درج ہے (ص: 28)۔ مدرسہ اسلامیہ نگینہ سے تدریس کی

ابتدا ہوئی۔ اس کے مختلف مقامات پر قیام رہا۔ حضرت نانوتویؒ کے اہم ترین سفروں اور مناظروں میں رفیق اور خادم رہے۔ حضرت کے ملفوظات و سوانح مرتب کیے اور حضرتؒ کی کئی کتابیں، تقریریں اور اِفادات خاص اہتمام سے چھپوائے۔ ان خدمات کی وجہ سے مولانا کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مولانا کی اہم ترین دینی خدمت علمی یادگار اور صدقہ جاریہ ''سنن ابو داؤد'' اور ''سنن ابن ماجه'' کا حاشیہ ہے، جو بارہا چھپا ہے اور چھپتا رہتا ہے۔ خصوصاً ''ابو داؤد'' کا حاشیہ بہت ممتاز اور متداول ہے۔ محقق جلیل مولانا عبدالرشید نعمانیؒ نے ان دونوں کا تعارف کرانے کے بعد لکھا ہے: ''و التّعليقات كلاهما يدلّان علىٰ مشاركة الجيدة فى علم الحديث و فنونه''۔ یہ دونوں حاشیے علم حدیث اور اس کے مباحث میں (مولانا فخرالحسن کی) مہارت اور اعلیٰ نظر کے ثبوت ہیں۔ (**ما تمس اليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجه**، ص: 214 (قطر ۱۴۰۴ھ)۔ مولانا کی ان کے علاوہ بھی تصانیف تھیں، مگر ان کا مفصل احوال دستیاب نہیں۔ کیوں کہ کانپور کے فسادات میں مولانا کا کتب خانہ جلا کر خاکستر کردیا گیا تھا۔ اس لیے مولانا کی متعدد کتابیں بے نام و نشان ہوگئیں۔ مولانا فخرالحسنؒ (تقریباً ۱۳۰۳ھ / 1885ء میں) ترکِ وطن کرکے کانپور چلے گئے تھے۔ تاحیات وہیں رہے۔ ایک رئیس کے طبیبِ خاص تھے۔ یہی ذریعہ معاش تھا۔ اسی ملازمت پر غالبًا آخری ذی قعدہ یا شروع ذی الحجہ ۱۳۱۵ھ (1898ء) میں کانپور میں وفات ہوئی۔

مزید معلومات کے لیے ''فخر العلماء'' (سوانح مولانا فخرالحسن)، تالیف: اشتیاق اظہر (کراچی: 1991ء)۔ یہ کتاب اگرچہ ذمہ دارانہ اور بہت مستند نہیں ہے، مگر مولانا کے حالات پر اس کے علاوہ کوئی اَور کتاب دستیاب نہیں۔ متفرق معلومات بکھری ہوئی ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو: رپورٹ مجلس مؤتمر الانصار مرادآباد۔ مولانا کی یہ خصوصیت اور امتیاز بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ مجلس ندوۃ العلماء (جس نے بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بھی قائم کیا) کے محرکِ اوّل مولانا سیّدظہورالاسلام فتح پوری (فتح پورہ ہنسوہ) نے جن علما کو جو اپنی رفاقت کے لیے منتخب کیا اور جو ندوۃ العلماء کی تحریک و تاسیس میں پیش پیش اور سرفہرست رہے، ان میں ایک ابتدائی اور بہت نمایاں نام مولانا فخرالحسن گنگوہیؒ کا بھی ہے۔ مزید معلومات کے لیے: (الف) ندوۃ العلماء؛ بانی اور محرک، تالیف: ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد (فتح پورہ ہنسوہ: 1996ء)۔ (ب) مولانا سیّدظہورالاسلام فتح پوری (حیات و خدمات)، تالیف: مولانا عبدالوحید صدیقی فتح پوری (فتح پور)۔ (حاشیۂ نور)

29۔ مولانا سیّداحمد حسن بن سیّد اکبر امروہوی، شاہ بان امروہوی کی اولاد میں تھے۔ امروہہ ضلع مرادآباد میں ۱۲۶۷ھ (1850ء) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن کے متعدد علما سے حاصل کی۔ طب پڑھی اور اس کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے تعلیم و استفادے کے لیے میرٹھ حاضر ہوئے۔ آخر میں مدرسہ دیوبند میں بھی پڑھا۔ ۱۲۹۰ھ (1873ء) میں دستارِ فضیلت حاصل ہوئی۔ شاہ عبدالغنی مجددی اور قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی سے بھی سند حاصل کی۔ مرادآباد، خورجہ، امروہہ وغیرہ میں اعلیٰ مدرّس رہے۔ متعدد تالیفات مجموعہ فتاویٰ، مجموعہ مکتوبات مختلف مناظروں کی رودادیں اور علمی افادات یادگار ہیں۔ ''محدث امروہی'' کے لقب سے جانے جاتے تھے۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت تھے۔ طاعون میں مبتلا ہوکر ۲۹/ ربیع الاوّل ۱۳۳۰ھ / 18/ مارچ 1912ء کو وفات ہوئی۔ آپؒ کا مدفن جامع مسجد امروہہ کے صحن میں ہے۔ (مکتوبات سیّد العلما، مولانا احمد حسن امروہی، مرتبہ: مولانا نسیم احمد امروہی (امروہہ بلا سنہ)۔ (حاشیۂ نور)

30۔ مولانا عبدالعدل خلف مولوی منشی عنایت علی: پُھلت ضلع مظفرنگر کے باشندے تھے۔ اپنے وطن میں اور مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۹۰ھ (1873ء) میں دارالعلوم میں ''ہدایہ''، ''ملاجلال'' وغیرہ پڑھتے تھے (روداد: ۱۲۹۰ھ، ص: 36-34)، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے معتمد خدام اور شاگردوں میں سے تھے۔ حضرت مولانا کی وفات کے بعد حضرتؒ کے مکتوبات اور علمی افادات کا ایک مجموعہ ''فیوضِ قاسمیہ'' کے نام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ ۱۳۰۳ھ (1886ء) میں مرتبہ ہوا اور اس کا پہلا حصہ مطبع ہاشمی میرٹھ سے پہلی مرتبہ ۱۳۰۴ھ (1887ء) میں چھپا۔ بعد میں اَور مطابع نے بھی چھاپا (پیش نظر نسخہ مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی تاجر کتب گنگوہ کا شائع کیا ہوا ہے)۔ مولانا عبدالعدل نے پہلی طباعت میں اس کے دوسرے حصے کا بھی اشتہار دیا تھا، جس میں حضرت نانوتویؒ کی اکیس تحریروں اور خطوط کے شامل ہونے کی اطلاع تھی۔ مگر (غالبًا) دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا (ملاحظہ ہو: تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتویؒ، ایوب قادری، ص:

236)۔افسوس ہے کہ مولانا عبدالعدل کے تفصیلی حالات اور سن وفات وغیرہ معلوم نہیں۔ (حاشیۂ نور)

31۔ مولانا سیّد عبدالحق خلف نبی بخش بن امام بخش: قصبہ پور قاضی ضلع مظفرنگر کے رہنے والے تھے۔تقریباً ۱۲۵۸ھ / 1842ء میں ولادت ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دنوں ۱۲۸۲ھ / 1866ء میں تعلیم کے لیے دیوبند آئے۔شرح جامی سے اعلیٰ کتابوں تک تمام درسیات یہیں پڑھیں۔ ۲۰/ ذوقعدہ ۱۲۹۰ھ / 9/ جنوری 1874ء کو مدرسہ کے سالانہ جلسے میں سندِ فضیلت سے نوازے گئے۔جن لوگوں کو سند عطا کی گئی اور ان کے سالانہ امتحانات کے سوالات منتخب جوابات جلسے میں سنائے گئے۔ان کی قابلیت کی تعریف کی گئی۔ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبدالحق کا ہے۔مولانا عبدالحق کے اپنی جماعت کی سب کتابوں میں سب سے اعلیٰ نمبرات تھے (روداد مدرسہ عربیہ دیوبند: ۱۲۹۰ھ)۔تعلیم کے بعد ریاست رتلام میں ملازم ہوئے اور غالباً پوری زندگی اسی میں بسر فرمائی۔مولانا کی ایک مختصر تحریر جو مولانا اپنی دختر سعدی خاتون کی شادی کے موقع پر محرم ۱۳۳۰ھ (جنوری 1912ء) بطور نصیحت تحریر فرمائی تھی، بہترین جہیز کے نام سے بار بار چھپی ہے اور بہشتی زیور میں بھی شامل ہے۔ ۸/ صفر ۱۳۴۲ھ / 20/ ستمبر 1923ء کو رتلام میں وفات ہوئی۔قرارداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۴۲ھ، نیز تاریخ دارالعلوم سیّد محبوب رضوی، ص: 185 (اشاعتِ خاص ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال: 1980ء)۔

مولانا عبدالحق کو متعدد اکابر علما (روداد مدرسہ دیوبند، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا تھانوی وغیرہ) نے ''صاحب پوری'' بھی لکھا ہے، جو ''پور قاضی'' کا مخفف ہے۔الگ سے کوئی اَور نسبت نہیں۔مولانا عبدالرؤف صاحب عالی جو مولانا عبدالحق کے نواسے اور مولانا عبداللطیف صاحب پور قاضوی (ناظم مدرسہ مظاہرالعلوم سہارن پور کے صاحبزادے ہیں) کا قول ہے کہ: ''ہماری طالبِ علمی کے زمانے تک پور قاضی کے طلبا کو ''صاحب پوری'' کہا جاتا تھا''۔ یہاں یہ صراحت مفید ہوگی کہ بہترین جہیز کے نام سے اَور بھی دو تین رسالے چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ ہمارے نواح میں مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کا اس نام کا رسالہ خاصا معروف ہے۔وہ علاحدہ ہے۔(حاشیۂ نور)

32۔ بُنانی اور دسوقی، دونوں شیخ سعدالدین تفتازانی کی شہرۂ آفاق تصنیف ''مختصر المعانی'' کے حاشیہ (بلکہ مفصل شرحیں) ہیں:

الف: دسوقی کا نام محمد بن احمد بن عرفہ دسوقی ہے۔ان کی وفات: ۱۲۳۰ھ / 1815ء میں ہوئی۔(الاعلام، ج: 6، ص: 17)

ب: بنانی کا نام شیخ مصطفیٰ بن محمد بن عبدالخالق بنانی ہے۔ان کی وفات ۱۲۳۷ھ / 1821ء کے بعد ہوئی۔(الاعلام، خیرالدین زرکلی، ج: 7، ص: 242) مصنف نے اپنے اس حاشیے کو ''التّجرید علیٰ مختصر السّعد'' کے نام سے موسوم کیا تھا، مگر مصنف کی نسبت سے بنانی کے نام سے مشہور ہے۔دو بڑی جلدوں میں چھپی ہے۔دو حصوں پر مشتمل چار جلدوں میں ہے۔

''دُسوقی'' اور ''بُنانی'' دونوں کتابیں ایک ہی وقت لکھی گئیں۔''دُسوقی'' شوال ۱۲۱۰ھ (اپریل 1796ء) میں مکمل ہوئی اور ''التّجرید'' جمادیٰ الثّانیہ ۱۲۱۱ھ / 1796ء میں پایۂ اختتام کو پہنچی۔

33۔ حاشیہ مختصر المعانی، شیخ الہندؒ کی مشہور تالیف ہے۔عام طور پر تمام مدارس میں ''مختصر المعانی'' کا یہی نسخہ زیرِ استعمال ہے اور پڑھایا جاتا ہے، جس پر حضرت شیخ الہندؒ کا حاشیہ ہے۔یہ حاشیہ مولوی عبدالاحد (مالک مطبع مجتبائی، دہلی) نے شیخ الہندؒ سے لکھوایا تھا۔مولوی عبدالاحد نے صراحت کی ہے کہ: ''شیخ الہندؒ نے پہلے مختصر المعانی کا تین مصری طباعتوں اور قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے تصحیح کی۔پھر اس پر جامع اور اہم حاشیہ لکھا جو مختصر المعانی کے اکثر حواشی اور شروحات کا بہترین خلاصہ ہے''۔اور مولوی عبدالاحد صاحب کے بقول ''مختصر المعانی'' کی تمام شروح اور حواشی سے مستغنی کرنے والا ہے:

''حتّی کأنہ لاحتوائہ علی المطالب الفخمیّۃ، شرح جدید، و مغن عن سائر الشّروح، و الزّبر القدیمۃ، و ناسخ للحواشی المعتبرۃ و التّعلیقات الکریمۃ'' (مختصر المعانی، ص: 554، طبع: مطبع مجتبائی دہلی، الطّبعۃ الخامسۃ، ۱۳۸۰ھ)

اس حاشیے کی یہ افادیت اور قدر و منزلت صرف اس کے ناشر کا خیال نہیں، بلکہ اہلِ نظر علما بھی برسوں کے مطالعے، تلاش و جستجو اور مختصر معانی کے درجات کی تعلیم و تحقیق کے بعد اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ حاشیہ مختصر المعانی کی تمام شروحات کا مغز اور ایسا

انتخاب ہے کہ اس سے بہتر دُشوار ہے۔ مثلاً مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے:

’’بعد کو جب دسوتی کے ساتھ ملا ملا کر ان حواشی کے مطالعے کا موقع ملا، تب مولانا (شیخ الہندؒ) کی غیر معمولی انتخابی قوت کا اندازہ ہوا۔ گویا اس ضخیم و لحیم و شحیم شرح کی روح نکال کر مولانا نے رکھ دی تھی۔ ہزار ہا ہزار صفحات کے پڑھنے سے بھی جو نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، وہ ان چند سطروں میں مل جاتے تھے اور اس وقت معلوم ہوا کہ کمال صرف یہی نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیش کی جائے، بلکہ دوسروں کے کلام سے چھلکوں کو اُتار کر صرف مغز برآمد کر لینا اور جہاں ضرورت ہو، ٹھیک اسی جگہ پر موقع موقع کے ساتھ اس کو درج کر کے مشکلات کو حل کرتے چلے جانا بجائے خود ایک ایسا کمال ہے کہ اپنی طرف سے کچھ لکھ لکھا دینا تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے کہیں زیادہ آسان ہے‘‘۔ (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: 38-37)۔ اسی سلسلۂ گفتگو میں یہ بھی تحریر ہے کہ: ’’کوئی شبہ نہیں کہ مختصر المعانی پر مولانا (شیخ الہند) مرحوم کا یہ حاشیہ ایسا حاشیہ ہے، جس نے طلبا کو ہی نہیں، بلکہ مدرسین کو بھی اس کتاب کی تمام شرحوں سے مستغنی کر دیا ہے‘‘۔ (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: 37، دیوبند بلاسنہ)۔ شیخ الہندؒ کا حاشیہ مختصر المعانی پہلی مرتبہ مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ / جون 1907ء میں اس کی طباعت مکمل ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۳۳۳ھ (1915ء) میں چھپا۔ اس وقت سے 1947ء تک یہ حاشیہ مطبع مجتبائی سے برابر چھپتا رہا۔ بعد میں ہند و پاکستان کے متعدد تاجرانِ کتب نے شائع کیا۔ (حاشیۂ نور)

34۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے عہد سے حاضر تک بڑے علما بلکہ مشائخ کرام سے متعلق معلوم ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ شعرا اور منتخب اشعار کی بیاضیں (کاپیاں) رکھتے تھے، جس میں حکیم الامت (مولانا اشرف علی) تھانوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا (کاندھلوی) اور مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہم اللہ جیسے اصحاب بھی شامل ہیں۔ (حاشیۂ نور)

35۔ منشی ہرگوپال تفتہ، غالب کے مایۂ ناز شاگرد اور ممتاز شاعر تھے۔ ہرگوپال تفتہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے باشندے تھے۔ کائستھ خاندان کے رُکن اور موتی لال کے بیٹے تھے۔ ۱۲۱۴ھ / 99-1798ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے بعد خاندانی معمول کے مطابق محکمہ مال میں ’’قانون گو‘‘ رہے۔ غالبؔ کو تفتہؔ نہایت عزیز تھے۔ غالب کے سب سے زیادہ خطوط تفتہ کے نام ہیں۔ تفتہ شروع میں ’’راقمؔ‘‘ تخلص کرتے تھے۔ غالب کے شاگرد ہوئے تو غالب نے یہ تخلص بدل کر ’’تفتہؔ‘‘ کر دیا تھا۔ غالب ان کو ’’مرزا تفتہ‘‘ کہتے تھے۔ تفتہ سخن شناسی میں بے نظیر تھے۔ عموماً فارسی میں شعر کہتے تھے۔ تفتہ کا فارسی کلام اپنے ہم عصروں سے ممتاز اور طالبؔ و کلیمؔ کے پایہ کا ہے۔ ان کے فارسی کلام کے چار دیوان یادگار ہیں، جس میں (اندازاً) بارہ تیرہ ہزار اشعار ہیں۔ تفتہ نے گلستان سعدی کی تضمین بھی لکھی تھی اور بوستان (سعدی) کے جواب میں ’’سُنبلستان‘‘ تحریر کی۔ تفتہ ۱۵/ رمضان ۱۲۹۶ھ /2/ ستمبر 1879ء کو سکندر آباد میں دنیا سے رُخصت ہوئے۔ مولوی مختار احمد تھانوی نے تاریخ وفات کہی: ’’سال نقلش بادلِ زار ازخرد من شنیدم بے سرو پا شد سخن‘‘ (۱+۱۲۰۶ ۱۲۹۶)

مزید معلومات کے لیے: تفتہ اور غالب، مؤلف: محمد ضیاء الدین انصاری۔ (دہلی: 1984ء) نیز تلامذۂ غالب، مالک رام، ص: 63-66 (نکودر: طبع اوّل) (حاشیۂ نور)

36۔ بخاری کے تراجم ابواب کے ضمن میں قرآن شریف کی جو آیتیں آئی ہیں، ان آیتوں سے پہلے اور بعد کی سب آیتیں حضرت شیخ الہندؒ کو ازبر یاد رہتی تھیں، جیسا کہ مولانا مدنیؒ نے تحریر کیا ہے کہ: ’’آیتوں کا ضمناً ذکر نہیں تھا، بلکہ ان کے ذریعے سے قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں‘‘۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا ہے کہ: ’’اپنے تراجم میں امام بخاریؒ کا یہ قاعدہ ہے کہ قرآنی آیتوں کو حسبِ ضرورت شریک کرتے چلے گئے ہیں۔ اس بہانے سے ان قرآنی آیتوں کے نئے پہلوؤں کے جاننے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، بلکہ قرآن فہمی کی نئی راہیں بھی کھلتی تھیں اور میں کیا بتاؤں کہ ترمذی شریف کے درس کے بعد بخاری شریف کا درس جب شروع ہوا تو دل کے لیے بھی اور دماغ کے لیے بھی کیسی لذیذ خوراکیں ملنے لگیں۔ ایسی خوراکیں جو منطق کی کسی کتاب میں ملیں، نہ فلسفے میں نہ ادب میں اور نہ کسی اَور فن میں ملی تھیں‘‘۔ (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، ص: 156، دیوبند بلاسنہ) (حاشیۂ نور)

www.rahnuma.org

37۔ ایک وضاحت نہایت ضروری ہے کہ شیخ الہندؒ اگرچہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگردِ رشید، جاں نثار، مخلص خادم، سفر وحضر کے رفیق، حضرت کے معتمد اور علمی جانشین تھے، مگر حضرت مولانا نانوتویؒ سے مولانا کو اجازتِ بیعت حاصل نہیں۔ حضرت مولاناؒ کا معمول تھا کہ مولاناؒ کے جو شاگرد سیر سلوک مکمل کر لیتے تھے، یا جو مریدین یا مسترشدین اجازت کے اہل ہو جاتے تھے، ان کو حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی خدمت میں بھیج دیتے تھے۔ اگر ضرورت سمجھتے تو حضرت حاجی صاحب ان کو اجازت دے دیتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ نے خود کسی کو خلافت عطا نہیں کی۔ حضرت حاجی امداداللہؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حاجی رفیع الدین مہتمم اوّل دیوبند نے وضاحت فرمائی ہے کہ: ''حضرت مولانا نانوتویؒ نے کسی کو مجاز نہیں کیا''۔ (حالاتِ طیب مولانا محمد قاسم، از مولانا یعقوب نانوتویؒ، ص: 33، طبع اوّل: بہاولپور ۱۲۹۷ھ)۔ اس لیے شیخ الہندؒ بھی حضرت حاجی (امداداللہ مہاجر مکی) صاحبؒ کے مجاز ہیں اور حضرت مولانا (رشید احمد) گنگوہیؒ سے بھی اجازتِ بیعت حاصل ہے۔ (حاشیہ نور)

احقر مرتب آزاد رائے پوری عرض کرتا ہے کہ: حضرت شیخ الہندؒ پر قاسمی نسبت اور مزاج کا بہت غلبہ تھا، جیسا کہ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے واضح طور پر لکھا ہے: ''جن لوگوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم (نانوتوی) دیوبندیؒ سے تعلیم پائی ہے، ان میں تین آدمی سب سے فائق اور بلند درجہ رکھتے ہیں۔ ہمارے شیخ حضرت شیخ الہند رضی اللہ عنہ، ان تینوں میں سب سے زیادہ اپنے شیخ سے محبت حاصل کرنے والے تھے۔ ان کے علم وفکر اور زندگی کے مقاصد کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے۔ ان کی اتباع کرنے میں سب سے زیادہ فنا تھے۔ ہمارے شیخ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ) کے علوم ومعارف اور تجدیدِ دین کے کام میں ان کے عزائم کی قوت وشدت کو صحیح طور پر سمجھتے تھے۔ اس حوالے سے ان کی امامت کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی نظر میں حضرت نانوتویؒ، امام فخر الدین رازیؒ اور شیخ اکبر (محی الدین ابن عربیؒ) پر بھی فوقیت اور برتری رکھتے تھے۔ ...وہ اپنے شیخ (حضرت نانوتویؒ) سے شدید محبت کی وجہ سے اکثر خواب میں انھیں دیکھا کرتے کہ وہ انھیں چند باتوں پر عمل کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ چناں چہ وہ اصولِ تدبیر اور (حالات کے مطابق) حکمتِ عملی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان باتوں پر عمل کیا کرتے تھے۔ جو آدمی اس سلسلے کے بعض واقعات اور مثالوں کو جانتا ہے، وہ ان کے سیاسی کاموں کی طاقت وقوت کی نوعیت کو سمجھ لے گا۔ اسے معلوم ہوگا کہ اس کی مثال بڑے بڑے وزرا کے ہاں بھی نہیں ملتی''۔ (برصغیر میں تجدیدِ دین کی تاریخ (اردو ترجمہ: **التمھید لتعریف ائمۃ التجدید**)، از امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، ص: 391-390، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

38۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چوتھے صاحبزادے ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۱۶۷ھ (54-1753ء) میں ہوئی۔ ان کے بارے میں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''امام عبدالقادر بن امام ولی اللہ دہلویؒ کا تذکرہ: ''شیخ محسن یمانی ''**الیانع الجنی**'' میں لکھتے ہیں: ''امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ اصحاب میں اہم ترین فرد اُن کے بھائی شاہ عبدالقادر دہلویؒ ہیں۔ وہ علوم وفنون کے بڑے فاضل تھے۔ دین میں انتہائی ورع وتقویٰ کے حامل تھے۔ وہ بڑے پرہیزگار اور متقی لوگوں میں سچی فہم وفراست اور حسن سیرت کی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان پر بسا اوقات غیب کی باتوں کا الہام بھی ہوتا ہے۔ مجھ سے ثقہ اور قابل اعتماد لوگوں نے ان کی بعض ایسی کرامات اور خرقِ عادت باتیں بتلائی ہیں، جن سے اللہ نے انھیں نوازا تھا۔ ان سے علما کی ایک بڑی جماعت نے علوم حاصل کیے۔ جن میں اہم ترین ہمارے شیخ علامہ ابوالعلا فضل حق عمری خیرآبادیؒ ہیں۔ ان جیسا آدمی آنکھوں نے دیکھا نہ ہوگا۔ انھوں نے کئی مرتبہ شاہ صاحب سے اپنے فیض حاصل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے انھیں حضرت شاہ صاحب کی تعریف کرتے ہوئے کئی بار دیکھا ہے۔ اور وہ ان کی کرامات کے واقعات بھی ہمیں سنایا کرتے تھے۔'' انتھی. وہ مزید لکھتے ہیں:

''انھیں (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) کے انفاسِ قدسیہ سے فیض یاب ہوتے ہوئے اور انھیں کے طرز اور نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اردو زبان میں قرآن کا بہترین ترجمہ (موضحِ قرآن) کیا ہے۔ اس طرح ان کے بعد، لوگوں کے

لیے ترجمہ کرنا آسان ہوگیا۔ اس حوالے سے وہ اور ان کی اتباع کرنے والے لوگ ایک اہم رہنما کے طور پر سامنے آئے۔''

میں (عبیداللہ سندھی) کہتا ہوں کہ: شیخ عبدالقادر دہلویؒ اردو زبان میں قرآن عظیم کے ترجمہ و تفسیر میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم کے معانی اخذ کرنے میں ہمارے دیو بند کے مشائخ کی اسانید حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی تک ایک تسلسل کے ساتھ جاملتی ہیں۔ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ تو وہ شخصیت ہیں، جنھوں نے ان کے ترجمہ قرآن کی (اپنے دور کی زبان کے مطابق) اصلاح کی ہے۔ اور (''موضحِ فرقانِ حمید'' کے نام سے) اس کی تہذیب و تدوین کی ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی وفات تریسٹھ سال کی عمر میں ۱۹ / رجب ۱۲۳۰ھ (28 / جون 1815ء) کو (بدھ کے دن) ہوئی''۔ (برصغیر میں تجدیدِ دین کی تاریخ، ص: 366-365)

39۔ 2- البقرہ: 26۔

40۔ 33- الاحزاب: 4۔

41۔ حضرت مولانا بدرالحسن جلالی مرادآبادیؒ: 1920ء کے ہنگامہ خیز دور میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات میں شرکت کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ آپؒ تاریخ یورپ اور بین الاقوامی سیاست پر عبور رکھتے تھے۔ ''مدینہ'' اخبار بجنور کے ایڈیٹر کے طور پر ''سر را ہے'' کے عنوان سے مستقل کالم کا آغاز کیا، جو کہ عوام میں بہت مقبول ہوا۔ نظریات اور عملی کردار کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بہت متاثر تھے۔ بدر تخلص کرتے تھے۔ اپنی بیشتر تحریروں میں حافظ، غالب اور اقبال کے اشعار خوبی سے بیان کرتے تھے، جس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے، جو انھوں نے ترجمہ قرآن ''موضحِ فرقان'' کی تقریظ کے طور پر لکھی ہے۔

42۔ یہاں پہلا مصرعہ قدرے تصرف کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اصل مصرعہ اس طرح ہے:

زِ بادہ خوردنِ پنہاں ، ملول شد حافظ

(شرح دیوان حافظ شیرازیؒ، ردیف میم، غزل نمبر 6، ص: 740۔ نیز دیوانِ حافظ، از حافظ شیرازیؒ، ص: 277)

43۔ یہاں پہلے مصرعے میں تصرف کیا گیا ہے۔ اصل شعر اس طرح ہے:

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارِ برخورد از وصلِ یارے

(مثنویٔ ہفت اورنگ، از مولانا عبدالرحمٰن جامی، ج: 2، ص: 97، طبع: مرکز مطالعاتِ ایرانی، ایران، ۱۲۷۸ھ)

44۔ شرح دیوانِ حافظ، ردیف دال، غزل نمبر 166، ص: 408۔ نیز دیوانِ حافظ، از حافظ شیرازی، ص: 154۔

45۔ 2- البقرہ: 216۔

46۔ 12- یوسف: 33۔

47۔ 62- الجمعۃ: 4۔

48۔ 59- الحشر: 21۔

49۔ اصل شعر اس طرح سے ہے:

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

شاعر محمد علی خان رشکی۔ (اُردو کے ضرب المثل اشعار تحقیق کی روشنی میں، از شمس الحق (رفیق احمد نقش)، طبع: فکشن ہاؤس، 2003ء)

50۔ 94- الم نشرح: 4۔

51۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ: آپؒ صفر المظفر 1270ھ / دسمبر 1852ء میں نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آبائی قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارن پور میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کی غرض سے دیو بند اور سہارن پور تشریف لے گئے۔ ان کے اساتذہ میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مولانا انصار علیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا محمد مظہر نانوتویؒ اور مولانا فیض الحسن سہارن پوریؒ ہیں۔ تحصیل علم کے

www.rahimia.org

بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور دیو بند میں تدریس کے فرائض سر انجام دیے۔ مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرّس رہے۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بیعت و خلافت سے سرفراز کیا۔ انھوں نے ولی اللّٰہی تحریک میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ شانہ بہ شانہ کردار ادا کیا۔ حضرت سہارن پوریؒ تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلہ میں قائم کیے گئے بورڈ کے رُکن تھے۔ 1916ء میں حجاز میں قیام کے دوران حضرت شیخ الہندؒ وزیر جنگ حکومتِ ترکی انور پاشا سے بھی ملے۔ مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے تقریریں کی۔ حضرت سہارن پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ نے تنہائی میں انور پاشا اور جمال پاشا سے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور ولی اللّٰہی تحریک کی حمایت میں غالب پاشا کا حاصل کیا ہوا خط ان کو دکھایا گیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم پر حضرت سہارن پوریؒ واپس ہندوستان آگئے۔ پولیس نے ان کو اور دیگر کو گرفتار کر کے نینی تال جیل بھیج دیا۔ ان حضرات کی ہند تشریف آوری سے قبل ہی حکومت نے ڈیفنس ایکٹ رول کے تحت گرفتاری کے آرڈر جاری کر دیے تھے۔ رہائی کے بعد بھی انھوں نے انگریز مخالف نظریات کی ترویج میں کردار ادا کیا۔
حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۵ر ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ/ 12ر اکتوبر 1927ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تدفین جنت البقیع میں حضرات اہلِ بیت کی آخری آرام گاہوں کے قریب کی گئی۔
(مزید معلومات کے لیے دیکھیے: حیات خلیل، از محمد ثانی حسنی ندوی)

52۔ اس مصرعے میں تصرف کر کے برمحل بیان کیا گیا ہے۔ یہ مصرعہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک شعر کا ہے۔ مکمل شعر اس طرح ہے:

شکر اللہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست آفریں بادِ بریں ہمتِ مردانہ ما

(دیوانِ حضرت غوث الاعظمؒ مع منظوم اُردو ترجمہ، مترجم: عبدالقادر فدائی، ص: 1، طبع: مکتبہ الحبیب، الہ آباد)

53۔ یہ مصرعہ شیخ سعدی شیرازیؒ کی ایک غزل کا ہے۔ شعر اس طرح سے ہے:

تا خبر دارم از او بے خبر از خویشتنم باوجودش زمن آواز نیاید کہ منم

(کلیاتِ سعدی، از شیخ سعدی شیرازیؒ، ص: 758، طبع: سازمان چاپ و انتشارات جاویدان، ۱۳۵۱ھ)

54۔ مثنوی معنوی، از مولانا جلال الدین رومیؒ، مترجم: مولانا قاضی سجاد حسین، ج: 5، ص: 16، ناشر: سب رنگ کتاب گھر، دہلی، 1976ء۔

55۔ مثنوی معنوی، از مولانا جلال الدین رومیؒ، ج: 1، ص: 82۔

56۔ حضرت مولانا خواجہ محمد عبدالحئیؒ فاروقی: 1887ء میں ضلع گورداس پور کی تحصیل ''شکر گڑھ'' (اب پاکستان کے ضلع نارووال کی تحصیل) میں خواجہ عبدالرحیم کے گھر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد میٹرک کا امتحان ہائی سکول گورداس پور سے پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن کیا۔ دینی تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم دیو بند تشریف لے گئے۔ 1913ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے دورۂ حدیث پڑھا اور سندِ فضیلت حاصل کی۔ دارالعلوم دیو بند میں ''جمعیت الانصار'' اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ 1913ء میں امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے دہلی کی فتح پوری مسجد میں ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' قائم کیا تو موصوفؒ اس سے منسلک ہوگئے۔ اسی دوران گورنمنٹ کالج میرٹھ میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ جولائی 1915ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے حضرت سندھیؒ کی مشاورت سے کلکتہ میں ایک ادارہ ''دارالارشاد'' قائم کیا۔ مولانا خواجہ عبدالحئیؒ میرٹھ کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر اس ادارے سے منسلک ہوگئے۔ 1915ء میں مقامی سطح پر ''تحریکِ ریشمی رومال'' میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ کے مطابق اگست 1915ء میں گورداس پور میں بھی تحریکِ ریشمی رومال کے سلسلے میں لوگوں کو اکٹھا کرتے اور اپنی قومی و ملّی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے رہے۔ ''جنودِ ربانیہ'' کی فہرست میں آپ کا عہدہ ''کرنل'' درج ہے۔ ''رولٹ ایکٹ'' کے خلاف احتجاجی تحریک میں بھرپور حصہ لیا، جس کی پاداش میں ان کی جائیداد ضبط کرلی گئی اور پہلے لاہور، پھر ملتان جیل میں قید کرلیا گیا۔ اکتوبر 1920ء میں رہائی ملی۔ 1920ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ کے مشورے سے جامعہ ملیہ علی گڑھ و دہلی میں شعبۂ تفسیر و

دینیات کے صدر مقرر کیے گئے۔ 30 سال تک جامعہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے رہے۔ 1944ء میں حضرت سندھیؒ کے وصال کے بعد خواجہ صاحبؒ نے قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت کا تعلق قائم کیا۔ 1950ء میں حضرت رائے پوریؒ اور مولانا آزادؒ کی مشاورت سے دہلی سے لاہور منتقل ہوگئے۔ اسی دوران ''انجمن اصلاح و تبلیغ'' سے وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنی زیرِ نگرانی چند رفقا کے تعاون سے ''درسِ قرآن'' کے نام سے قرآنِ حکیم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ خواجہ صاحبؒ قرآنِ حکیم کی تفسیر ''تفسیر القرآن فی معارف القرآن'' کے نام سے لکھنا چاہتے تھے، مگر مکمل نہ کر سکے۔ اس تفسیر کے متفرق حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ خواجہ صاحبؒ فالج کے حملے کے باعث 8/جنوری 1965ء کو تقریباً 78 سال کی عمر میں وصال فرما گئے۔ قبرستان میانی صاحب لاہور میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے قریب ہی مدفون ہیں۔

(تفصیلات کے لیے دیکھئے! مقدمہ تفسیر معارف القرآن از خواجہ عبدالحئی فاروقی، تحریر: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری)

57۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: ان کے والدِ گرامی کا نام مولوی عبدالقادر قدوائی تھا۔ وہ سکول میں فارسی کے استاذ رہے۔ انھوں نے ایک انگریز کو فارسی پڑھائی تھی۔ اس کی سفارش سے فوجداری عدالت کے افسر بنے۔ پھر تحصیل دار ہوئے حتیٰ کہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مولانا عبدالماجد کی ولادت ۱۶/شعبان ۱۳۰۹ھ / 16/ مارچ 1892ء کو قصبہ دریاباد لکھنؤ میں قدوائی خاندان میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ پھر پرائمری سے دسویں تک کی تعلیم سیتا پور کے ہائی سکول سے حاصل کی۔ جولائی 1908ء میں کیننگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ جولائی 1910ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا اور پھر بی۔اے میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایم۔اے فلسفہ کرنے کا ارادہ کیا، لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ اس کے بعد دس (1909ء سے 1918ء) سال تک دین کے حوالے سے تشکیک کی حالت میں رہے، بلکہ ملحد اور بیزار بن کر مقالات اور مضامین لکھتے رہے۔ اس الحاد کی حالت سے انھیں نکالنے میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا سیّد سلیمان ندوی اور آخر میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا بڑا کردار رہا ہے۔ حضرت تھانویؒ سے ان کا تعلق 1928ء سے 1943ء تک رہا۔ اس آخر زمانے میں وہ حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوگئے۔ حضرت تھانویؒ کی سوانح ''حکیم الامت'' اور ''تفسیر ماجدی'' کے علاوہ بیس کے قریب ان کی تصنیفات ہیں۔ 6/جنوری 1977ء میں پچاسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

(عبدالماجد دریابادی؛ احوال و آثار، از ڈاکٹر تحسین فراقی، طبع: ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور پاکستان)

58۔ مولانا نصراللہ خاں عزیز: 1928ء میں (مولانا) بدرالحسن جلالی کے ساتھ ''جوائنٹ ایڈیٹر'' (معاون مدیر) کی حیثیت سے اخبار ''مدینہ'' بجنور میں ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ بدرالحسن بدر کے بعد اخبار مذکورہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1930ء کی ستیہ گرہ میں ''مدینہ'' اخبار کا جو بھرپور کردار ملتا ہے، اس کا سہرا مولانا نصراللہ خاں کے سر جاتا ہے۔ اخبار کا ولولہ خیز کردار آپؒ کی مساعی سے ہی مزین ہے۔ 1933ء میں اخبار ''مدینہ'' کو روزنامہ بنایا گیا تو اس کے پہلے مدیر مسئول نامزد ہوئے۔ (تاریخ مدینہ بجنور، از پرویز عادل ماحی، ص: 122)

مولانا نصراللہ خاں 18/فروری 1897ء کو گوجرانوالا کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گوجرانوالا میں حاصل کی۔ ترکِ موالات کی تحریک کے دوران جب سرکاری امداد سے ہٹ کر اسکولز بنانے کا سلسلہ شروع ہوا تو گجرات میں ہائی سکول قائم کیا گیا، جس میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر کے طور پر آپ کا تقرر کیا گیا۔ تعلیم و تربیت کا شعبہ چھوڑ کر صحافت کی جانب مائل ہوئے۔ اس کے بعد لاہور کے مختلف رسائل میں ملازمت اختیار کی۔ 1936ء میں اخبار ''زمیندار'' سے منسلک ہوگئے۔ 1937ء میں ''پاسبان'' کے نام سے اپنا ذاتی ہفت روزہ جاری کیا۔ 1938ء میں ہفت روزہ 'زمزم' کے مدیر مقرر ہوئے۔ 1948ء میں روزنامہ ''تسلیم'' سے منسلک ہوئے۔ شاعری میں عزیزؔ تخلص کرتے تھے۔ قلیل علالت کے بعد 2/جولائی 1976ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ میانی صاحب قبرستان لاہور میں سپردِ خاک ہیں۔ (تذکرہ معاصرین، از مالک رام، ج: 4، ص: 80، طبع: مکتبہ جامعہ، دہلی، 1982ء)

59۔ سیّد جالب دہلوی: ان کی ولادت مارچ 1874ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کے والد میر وزیر علی تجارت کے شعبے سے وابستہ تھے۔ شاہی خاندان

کے ساتھ اچھے مراسم کی وجہ سے جالب دہلوی کی طبیعت اور زبان و بیان میں نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم اینگلو عربک سکول میں حاصل کی۔ 1888ء میں مڈل اور 1890ء میں انٹر پاس کر لیا۔ عربی و فارسی کی تعلیم شاہی معلم مولوی اشرف علی سے حاصل کی۔ اخبار ''دکن گزٹ'' میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1897ء میں لاہور آ گئے اور ''پیسہ'' اخبار میں جوائنٹ ایڈیٹر کے فرائض نبھاتے رہے۔ شریف، ہمدرد، رسالت وغیرہ رسائل میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ 14/ مارچ 1930ء کو کلکتہ سے اپنا اخبار ''ہمت'' بھی نکالا اور 13 سال تک ''ہمدم'' لکھنؤ میں ایڈیٹر رہے۔ شاعری میں جالب تخلص کرتے تھے۔ پوری عمر صحافتی میدان میں بھرپور محنت اور جفاکشی سے کام کیا۔ بالآخر 47 سال کی مصروف ترین اور قلیل عمر میں 15/ جولائی 1930ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

(شاگردانِ داغ کی ادبی خدمات، از ڈاکٹر اصغر کمال، ص: 166، ناشر: ڈاکٹر اصغر کمال، دہلی، 2003ء)

60۔ سیٹھ یعقوب حسن: 1875ء میں ناگ پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ناگ پور اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ اور 1901ء میں کاروبار کی غرض سے مدراس منتقل ہو گئے۔ سیٹھ صاحب کامیاب کاروباری شخصیت کے ساتھ ساتھ متحرک حریت پسند اور سیاست دان بھی تھے۔ ہندوستان میں سیاست پر گہری نظر تھی۔ بین الاقوامی کاروباری ایجنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ قرآن حکیم اور دیگر عربی کتب پر عبور ہونے کی وجہ سے ''مولانا'' کے لقب سے بھی پکارے جاتے تھے۔ مدراس تشریف لائے تو سیاسی سرگرمیوں میں بھی کردار ادا کیا۔ اور مدراس کارپوریشن کے ممبر کے طور پر منتخب ہو گئے۔ اُن کا مسلم لیگ کے بانی اراکین میں شمار ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کی نمائندگی کرتے ہوئے بارہا برطانیہ کے دورہ جات بھی کیے۔ لکھنؤ پیکٹ کی تیاری میں ان کا نمایاں کردار تھا۔ 1916ء میں مدراس لیجسلیٹو کونسل کے ممبر کے طور پر منتخب ہوئے۔ انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور خلافت تحریک میں سرگرم کردار ادا کیا۔ 1919ء میں 6 ماہ کے لیے قید کیے گئے۔ 21-1920ء میں مرکزی خلافت کمیٹی میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ 1921ء میں تحریکِ عدمِ تعاون اور تحریکِ خلافت میں سرگرم کردار ادا کیا۔ گرفتار ہوئے۔ 1923ء میں عدمِ تعاون کے سلسلے میں اپنے تمام سیاسی عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ مدراس اور اس کے گرد ونواح کے لوگوں کی فلاح و بہبود اور مسائل کے حل کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ کئی فلاحی اداروں میں کردار ادا کیا۔ اپنی تحریروں کے ذریعے بھی ملکی مسائل کو اُجاگر کرتے رہے۔ برِعظیم کے مختلف رسائل میں آپ کے مضامین اور رپورٹس شائع ہوتی رہیں۔ 1926ء میں قرآن حکیم کا اُردو ترجمہ ''کتاب الہدیٰ'' کے نام سے کیا۔ 25/ مارچ 1940ء میں مختصر علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

(Muslim India, by Ahmad Saeed, P: 337 .Institute of Pakistan historical society Lahore)

61۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ: 1875ء کو شاہ جہان پور کے محلّہ سن زئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شاہ جہان پور میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کی غرض سے دیوبند تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے عزیز ترین اور ذہین ترین شاگردوں میں ہیں۔ 1897ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کر کے واپس اپنے شہر شاہ جہان پور آ گئے اور مدرسہ عین العلم میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1903ء میں مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی میں صدر مدرّس اور مفتی کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ 1911ء میں دارالعلوم دیوبند میں ہونے والے اجتماع ''جمعیت الانصار'' میں مدرسہ امینیہ سے بھی طلبا کی شرکت کروائی گئی۔ 1913ء میں جنگِ بلقان کے موقع پر ترکوں کی امداد کے لیے فنڈ اکٹھا کیا۔ 1917ء میں حضرت شیخ الہندؒ و دیگر اسیران کی رہائی کے لیے ''انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام'' دہلی میں قائم ہوئی۔ حضرت مفتی صاحبؒ اس کے بانیوں میں سے تھے اور اس انجمن کے اشاعتی منصوبوں کے مشیر اور نگران بھی رہے۔ 1918ء میں انھوں نے حضرت حضرت شیخ الہندؒ کے سوانح اور ایامِ اسیری پر ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا۔ 1919ء میں جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے پر حکومتِ برطانیہ نے فتح کا جشن منانے کا فیصلہ کیا تو مفتی صاحبؒ نے خلافت کمیٹی کانفرنس دہلی میں اس جشن کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی، جسے منظور کر لیا گیا۔ دسمبر 1919ء میں جب جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا تو مفتی صاحبؒ کو نائب صدر بنایا گیا اور صدارت حضرت شیخ الہندؒ کے لیے محفوظ رکھی گئی، جو اس وقت مالٹا میں نظر بند تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد جمعیت کے دوسرے اجلاس

1920ء میں صدر منتخب ہوئے۔ 1930ء میں سول نافرمانی کی تحریک میں تقریر کرنے کی پاداش میں پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ 1932ء میں دوسری بار سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو مفتی صاحبؒ کو پہلا ''ڈکٹیٹر'' بنایا گیا۔ برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کر کے اس میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی تو عالمِ اسلام میں بے چینی پھیل گئی۔ اس سلسلے میں 1938ء میں قاہرہ میں منعقد ایک کانفرنس میں شریک ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کے مؤقف کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا۔ ان کی تصانیف میں اصولِ اسلام، تعلیم الاسلام، کفایت المفتی کے علاوہ بے شمار رسائل شامل ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو میں شعر کہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''روض الریاحین'' قابلِ ذکر ہے۔ زندگی کے آخری تین ماہ شدید علالت میں گزارنے کے بعد یکم/جنوری 1953ء کو وفات پا گئے۔ ان کی تدفین دہلی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے احاطے کے قریب عمل میں لائی گئی۔ (مفتی اعظم ہند مفتی کفایت اللہؒ، از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوریؒ)

62۔ 15-الحجر: 9۔

63۔ 75-القیامہ: 19۔

64۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ: پیدائش یکم/ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ/ 5/دسمبر 1888ء کو دہلی میں حافظ نواب مرزا کے ہاں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی عبدالمجید مصطفیٰ آبادی سے حاصل کی۔ حفظِ قرآنِ حکیم مدرسہ حسینیہ مٹیا محل بازار دہلی میں مکمل کیا۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ 1908ء سے 1910ء تک دہلی کے فوارہ چوک میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ سامنے ہی جامعہ امینیہ تھا، جس میں مفتیٔ اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ صدر مدرس تھے۔ اسی مدرسے کے طلبا کے ذریعے موصوفؒ مفتی صاحبؒ کے زیرِ تربیت آ گئے۔

1919ء میں جب مفتیٔ اعظمؒ نے جمعیت علمائے ہند کے قیام کے لیے اکابرین سے مذاکرات کیے تو اس میں مولانا احمد سعید دہلویؒ مفتی صاحبؒ کے ساتھ ہر لمحہ شریک رہے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے دوران آپؒ کو بھی 8 بار جیل جانا پڑا۔ مختلف جیلوں میں ان کو بان بانٹنے اور چکی پیسنے کے علاوہ کئی اَور مشقتوں سے گزرنا پڑا، جو بہت زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ اسی زمانۂ اسیری کی یاد میں اپنا تخلّص ''اسیر'' لکھا کرتے تھے۔ 1920ء سے 1926ء کے دوران بے شمار تبلیغی وفود مختلف علاقوں میں شدھی تحریک کے سدِباب میں بھیجے گئے تھے، جن کا تمام انتظام مفتیٔ اعظمؒ کی سربراہی میں مولانا موصوفؒ نے ہی کیا۔

مولانا موصوفؒ تقریباً 20 کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ سب سے بڑا اور مرقع علمی کام قرآنِ حکیم کی اُردو تفسیر ہے، جسے 1956ء میں مکمل فرمایا اور ان کے وصال کے بعد ''تفسیر کشف الرحمٰن'' کے نام سے شائع ہوئی۔ مولانا موصوفؒ کی فصاحت و بلاغت اور خوش گفتاری و شیریں مقالی ضرب المثل تھی۔ اس لیے ہندوستان کے اہلِ علم نے انھیں ''سَحبانُ الھند'' کا خطاب دیا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ ہمیشہ ان کو ''اعلیٰ حضرت'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ایسے بے مثل خطیب نے بھی مولانا موصوفؒ کو ان الفاظ میں مخاطب کیا ہے کہ: ''مولانا! اگر آپ ایسی ہی تقریر کیا کرتے ہیں تو دنیائے اسلام میں آپ کا جواب نہیں ہے۔''

1953ء میں مدرسہ امینیہ دہلی کا مہتمم بنایا گیا۔ 1955ء میں شرپسندوں کی جانب سے ان پر جان لیوا حملہ بھی ہوا۔ 1957ء میں مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے وصال کے بعد جمعیت علمائے ہند کے صدر مقرر ہوئے۔ 4/دسمبر 1959ء بروز جمعۃ المبارک کو وفات پائی۔ مولاناؒ کی تدفین ''مہرولی'' میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیارِ کاکیؒ کی درگاہ کے باہر حضرت مفتیٔ اعظم مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے پہلو میں کی گئی۔

(مزید معلومات کے لیے دیکھئے! مولانا احمد سعید دہلوی ایک سیاسی مطالعہ، از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوریؒ)

65۔ صحیح بخاری، حدیث: 116۔

66۔ سیّد الملّت حضرت مولانا سیّد محمد میاں دہلویؒ: آپؒ کی ولادت سیّد منظور محمدؒ کے گھر ۱۲/رجب ۱۳۲۱ھ/4/اکتوبر 1903ء بمقام محلّہ پیرزادگان دیوبند میں ہوئی۔ قرآنِ حکیم کی ابتدائی تعلیم اور فارسی سیکھنے کے بعد انھیں 1916ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل کروایا گیا، جہاں وہ 1925ء تک زیرِ تعلیم رہے اور دینی علوم کی تکمیل کی۔ 1926ء میں مدرسہ حنفیہ شاہ آباد میں تدریس کا آغاز فرمایا۔ سیاسی زندگی کا

آغاز 1926ء میں جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کلکتہ میں شرکت سے ہوتا ہے۔ 1929ء میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے قائم کردہ مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں مدرس کے طور پر تعینات ہوئے۔ 1929ء میں ہی جمعیت علما امروہہ کے اجلاس میں مولانا محمد میاںؒ کو پہلے نائب ناظم اور پھر ناظم کے طور پر نامزد کیا گیا۔ 1932ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے دوران جمعیت علمائے ہند نے تمام تنظیمی عہدوں کو ختم کرکے ''ڈکٹیٹر شپ'' کا نظام قائم کیا تھا، مولاناؒ اس کے نوویں ڈکٹیٹر تھے۔ 1940ء میں ولی اللّٰہی تحریکِ آزادی سے متعلق ایک مایۂ ناز کتاب ''علمائے ہند کا شان دار ماضی'' لکھی تو انگریز سامراج نے اس کی ضبطی اور پابندی لگائی۔

مولانا سیّد محمد میاںؒ 1928ء اور 1944ء کے دوران 5 بار گرفتار کیے گئے اور قید بامشقت کی سزا ہوتی رہی۔ 1945ء میں وہ جمعیت علمائے ہند کے ناظم مقرر ہوئے۔ 1949ء میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے دینی تعلیمی مہم کو بھی اپنے پروگرام کا حصہ بنایا اور اس سلسلے میں متعدد مفید رسائل تحریر فرمائے۔ 1963ء میں جمعیت علمائے ہند کی نظامت سے دست بردار ہونے کے بعد مولاناؒ مدرسہ امینیہ دہلی میں تاحیات مدرّس کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کی کئی تصانیف 'حوالہ' کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ اس وجہ سے ان کا ایک لقب ''مؤرخِ ملت'' بھی ہے۔ مولاناؒ نے 100 کے قریب کتب تحریر فرمائی ہیں۔ مراد آباد سے ماہنامہ ''قائد'' کا اجرا بھی فرمایا، جس کا شمار برعظیم کے مشہور مجلّات میں کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد میاںؒ کی وفات ۱۲/شوال ۱۳۹۵ھ/ 22/اکتوبر 1975ء کو 74 سال کی عمر میں ہوئی اور وہ دہلی میں آسودۂ خواب ہیں۔'' (تفصیلات کے لیے دیکھیے! تذکرہ سیّد الملتؒ، مرتبہ: مولانا ضیاء الحق خیر آبادی)

67۔ حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ: آپؒ ۶/ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ / 7/مئی 1908ء کو ضلع مردان کے گاؤں مہابت آباد میں سیّد زکریا بادشاہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپؒ حضرت سیّد آدم بنوریؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ مزید تعلیم کی غرض سے کابل کے ایک مکتب میں داخل ہوئے۔ بعد ازاں دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ ۱۳۴۵ھ / 1926ء سے ۱۳۴۷ھ / 1928ء تک دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لے گئے اور دورۂ حدیث کی تکمیل یہیں سے کی۔ آپؒ نے خاص طور پر حضرت مولانا سیّد انور شاہ کشمیریؒ سے استفادہ کیا۔ 1930ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد چار سال تک جمعیت علمائے ہند میں کام کیا اور ضلع پشاور کے صدر رہے۔ پھر تدریس کے لیے ڈابھیل چلے گئے اور وہاں آخر میں صدر مدرّس و شیخ الحدیث کے طور پر تقرر ہوا۔ 1953ء میں کراچی میں جامعہ علومِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ آخری دم تک مہتمم کے فرائض سرانجام دیے۔ مئی 1973ء میں وفاق المدارس پاکستان کے صدر کے طور پر منتخب ہوئے۔ 1974ء میں عالمی مجلس تحفظِ ختم نبوت کے پانچویں امیر مقرر کیے گئے۔ تحریکِ ختمِ نبوت میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ کئی انجمنوں اور اداروں میں بھرپور قائدانہ کردار ادا کیا۔ ۳/ذی قعدہ ۱۳۹۷ھ / 17/اکتوبر 1977ء کو خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جامعہ علومِ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے احاطے میں سپردِ خاک کیے گئے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھیے! ماہنامہ ''بینات'' کا حضرت بنوری نمبر، بابت جنوری فروری 1978ء)

☆

www.rahmia.org

ترجمۂ حضرت شیخ الہندؒ کی سب سے پہلی اشاعت کے ٹائٹل پیج کا عکس

جملہ حقوق محفوظ اور رجسٹری شدہ ہیں

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ

اس کتاب میں کچھ شک نہیں

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ کہ اُس کے فضل کرم سے

۱۳۴۴ھ

مترجم

قرآن مجید

ترجمہ حل شیخ المشائخ قطب الاقطاب رأس المحدثین زبدۃ المفسرین

حضرت شیخ الہند مولانا و سیدنا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ

مع

فوائد (موضح الفرقان) سورۃ البقرہ و سورۃ النساء

محمد حسن [illegible] طبع کیا

بار اول ۔۔۔ ۵۰۰ جلد

علمی لیکچرز

''سماجی تشکیلِ نو کے اصول اسوہ حسنہ کی روشنی میں''

خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری

تاریخ: ۲۲/ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ/ 20/نومبر 2019ء، بروز بدھ

مقام: بہادر آڈیٹوریم، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، کیمپس، لیہ

(چند سال قبل ملک کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں حضرت مولانا ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن مدظلہٗ مسئول موسیٰ پاک چیئر اور شعبہ علومِ اسلامیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب نے حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ کو شعبۂ اسلامیات میں لیکچر کی دعوت دی۔ چناں چہ سب سے پہلے انھوں نے مؤرخہ 3/ نومبر 2016ء کو شعبہ علومِ اسلامیہ کے سیمینار ہال میں ''اسلام اور عدلِ اجتماعی'' کے عنوان پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کے بعد اپریل 2017ء میں حضرت آزاد رائے پوری نے ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر خطبات کی ایک لیکچر سیریز دی تھی، جس میں درج ذیل موضوعات پر چار لیکچرز دیے گئے تھے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف 2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین

3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت 4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات

یہ تمام لیکچرز اپنی اہمیت کے سبب آڈیو ریکارڈنگ سے تحریری صورت میں قلم بند کیے گئے۔ پھر نظرِ ثانی، ذیلی عنوانات اور حوالہ جات کی تخریج کے بعد یہ علمی سرمایہ ''شعور و آگہی'' کے گزشتہ شماروں میں پیش کیا جاچکا ہے۔

۱۴۴۱ھ کے ربیع الاوّل کے مہینے میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے بہادر کیمپس لیہ میں ''سماجی تشکیلِ نو کے اصول اسوہ حسنہ کی روشنی میں'' کے عنوان سے مؤرخہ ۲۲/ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ/ 20/نومبر 2019ء، بروز بدھ کو ایک لیکچر کا اہتمام کیا تھا۔ اس موقع پر سب سے پہلے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) کے تعارف کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہٗ کا تعارفی خطاب ہوا۔ اس کے بعد حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مذکورہ بالا عنوان پر لیکچر دیا۔ سٹیج پر حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہٗ، حضرت مولانا مفتی محمد مختار حسن مدظلہٗ بھی رونق افروز تھے۔ لیکچر کے اختتام پر ڈاکٹر محمد حسن ڈائریکٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی بہادر کیمپس لیہ نے صدارتی کلمات پیش کیے اور معزز مہمانوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

اس شمارے میں یہ لیکچر ترتیب و تدوین کے بعد قارئین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان لیکچرز سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! مدیر)

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے قیام کے اغراض و مقاصد

از حضرت مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی مدظلہ

نحمده و نصلّي علىٰ رسوله الكريم، أمّا بعد!

میرے قابلِ احترام صدرِ مجلس اور میرے قابلِ احترام حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ! معزز مہمانانِ گرامی اور قابلِ احترام معزز حاضرین!

ہماری یہ بہت ہی سعادت کی بات ہے کہ آج ہم ''سماجی تشکیلِ نو کے اصول: اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں'' کے موضوع پر گفتگو کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ دینِ اسلام، قرآن حکیم، نبی کریمؐ کی سیرتِ مبارکہ اور اُسوۂ حسنہ کی تعلیمات ہمارے اجتماعی مسائل کا حل کیا پیش کرتی ہیں۔ آج دنیا سائنسی ترقی میں بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی ہے، لیکن انسانیت کو جو مقام ملنا چاہیے تھا، آج وہ اسّی نوّے فی صد آبادی میں نظر نہیں آتا۔ قوموں کو عزت اور وقار اپنے قومی نظام اور سسٹم کی بہتری سے ملتا ہے۔ جتنا اچھا عزت والا سسٹم موجود ہو، قومیں اُتنی ہی عزت حاصل کرتی ہیں۔ اگر سسٹم میں غلامی ہو، معاشی نظام میں بھوک اور افلاس ہو، سماج میں بے انصافی ہو، انتشار اور افتراق سماج میں موجود ہو، ترقی کا عمل رُکا ہوا ہو، انسان مایوسی کی طرف بڑھ رہا ہو تو یہ علامت ہوتی ہے کہ اب اس دنیا کا جو سسٹم ہے، وہ ایسی قیادت کے ہاتھ میں ہے، جو انسانیت کی رہنمائی اور ترقی کا، پوری انسانیت کی ترقی کا صحیح پروگرام نہیں رکھتے۔

حضرت نبی کریمؐ کے زمانے میں بھی یہی حالات تھے۔ جہالت تھی، بھوک اور افلاس تھا، انتشار تھا، خاندان، قبائل آپس میں لڑ رہے تھے، مذہب فرسودہ ہو چکا تھا۔ قیصر و کسریٰ کے غلبے نے انسانیت کو تقسیم کیا ہوا تھا۔ مسجدِ حرام پر کفر و شرک کے حاملین کا قبضہ تھا۔ اور دنیا ایک زوال کی طرف تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایسے حالات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بہت ہی کرم کیا کہ ہمارے آخری پیغمبر سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بعثت سے ہمیں نوازا۔ آپؐ نے مکہ معظّمہ میں ایک بڑی اچھی جماعت تیار کی۔ مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی قائم کی اور مسجدِ نبوی کی تعلیمات مسجدِ حرام کی آزادی کی تھیں۔

مسجدِ نبوی میں تیار ہونے والی جماعت کا نظریہ پوری انسانیت میں عدل و انصاف کے غلبے کا تھا، ظلم مٹانے کا تھا۔ قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں اللہ کی جانب سے ایک ہمیں بہت بہترین تعلیم دی گئی ہے، اور یہ بڑی اونچی تعلیم ہے۔ جتنی اونچی تعلیم ملتی ہے، انسان اتنا ہی اونچا تیار ہوتا ہے۔ یہ اونچی تعلیم ملی، اس پر صحابہ کرامؓ کی تربیت ہوئی۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے، حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، سینکڑوں صحابہؓ ہیں۔ یہ مسجدِ نبوی سے تیار ہوئے۔ یہ حضرات مسجدِ نبوی کے آزادی اور حریت کے نظریے پر تیار ہوئے۔ انھوں نے انٹرنیشنل سطح پر ایک ایسا نظام دیا، جس میں تعلیم بھی مفت تھی، علاج بھی مفت تھا، جس میں آزادی بھی تھی، رنگ و نسل اور مذہب و ملت کی بنیاد پر تفریق نہیں تھی۔ ہر قوم کو مذہبی آزادی

www.rahimia.org

بھی تھی، سیاسی اور معاشی آزادی بھی تھی۔ یہ اُس وقت کے حالات تھے۔ حضرت نبی کریمؐ نے جماعت تیار کر کے انسانی سوسائٹی میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کیا اور دین کو غالب کیا۔ اور انسانیت نے ایک ہزار سال تک اپنی ترقی کی منازل طے کیں۔

آج ہم دورِ غلامی کے اثرات سے دوچار ہیں۔ آج ہم سیاست میں بدامنی کا شکار ہیں۔ ہمارا معاشی نظام ظلم کے اصول پر ہیں۔ وہ انسانیت کی بھوک نہیں مٹا سکا۔ آج ہم قرآن حکیم کے سسٹم کے غلبے سے محروم ہیں۔ ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں، اس سے عقیدت رکھتے ہیں، ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں، لیکن وہ ہمارے تعلیم کے مسائل کیا حل کرتا ہے؟ ہماری معیشت کے مسائل کیسے حل کرتا ہے؟ ہماری ترقی کی راہیں کیسے کھولتا ہے؟ آج عام طور پر ہم اس حوالے سے قرآن حکیم کو نہیں سمجھتے۔

ایسے حالات میں آج ضرورت تھی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جو نبوی حکمتِ عملی کی روشنی میں قرآن حکیم کو بہ طور سسٹم کے سمجھنے کی اہلیت پیدا کرے۔ قوموں کے عروج کے اصول کیا ہیں؟ اس کا تعارف ہو۔ جن قوموں پر زوال آتا ہے، اس کا تعارف ہو کہ وہ کن اصولوں پر چلتی ہیں تو زوال کا شکار ہوجاتی ہیں۔ قرآن حکیم اس میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ سب سے مشکل کام صحیح تعلیم پر قیادت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کے تعلیمی ادارے اگر صحیح تعلیم پر ہوں تو قیادت نیچے سے اوپر آتی ہے۔ اگر کسی قوم کے تعلیمی ادارے قیادت کی صلاحیت والی نسلِ نو کو تیار نہ کریں تو اس سے مفاد پرستی، خودغرضی، لالچ پیدا ہوتا ہے۔

ابھی دوست نے ایک آیت تلاوت کی تھی:

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿٦٦﴾ (1)

جس دن قیامت کا دن قائم ہوگا، جہنمی جہنم میں جائیں گے تو وہ کیا کہیں گے؟ اے اللہ! ہمیں، ہمارے سرداروں نے گمراہ کیا تھا، دنیا میں ہم نے ان کی اطاعت کی تھی، اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ (2) اے اللہ! ان کو ڈبل عذاب دے، انھوں نے ہمیں دھوکا دیا تھا، جھوٹ بولا تھا۔ یہ کیوں حالات پیدا ہوئے؟ اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ نئی قیادت سوسائٹی کے اندر جو انسانیت کا شعور رکھتی ہے، شعوری بنیادوں پر مسائل کا حل تلاش کرتی ہے۔ اس کا سیاسی شعور بھی بہت اونچا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم سے لیا ہے۔ قرآن حکیم فرعون کی سیاست کے اصول کیا بتاتا ہے؟ اور موسیٰ علیہ السلام کی سیاست کے اصول کیا بتاتا ہے؟ نمرود کی سیاست کے اصول کیا تھے اور دینِ حنیف ابراہیم علیہ السلام کے دین کی سیاست کے کیا علوم تھے؟ ابوجہل، عتبہ، شیبہ اور ابولہب کی سیاست کن اصولوں پر تھی؟ اور نبی کریمؐ نے کن اصولوں پر سوسائٹی کے اندر ایک اچھا سیاسی، معاشی اور سماجی نظام قائم کیا؟ یہ قیادت کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جس نظریے پر جو تعلیمی ادارہ بنتا ہے، اسی کے مطابق اس کے طلبا تیار ہوتے ہیں۔ آج اگر غلامی کے نظریے پر ہم تعلیمی ادارہ بنائیں گے تو غلام پیدا ہوں گے، کلرک پیدا ہوں گے، اگر آزادی اور حریت کے نظریے پر ہم تعلیمی ادارہ بنائیں گے تو اُس کے رجالِ کار مسجدِ نبوی کی طرح انسانی سوسائٹی میں بہت بڑی تبدیلی لانے کا باعث بنتے ہیں۔

ادارہ رحیمیہ 2001ء میں حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے قائم کیا تھا۔ آپؒ ولی اللّٰہی سلسلے کی شخصیت ہیں۔ جو تحریک آزادی ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کے اندر چلی، وہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور اُن کی جماعت نے چلائی تھی۔ اس میں رجالِ کار آزادی اور حریت کے مجاہدین پیدا ہوئے تھے، حضرت اقدس شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کا تعلق اس آزادی اور حریت کی خانقاہ کے ساتھ ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، جن کو ہم ''اسیرِ مالٹا'' کہتے ہیں، آپؒ

نے مالٹا کی جیل برداشت کی ہے۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، اُن کے دستِ راست تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اور شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ آزادی اور حریت اور تحریکِ ریشمی رومال اور دیگر تحریکات کے بانیین میں سے تھے۔ اس کے سرپرستان تھے۔ اس کے سربراہ تھے۔ مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کا نظریہ یہ ہے کہ ہمارے آج کے تعلیمی اداروں میں، چاہے وہ کالجز ہوں یا مدارس، ان میں ایسے لوگ پیدا ہونے چاہئیں، جن کا شعور اجتماعی ہو، انسانیت گیر ہو۔ عالم گیر ہو۔ فنون کی تعلیم کالج سے ملے، ڈاکٹر بنے، اچھا انجینئر بنے، اچھا وکیل بنے، اچھا جج بنے، اور دور کے تقاضے کے مطابق سائنسی ترقیات کے حامل بنیں۔ یہ فنون کی تعلیم ہے۔ پھر قرآن حکیم اور حدیثِ پاک کی تعلیم اور اُسوہ حسنہ سے انھیں نوجوانوں کی ایسی تربیت ہو کہ یہ قیادت کی اہلیت پیدا کرلیں۔ قیادت کی اہلیت پورے سسٹم کی جامع ہوا کرتی ہے۔ اور فنون کی تعلیم کسی ایک شعبے سے وابستہ ہوتی ہے۔

اس لیے ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ میں قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں کالج کے نوجوان کو، مدارس کے نوجوان کو، پروفیسرز کو اور وکلا کو جو بھی ہمارا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے، اس کو قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں اور اُسوہ حسنہ کی تعلیم کی روشنی میں اور صحابہ کرامؓ کے اُسوہ کی روشنی میں انھوں نے جو نظام قائم کیا، پھر صحیح تاریخ کا تعارف کرانا، سسٹم کے طور پر دین کو پیش کرنا ہے۔ انسانیت کے اجتماعی مسائل کا حل دینِ اسلام کے پلیٹ فارم سے سکھانے کے لیے اس ادارے کا بنیادی طور پر قیام عمل میں لایا گیا۔

آج الحمدللہ! اس میں قرآن حکیم کی تفسیر بھی ہوتی ہے تو غلبہ دین کے نظریے سے ہوتی ہے۔ محض ثواب کے نظریے سے نہیں۔ سوسائٹی میں دین کیسے غالب آئے گا؟ اور یہ نظامِ سرمایہ داری، یہ نظامِ سود، یہ بھوک پیاس پیدا کرنے والے نظام، جن کی وجہ سے افریقا اور ایشیا میں بھوک ناچ رہی ہے، یہ نظام کیسے بدلیں گے؟ اور ان کی جگہ پر انسانیت کی ترقی کا نظام کیسے وجود میں آئے گا؟ اس اصول پر قرآن حکیم، اسی اصول پر سیرتِ نبویؐ، اسی اصول پر سیرتِ صحابہؓ اور پھر اسی اصول پر جن اولیاء اللہ نے انسانی سوسائٹی میں کوئی بنیادی کردار ادا کیا ہے، اس کی خدمت کی ہے، اپنی ذمہ داری نبھائی ہے، اس کے تاریخی تسلسل کے ساتھ یہاں شریعت بھی پڑھائی جاتی ہے، طریقت بھی سکھائی جاتی ہے۔ سیاست بھی سکھائی جاتی ہے۔ اور دین تین ہی چیزوں کا نام ہے: شریعت، طریقت اور سیاست کا۔ اس پر الحمدللہ! آج ہزاروں علما، ہزاروں پروفیسرز، کالج کے نوجوان محنت کررہے ہیں اور اپنے اس دور میں جس چیز کی ضرورت ہے، اس کے مطابق آگے بڑھ رہے ہیں۔

ہم دوستوں سے گزارش کریں گے کہ حضرت اقدس کی بات کو توجہ سے سنیں۔ انشاء اللہ آپ کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہوگا اور اپنے نوجوانوں سے کہیں گے کہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل قومی شعور کے ساتھ پیدا کرو۔ اجتماعی شعور کے ساتھ آگے بڑھو۔ انسانیت کے اجتماعی مسائل کو سمجھو۔ آج کے دور کے چیلنجز کیا ہیں؟ اس کے مقابلے کی اہلیت پیدا کرو۔ تمھارے سامنے سرمایہ داری کا چیلنج ہے، غربت کا چیلنج ہے، تعلیم کے مہنگا ہونے کا چیلنج ہے۔ علاج نہ ملنے کا چیلنج ہے۔ زوال کا چیلنج ہے۔ اگر نوجوان نے آج بھی سچے دل کے ساتھ غلبے کی نیت سے قرآن حکیم کو اپنے سینے سے لگا لیا اور نبی کریمؐ کے اسوہ حسنہ، انقلابی حکمتِ عملی کو اپنے سینے سے لگا لے تو ان تمام مسائل کا حل انشاء اللہ العزیز یہ آج بھی دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہے۔ اور اپنے اندر قیادت کی اہلیت پیدا کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو قرآن حکیم کا فہم نصیب فرمائے اور سیرت النبیؐ کو آج کے دور کے تقاضے کے مطابق سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین۔

سماجی تشکیلِ نو کے اصول اسوہ حسنہ کی روشنی میں

خطاب حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری

تاریخ: ۲۲؍ربیع الاوّل ۱۴۴۱ھ/ 20؍نومبر 2019ء، بروز بدھ

مقام: بہادر آڈیٹوریم، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، کیمپس، لیہ

www.rahimia.org

خطبہ مسنونہ

نحمده و نصلّی علیٰ رسوله الكريم، أمّا بعد! فأعوذ بالله من الشّيطان الرّجيم. بسم الله الرّحمٰن الرّحيم. قال الله تبارک و تعالیٰ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [3] و قال اللّٰه تعالیٰ: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ [4] و قال النبیّ ﷺ: ''بعثتُ لاُتمّم مكارم الأخلاق''[5] و قال النبیّ ﷺ: ''بعثتُ معلّماً'' [6] و قال النّبیّ ﷺ: ''كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء، كلّما هلک نبیّ خلفه نبیّ آخر، الا! لا نبیّ بعدی سیكون خلفاء فيكثرون.'' [7]

صدق الله مولانا العظيم و صدق رسوله النّبیّ الكريم.

صاحبِ صدر اور عزیز طلبا و طالبات!

سب سے پہلے تو میں اس کیمپس کی انتظامیہ کا شکر گزار ہوں کہ نبی اکرمؐ کی سیرت کے حوالے سے گفتگو کرنے کے لیے یہاں ہمیں مدعو کیا گیا۔ نبی اکرمؐ کی عظیم الشان شخصیت وہ ہے، جو کُل انسانیت کے لیے منارۂ نور ہے۔ قوموں کے لیڈر اور رہنما کسی ایک قوم اور نسل کے لیے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ صرف کسی ایک قوم، کسی ایک نسل، کسی ایک خطے کے نبی اور رہنما نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیائے انسانیت اور تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ کُل انسانیت کے رہنما ہیں۔

آپؐ کا ہدف: انسانیت کی تعلیم و تربیت

نبی اکرمؐ کی جدوجہد کا بنیادی ہدف انسانیت کی تعلیم و تربیت ہے۔ انسانوں کو دنیا اور آخرت میں کامیاب بنانا ہے۔ انسانیت کی شناخت یہ ہے کہ وہ کسی سماجی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسان ''اُنس'' سے مشتق ہے۔ انسان میں اُنس و محبت، شفقت و رأفت موجود ہو تو حقیقت میں وہ انسان ہے۔ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر باہمی سماجی معاہدات اور تعلقات کے ساتھ ایک معاشرہ تشکیل دیتا ہے، ایک سوسائٹی بناتا ہے، ایک سماج کی تشکیلِ نو کرتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کا ہدف انسانی سماج ہوتا ہے۔ جب ہم ''سماج'' کا لفظ بولتے ہیں، یا ''سوسائٹی'' کا اطلاق کرتے ہیں تو دراصل اس سے

مراد انسانی سوسائٹی کے وہ تمام سماجی معاہدات ہیں، جو فرد کے فرد سے، قوموں کے قوموں سے، جماعتوں کے جماعتوں سے وجود میں آتے ہیں۔ جسے پولیٹیکل سائنس کی اصطلاح میں معاہدۂ عمرانی (social contract) کہا جاتا ہے۔ عمرانی نقطۂ نظر سے جو معاہدات وجود میں آتے ہیں اور یہ معاہدات؛ معاہدۂ نکاح سے لے کر معاہدۂ بیع اور قومی اور ملکی نظم و نسق چلانے کے سیاسی، معاشی اور سماجی معاہدات اور قوموں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات اور عالم گیر معاہدوں سے عبارت ہوتے ہیں۔

انسانی سماج کی چار سطحیں

اس برعظیم پاک و ہند کے عظیم مفکر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی سماج کی چار بنیادی سطحیں ہیں، جس سے سوسائٹی ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ سب سے پہلے فرد کی تعمیرِ شخصیت سے معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔ پھر خاندانی نظام وجود میں آتے ہیں۔ پھر قومی سسٹم بنتے ہیں۔ پھر بین الاقوامی نظام وجود میں آتے ہیں۔ ایک فرد جو دوسرے فرد سے باہمی لسانی رابطوں سے آگے بڑھتا ہے تو اس پر اس کا خاندانی نظام بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس پر اس کا قومی اور مُلکی نظام بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور بین الاقوامی تعلقات بھی انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ جب سماج انسانی معاہدات کا مجموعہ ہے تو نبی اکرمؐ بالخصوص اور دیگر تمام انبیا علیہم السلام انسانی سماج کی تشکیلِ نو کرنے، اُسے بہتر بنانے اور اس کو نئے اُسلوب پر ڈھالنے کے لیے دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔

اُسوۂ حسنہ میں سیاست کی اہمیت

خطبے میں ایک حدیث پڑھی گئی ہے۔ امام بخاریؒ نے اسے روایت کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''**کانت بنو اسرائیل تسوسهم الأنبياء**'' (بنی اسرائیل کی سیاست اُن کے انبیا علیہم السلام کرتے رہے)۔ سیاست کا مطلب سوسائٹی کے اجتماعی معاملات کو سمجھنا اور انھیں درست خطوط پر حل کرنا ہوتا ہے۔ دنیا اور آخرت میں کامیاب بنانے کی منظّم اجتماعی جدوجہد کو دین میں سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام انسانی معاشروں کی درست مینجمنٹ کرتے ہیں۔ ان کی اجتماعی تشکیل کے لیے کردار ادا کرتے ہیں۔ سیاست کا لفظ ہمارے ہاں بہت بدنام ہو چکا ہے۔ جھوٹ، دھوکا، فراڈ، جھوٹے وعدے، دھوکا دہی کا نام آج ''سیاست'' پڑ گیا۔ عربی میں لفظ ''سیاست'' ایک ایسی بہتر مینجمنٹ کو کہتے ہیں، جو کسی خاندان، کسی قوم اور بین الاقوامی تعلقات کی درست خطوط پر ترقی یافتہ صورت میں مینجمنٹ کرنے، نظم و نسق قائم کرنے، ترقی کے اقدامات کرنے کا نام ہے۔ حضوؐر فرماتے ہیں کہ انبیاؑ کا ہدف یہی اجتماعی تعمیر و تشکیل ہوتا ہے۔

پھر حضوؐر نے فرمایا کہ: **ألا لا نبيّ بعدی**، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میرے بعد میرے خلفا ہوں گے اور وہ بڑی کثرت سے ہوں گے۔ جو بھی میرے پیغام کو لے کر اپنے اپنے دائرے میں درست مینجمنٹ کرے گا، زیادہ بہتر طور پر اپنی اپنی خانگی، قومی، اور بین الاقوامی ضروریات کی تکمیل کا نظام بنائے گا، وہ میرا خلیفہ ہے، میرا نائب ہے۔ گویا کہ انبیا کی بعثت کا ہدف انسانیت کو زوال سے نکالنا، ظلم و ستم کے ماحول سے نکالنا، پستی، غربت و افلاس، کم ہمتی اور بزدلی کے ماحول سے نکال کر ترقی کے اعلیٰ مقام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

انبیا علیہم السلام کے اجتماعی نقطہ نظر: انسانیت کی ترقی

ہمارے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں انبیاؑ کے جتنے واقعات بیان کیے ہیں، اگر ہم اُن کا اجتماعی نقطہ نظر سے تجزیہ کریں تو یہ بات بڑی واضح ہے کہ ہر نبی نے اپنے دور میں انسانیت کو ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کیا ہے۔

1۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد

وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہوں، جنھوں نے نمرود کے ظالمانہ ماحول سے نجات دلا کر آزادی اور حریت کی اساس پر کنعان میں ابراہیمی تحریک کا آغاز کیا اور پھر مکۃ المکرّمہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بٹھا کر اُس اعلیٰ ترین تحریک کے لیے نیا راستہ متعین کیا۔

2۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان دار سیاسی اور اقتصادی جدوجہد

وہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں، جنھوں نے کنعان سے نکل کر مصر کو نئی سویلائزڈ سوسائٹی، ترقی یافتہ قوم کے طور پر آگے بڑھایا۔ قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے پندرہ سالہ اقتصادی اور معاشی منصوبہ بندی کے ساتھ صرف مصر ہی کے لوگوں کو نہیں، بلکہ کُل دنیا کے انسانوں کو جو اُس کے قریب ترین علاقے میں موجود تھے، یمن سے لے کر بالخصوص شام اور یورپ کے علاقوں تک کے انسانوں کے مسائل حل کیے۔ اس خوف ناک قحط کا مقابلہ کیا، درست معاشی حکمتِ عملی اور بہترین مینجمنٹ کے ذریعے سے کہ جس سے اگلے سات سال کے قحط میں انسانوں کی معاشی ضروریات کی کفالت کی گئی۔ مصر میں زراعت کے نئے طور طریقے متعارف کرائے گئے۔ آج بھی ہماری ایگریکلچر سے متعلق ریسرچ اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے کہ زراعت کے ابتدائی طریقے مصر کی تہذیب یافتہ سوسائٹی میں ہی ہمارے سامنے آئے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ہی کی جدوجہد سے زراعت کی پیداوار بڑھی۔ اُن کے دور میں پانی کے ڈیم بنائے گئے۔ نئی کاشت کاری کے اصول متعارف کرائے گئے اور اس کے نتیجے میں اتنی پیداوار ہوئی کہ جو نہ صرف اُن رواں سات سالوں کی ضروریات کی کفالت کرتی تھی، بلکہ اگلے سات سال کے لیے اُس گندم کو ذخیرہ کیا گیا۔ اُس کا قانون اور ضابطہ اور اُس کا پورا طریقۂ کار حضرت یوسف علیہ السلام نے متعارف کرایا۔ اس کے لیے ایک اصول اور ضابطہ واضح کیا کہ ''گندم اگر اپنی بالیوں میں ہی رکھ دی جائے تو اُس کو کیڑا نہیں لگتا''۔ صرف جو استعمال کی جائے گندم، وہ اُس میں سے نکالی جائے۔ اُس کے علاوہ اس کے بارے میں قرآن کہتا ہے، یوسف علیہ السلام نے کہا: فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ [8] اُسے اپنی بالیوں میں ہی محفوظ رکھ دو۔ پھر گندم کو محفوظ رکھنے کے لیے گودام بنانا، ذخیرہ کرنا، پھر قحط کے زمانے میں عدل و مساوات کے ساتھ ہر آدمی کو ایک خاندان کے لیے، ایک اونٹ بوجھ، ایک مخصوص عرصے کے لیے دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اس حوالے سے منصفانہ تقسیم کا قانون اور ضابطہ متعارف کرایا۔ یہ مصر کی تہذیب وترقی بالخصوص معاشی اور اقتصادی حوالے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعلیمات سے ہمیں معلوم ہوتی ہے۔ [9]

3۔ حضرت داوٗد و حضرت سلیمان علیہما السلام کی شان دار حکمرانی

وہ حضرت داوٗد علیہ السلام یا حضرت سلیمان علیہ السلام ہوں، جنھوں نے یمن سے شام تک ایک ایسی شان دار حکومت اور

خلافت کا نظام قائم کیا کہ جس کی خوش حالی کی حالت قرآن حکیم بیان کرتا ہے کہ یمن سے شام تک ہر کچھ فاصلے پر باقاعدہ سرائے بنائی گئیں، تجارتی قافلوں کی حفاظت اور تحفظ کا نظام بنایا گیا۔ دونوں طرف بڑے بڑے باغات کے ذریعے سے زرعی پیداوار کو ترقی یافتہ بنایا گیا۔ اس کی تقسیم کا منصفانہ نظام قائم کیا گیا۔

4۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انقلابی کردار

یہی بات ہمیں موسیٰ علیہ السلام کی جدوجہد میں نظر آتی ہے کہ جن کے بارے میں قرآن نے کہا کہ ہم نے موسیٰ کو فرعون کی طرف اس لیے بھیجا تھا کہ وہ قوموں کو غلامی سے نجات دلائیں۔ خاص طور پر بنی اسرائیل کو جو غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجنے کا مقصد اللہ نے خود بیان کیا۔ سورت القصص میں ہے کہ:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴﴾ (10)

کہ فرعون نے زمین میں سرکشی کی ہوئی تھی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا۔ لڑکیوں کو زندہ رکھتا تھا۔ اُس نے طبقاتی نظام بنایا ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کو غلام بنایا، ان سے تمام کام کاج لیتا۔ بیگار لی جاتی۔ اُن کی عزتِ نفس پامال کی جاتی۔ قرآن نے خلاصے کے طور پر کہا کہ ''وہ فسادیوں میں سے تھا''۔ دنیا میں فساد مچاتا تھا۔ ایسے ماحول میں اللہ پاک کہتے ہیں:

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵﴾ (11)

ہمارا ارادہ تھا کہ ہم اِن کمزور لوگوں پر، غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور ہاریوں پر احسان کریں۔ وہ احسان کیا ہے؟ یہ کہ ہم انھیں زمین کا وارث بنا دیں اور انھیں وہاں کا حکمران بنا دیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ''نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً'' ہم انھیں امام بنا دیں۔ رہنما بنا دیں۔ قائد بنا دیں۔ تخلیقی صلاحیتیں اُن میں پیدا کر دیں۔ اور انھیں ''نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ''۔ زمین کا وارث بنا دیں۔ گویا کہ اس طبقاتی نظام کو ختم کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے جدوجہد اور کوشش کی اور اس کے لیے قوموں کی آزادی کو انتہائی ناگزیر قرار دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے وحی کی اور فرعون کی طرف بھیجا تو اُسے صرف کلمے کی دعوت نہیں دی گئی۔ قرآن نے کئی جگہ پر حضرت موسیٰؑ کا پورا واقعہ بیان کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فرعون کے پاس جانا، قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (12) اُس سے نرمی سے بات کرنا اور اُسے سب سے پہلے یہ کہنا کہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (13) بنی اسرائیل کو آزادی دے کر ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو۔ سب سے پہلے بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس لیے کہ غلام قوم اپنا قومی نظام، اپنی قومی اُمنگوں اور ملی تقاضوں کے مطابق تشکیل نہیں دے سکتی۔ وہ تو آقا کی مرضی کے مطابق اپنا نظام بنانے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا تعلیمی نظام، اس کا سیاسی نظام، اس کا معاشی نظام، اس کے تمام سماجی معاہدات آقا طے کرتا ہے کہ کن اصولوں پر اُس نے یہ معاہدات کرنے ہیں۔ اس لیے نبی آ کر سب سے پہلے قوموں کو غلامی سے نجات دلاتے ہیں۔ اُن میں آزادی اور حریت پیدا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے قوم کو غلامی سے نجات دلا کر واپس وادیٔ سینا میں پہنچایا اور وہاں اُن کی حکمرانی کا راستہ ہموار کیا۔ حضرت موسیٰ کی جدوجہد سے جو اگلے دور کی تربیت یافتہ جماعت یوشع بن نون کی قیادت میں سامنے آتی ہے، اُس نے کنعان

میں اپنی حکمرانی قائم کی۔ اپنا قومی نظم ونسق قائم کیا۔ آزادی اور حریت کے مطابق اپنا سیاسی، معاشی، سماجی نظام قائم کیا۔

5۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظیم الشان جدوجہد

اسی طرح ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ''حواریّین'' جو تیار کیے، اس نے سو دوسو سال میں یہ نتیجہ پیدا کیا کہ عیسائیت نے دنیائے مغرب میں ایک بہت بڑے خطے پر اپنی حکمرانی قائم کی۔ بہت بڑی ریاست انسانیت کی تہذیب وترقی کے لیے قائم کی۔ جس میں انسانی مسائل کے حل کرنے کا ایک مکمل نظام ہمارے سامنے آتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی یہ حدیث دراصل حضرات انبیا علیہم السلام کی انھی تفصیلات کا خلاصہ بیان کرتی ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیا اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی قوموں کی سیاست کرتے رہے ہیں۔

امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ: کل انسانیت کے لیے رحمت للعالمین

خود نبی اکرمؐ کا حال یہ ہے کہ آپؐ دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ بھی سب سے پہلے مظلوموں کی مدد کرنے، ظالموں سے مزاحمت کرنے، بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہب کے کل انسانیت کے لیے ایک بہترین قومی اور بین الاقوامی سماج کی تشکیلِ نو کرتے ہیں۔

آپؐ کی تریسٹھ سالہ زندگی کی تفہیم ضروری ہے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضور اقدسؐ اس ربیع الاوّل کے مبارک مہینے میں اس دنیا میں تشریف لائے۔ 570 عیسوی میں ربیع الاول کے مہینے میں حضورؐ مکہ مکرمہ میں دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔ آپؐ ربیع الاول میں ہی دنیا میں تشریف لائے، ربیع الاول میں ہی ابتدائی طور پر سچے خواب نظر آنا شروع ہوئے۔ جو رمضان المبارک میں وحیٔ الٰہی کے نزول کا سبب اور ذریعہ بنے۔ ربیع الاول ہی وہ مبارک مہینہ ہے کہ جس میں نبی اکرمؐ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کرتے ہیں۔ ہجرت کا مہینہ بھی یہی ہے۔ اور ربیع الاول ہی کا وہ مبارک مہینہ ہے کہ جس میں نبی اکرمؐ کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے، یہاں تک کہ آپ کی اس دنیا سے رُخصتی اور وفات بھی اسی ربیع الاول کے مہینے میں ہوئی۔ 63 سال کی یہ زندگی کہ 570 عیسوی سے لے کر 632 عیسوی تک کے اس پورے دورانیے میں نبی اکرمؐ نے انسانی سماج کے لیے کیا کِیا؟ اسے سمجھنا آج ہمارے لیے بڑی ضرورت ہے۔ یوں تو نبی اکرمؐ کُل انسانیت کے رہنما ہیں، لیکن آج ہم مسلمانوں کو بالخصوص اس لیے نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ ہم زوال سے دوچار ہیں۔

مسلمان ممالک کی زوال پذیر حالت کا جائزہ

دنیا میں 193 اقوامِ متحدہ کے ممبر ممالک میں 57 مسلم ممالک ہیں۔ جن میں کوئی ایک بھی ویٹو پاور نہیں رکھتا۔ 5 ویٹو پاور رکھنے والی طاقتیں جو حقیقت میں آزاد کہی جاسکتی ہیں کہ جن کی رائے پوری دنیا پر اثرانداز ہوتی ہے، اُن میں کوئی بھی مسلم ملک نہیں ہے۔ وہ سب غیر مسلم ہیں۔ کیپٹلزم کی بنیاد پر امریکا، برطانیہ، فرانس ہو یا سوشلزم اور کمیونزم کی بنیاد پر روس اور چین ہو، یہ دو دنیا کے نظام ہائے حیات، اُن کے ماننے والے لوگ دنیا میں اس وقت بین الاقوامی قیادت کے منصب پر فائز ہیں۔ ہم سب

ستاون مسلمان ملکوں کی حالت یہ ہے کہ ہم اپنی معیشت میں اُن کے محتاج، اپنی زراعت اور تجارت میں اُن کے محتاج، ہم اپنے سماج کی تشکیل کے لیے تعلیم و تربیت میں اُن کے محتاج۔ ہمارے ہاں ہمارے سماج کا تانا بانا یورپ کے زیرِاثر ہے اور اُن کے افکار و خیالات کے تناظر میں وجود میں آتا ہے۔

ایسے زوال کی حالت میں کہ ہماری نہ تو معاشی گروتھ ایسی ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ قرضوں کی معیشت کا عالَم یہ ہے کہ مسلمانوں کا سب سے مقدس مقام سمجھا جانے والا سعودی عرب آج قرضوں کی معیشت میں جکڑتا جا رہا ہے۔ دس ارب ڈالر کا قرضہ آج اُس نے بھی لے لیا ہے۔ آپ دیکھیے کہ یہ قرضوں کی صورتِ حال کسی مُلک اور قوم کے لیے ترقی کی بات نہیں ہوتی۔ زوال کی حالت یہ ہے کہ ہمارا لٹریسی ریٹ سب سے کم، ہماری سیاست غیر مستحکم اور بدامنی کی شکار ہے۔ ہمارا معاشی نظام قرضوں کی مصیبت میں جکڑا ہوا۔ ہماری اجتماعیت انفرادیت کے مرض سے دوچار ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں تو زیادہ ضرورت ہے کہ نبی اکرمؐ نے انسانی سماج کی تشکیلِ نو کے لیے جو بنیادی اصول متعین کیے تھے، ہم انھیں صحیح تناظر میں سمجھیں۔

بڑی بدقسمتی ہے کہ ربیع الاول کے مہینے میں جب ہم سیرت کانفرنسز کرتے ہیں، بیانات جاری ہوتے ہیں، تقریریں کی جاتی ہیں، اس میں حضورؐ کی انفرادی اور ذاتی زندگی کے بہت سے پہلو بیان کیے جاتے ہیں۔ یقیناً وہ باعثِ برکت ہیں، باعثِ ثواب ہیں، لیکن آپؐ کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

آپؐ کی سیرتِ مقدسہ کے تین دائرے

یہ بات ہمیں سمجھنی چاہیے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے تین دائرے ہیں۔ آپؐ نے اپنی زندگی کے ترسیٹھ سالہ دور میں جتنے اعمال کیے ہیں:

1۔ ان میں کچھ تو ایسے ہیں کہ جو صرف نبی اکرمؐ کے ساتھ خاص ہیں۔ کسی اُمتی کو اس کی نقل اُتارنے کی اجازت نہیں ہے۔ بہت سے ایسے اُمور ہیں:

الف: حضورؐ نے ایک فرد کی گواہی پر مقدمے کا فیصلہ کیا۔ یہ عمل اُمت کے لیے نہیں ہے۔ اُمت کے لیے قانون ہے کہ جب تک کسی معاملے میں دو گواہ نہ ہوں، عدالتی نظام میں اُس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

ب: نبی کرمؐ کی ازواجِ مطہرات کی تعداد زیادہ ہے۔ مسلمانوں پر پابندی ہے کہ وہ ایک حد سے اوپر شادی نہیں کرسکتے۔ آپ دیکھیئے کہ یہ ایسے اعمال ہیں جو حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے خاص ہیں۔

2۔ دوسرے وہ اعمال ہیں، جو آپؐ نے عام انسانی اصول پر طبعی طور پر اختیار فرمائے ہیں۔ آپؐ نے پگڑی پہنی ہے، آپؐ نے جُبہ پہنا، آپؐ نے خوشبو لگائی، آپؐ نے بڑی بڑی زُلفیں رکھیں، آپؐ نے حلوہ کھایا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ اُمور ہیں جو لوگوں کے لیے فرض نہیں ہیں۔ لوگوں کے لیے لازمی نہیں ہیں۔ کوئی اگر واقعتاً حضورؐ کی سیرت کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے، حضورؐ کی عقیدت سے ان میں سے کسی ایک کو اپنی چاہت سے اختیار کرلے تو ٹھیک ہے۔ عشق کی وجہ سے ایسا کرے اُس کے لیے ثواب کا باعث ہوگا۔ لیکن اُمت کے لیے یہ فرض نہیں ہے۔ لازمی نہیں ہے۔

3۔ تیسرے ایسے بہت سے کام ہیں، جو حضوؐر نے کیے اور وہ کل انسانیت کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص اُن کی اتباع کرنا فرض اور واجب ہے:

الف: حضوؐر نے نماز پڑھی تو کہا: صلّوا کما رأیتمونی اُصلّی (14)۔ نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔

ب: حضوؐر نے حج کیا تو حضوؐر نے فرمایا: خذوا عنّی مناسککم (15) لوگو! مجھ سے حج کے طریقہ کار سیکھ لو۔ جیسے مجھے حج کرتے دیکھا ہے، ویسے حج کیا کرو۔

ج: حضوؐر نے اللہ کا حکم سنایا کہ روزہ رکھو جیسا کہ گزشتہ اُمتوں پر روزہ فرض کیا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (16) حضوؐر نے سال بھر میں ایک مہینے کا روزہ رکھا۔ حضور نے تمام وہ اعمال کر کے دکھائے۔

د: حضور نے فرمایا: عدل و انصاف سے کام لو۔ جیسا کہ مجھے عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے: اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (17) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان عدل و انصاف سے کام لوں۔ تو مسلمانوں کو بھی حکم دیا گیا کہ: اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (18) عدل و انصاف سے کام لو کہ تقویٰ کے سب سے قریب تر یہی بات ہے۔

اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اجتماعی اُمور سمجھنا لازمی ہے

عزیز طلبا! اور طالبات! آج ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سماجی تشکیل کے لیے جو اجتماعی اُمور اُمت کے لیے لازمی قرار دیے ہیں، اُن پر گفتگو کریں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی تریسٹھ سالہ زندگی میں اجتماعی اُمور یا سماج کی تشکیل کے متعلق اُمور کون سے کیے ہیں۔ 570 عیسوی میں حضور دنیا میں آتے ہیں۔ اور 586 عیسوی میں حضوؐر ایک ایسے اجتماعی معاہدے میں شریک ہوتے ہیں کہ جو چیلنج مکے والوں کو درپیش ہوا۔

1۔ معاہدۂ حِلفُ الفُضول میں آپؐ کی شرکت

عبداللہ ابن جدعان کے گھر میں مکہ کے سردار اس لیے جمع ہوتے ہیں کہ ایک یمنی تاجر مکہ آتا ہے، اپنا تجارتی مال بیچتا ہے۔ جو خریدار ہے، وہ وہاں کا سردار ہے، وڈیرا ہے، وہاں کے حکمران طبقے کا ممبر ہے، وہ اُس تاجر کو کہتا ہے کہ کوئی پیسے نہیں ہیں، بھاگ جاؤ۔ اُس کے مال کی قیمت دینے سے انکار کرتا ہے۔ تاجر لُٹ گیا۔ مکہ کے اُس سرداری نظام میں ایسے بہت سے تاجر لوٹے جاتے تھے، وہ بولتے نہیں تھے، لیکن وہ زبیدی، یمنی تاجر دلیر اور بہادر نکلا، وہ جبلِ ابوقبیس پر جو مکہ کا ''ہائیڈ پارک'' تھا، جہاں اجتماعی معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، وہاں اُس نے اپنی چادر لہرائی اور اُس نے کہا:

''او لوگو! مکہ والو! مجھے فلاں سردار نے لوٹ لیا ہے۔ اگر تم نے اُس کی لوٹ کے اس ظلم کا کوئی مداوا نہیں کیا تو میں پوری دنیا میں تمھارے بارے میں پروپیگنڈا کروں گا کہ تم لوگ تاجروں کو لوٹتے ہو۔ دنیا کا کوئی تاجر، یمن کا کوئی تاجر مکہ نہیں آیا کرے گا''۔ اُس کی اس دھمکی نے مکہ والوں کو سوچنے پر مجبور کیا۔ بنو ہاشم کے سربراہ زبیر ابن عبدالمطلب تھے، جو نبی اکرمؐ کے چچا ہیں۔ انھیں یہ خبر معلوم ہوتی ہے۔ حضوؐر کو وہ ساتھ لے کر عبداللہ ابن جدعان کے گھر پہنچتے ہیں اور وہاں یہ سردار جمع ہیں۔ انھوں نے کہا

کہ اگر ہم اس تاجر کی داد رسی نہیں کریں گے تو ہمارا تجارتی نظام ٹھپ ہوجائے گا۔ اس لیے اس کے لیے کوئی ضابطہ بنانا چاہیے۔ کوئی معاہدہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ نبی اکرمؐ اُس معاہدے میں شریک ہیں اور اُس معاہدے میں طے کیا گیا کہ: آئندہ ظالم کے خلاف ہر مظلوم کی مدد کریں گے۔ اس معاہدے کے حلف الفضول کے الفاظ ہیں:

''باللّٰہ لنکوننّ یدًا واحدًا مع المظلوم علیٰ الظّالم''. (19)

اللہ کی قسم ہم ایک متحدہ طاقت ہیں۔ ایک مُکا ہیں، ایک اجتماعیت ہیں، جو ظالم کے منہ پر پڑے گا اور مظلوم کی ہم مدد کریں گے۔

آج دنیا کو سوشلزم کا مُکّا تو یاد ہے، مزدوروں اور کسانوں کے حق میں اس کے مُکّے کا نشان تو لوگوں کو معلوم ہے، لیکن حِلف الفُضول — جس میں نبی اکرمؐ شریک ہیں — کا وہ ''یدًا واحدًا'' اجتماعیت کا ''ایک مُکّا'' کہ جس نے مظلوموں کی مدد کی، ہمیں یاد نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ عام طور پر ہمارے مسلمان نوجوان کو اس کا کوئی علم نہیں۔ حضورؐ اس معاہدے میں شریک ہو کر مظلوموں کی مدد کا حلف اٹھاتے ہیں۔ آپؐ اس معاہدے کی تائید کرتے ہیں۔ نبوت ملنے کے بعد نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ آپ نے زمانۂ جاہلیت میں نبوت سے پہلے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے، کیا نبی بننے کے بعد بھی آپ اس معاہدے پر قائم ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: بالکل! میں اس پر قائم ہوں۔ اگر آج بھی کوئی آدمی سو سُرخ اونٹ — جو اُس زمانے میں بہت بڑی دولت سمجھی جاتی تھی — مجھے دے کر یہ کہے کہ تم اس معاہدے سے منحرف ہوجاؤ تو میں کبھی منحرف نہیں ہوں گا۔ آج بھی میں اس قسم پر قائم ہوں کہ مظلوموں کی مدد کروں گا ظالموں کے خلاف۔

2۔ آپؐ بہ طور صادق اور امین

586 عیسوی میں یہ معاہدہ ہوتا ہے اور 610 عیسوی میں نبی اکرمؐ پر وحی آتی ہے۔ قبل از نبوت کے 24 سال تک مسلسل نبی اکرمؐ نے اس معاہدے پر مِن وعَن عمل کیا۔ ہر مظلوم کی مدد کی ہر ظالم کے خلاف۔ روایات میں آتا ہے کہ ابوجہل مکہ کی گلیوں میں چُھپتا پھرتا تھا کہ کہیں محمدؐ سے ٹاکرہ نہ ہوجائے اور وہ کسی مظلوم کا ہاتھ پکڑ کر میرے سامنے کھڑا نہ کردیں کہ بھائی! اس مظلوم کا حق دلواؤ؟ مکہ کے سربراہ کی حیثیت سے مظلوم کا ہاتھ پکڑ کر ابوجہل کا دروازہ آپؐ کھٹکھٹاتے اور اُسے باہر بُلا کر کہتے کہ اس کا حق فلاں ظالم نے چھین لیا، اُس حق کو دلوانے کے لیے کردار ادا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ اُس معاہدے پر پوری صداقت اور امانت سے عمل کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے حضورؐ کو صادق اور امین کہا جاتا ہے۔ آپؐ سچے ہیں کہ جو حلف اٹھایا ہے، جس میثاق کا حصہ بنے ہیں، جو آئین اور دستور اور قاعدہ مقرر ہوا ہے، آپؐ نے مِن وعن اس پر عمل کیا۔ ''صادق'' قرار پائے۔ آپؐ کے پاس امانتیں ہیں۔ آپؐ امانتوں کو پورے طور پر ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی خیانت نہیں ہے۔ جو وعدہ کرتے ہیں، اسے پورا کرتے ہیں اور وہ بھی بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانیت کے لیے، تمام سماجی معاہدات میں نبی اکرمؐ عدل و انصاف کے ساتھ کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی صداقت ہے، یہی امانت ہے، یہی دیانت ہے، جس کی وجہ سے آپؐ صادق اور امین قرار پاتے ہیں۔

www.rahimia.org

3۔ آپؐ کی غریب پروری اور مظلوموں کی مدد کا حال

آپ حضرات نے یہ حدیث ضرور سنی ہوگی کہ غارِ حرا میں حضوؐر پر پہلی وحی نازل ہوتی ہے۔ تو آپؐ کو اس تجربے سے کچھ خوف محسوس ہوا تو آپؐ غارِ حرا سے اُتر کر اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لاتے ہیں اور حضرت خدیجہؓ سے کہتے ہیں، بخاری شریف کے پہلے ہی باب کی روایت ہے، خدیجہؓ سے کہتے ہیں:

''**لقد خشیتُ علیٰ نفسی**'' مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔

یہ جو اتنا بھاری علم مجھ پر نازل کیا گیا ہے، اس سے مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ بہادر اور دلیر عورتیں جنھوں نے مردوں کو حوصلہ دیا ہے، اُن میں ازواجِ مطہرات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ حضوؐر کی ازواجِ مطہرات میں حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ، یہ تین ایسی دلیر اور بہادر خواتین ہیں، جنھوں نے ہر مشکل مرحلے میں حضوؐر کو تسلی دی ہے، حوصلہ دیا ہے، آپؐ کی ہمت بڑھائی ہے۔ اس موقع پر خدیجہؓ نے نبی اکرم کو مخاطب کر کے کہا:

نہیں! ''**و اللّٰہ لا یخزیک اللّٰہ ابدًا**'' اللہ کی قسم! کبھی اللہ آپ کو رُسوا نہیں کرے گا۔

4۔ آپؐ کی سیرتِ مقدسہ میں انسانیت کی خدمت کے پانچ کام

کیوں؟ پانچ وجوہات حضرت خدیجہؓ نے بیان کی ہیں۔ حدیث میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں:

1۔ ''**إنّک لتصل الرّحم**'': بے شک آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں۔

2۔ ''**و تحمل الکلّ**'': آپ لوگوں کا بوجھ اٹھا کر منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ کوئی مزدور، کوئی ہاری بوجھ اٹھائے جا رہا ہے، بوڑھا ہے، نہیں اٹھا سکتا، حضوؐر اس کا بوجھ اپنے کندھے پر اُٹھا کے اُس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے۔

3۔ ''**و تکسب المعدوم**'': آپؐ جو آدمی کما نہیں سکتا، اُسے کما کر کھلاتے ہیں۔ ''**معدوم الرّزق**'' جس کے پاس رزق نہیں ہوتا ہے، اپنی محنت اور مشقت سے اُس کو کما کر کھلاتے ہیں۔

4۔ ''**و تقری الضّیف**'': آپؐ مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔

5۔ ''**و تُعِینُ علیٰ نوائب الحقّ**'': پھر ایک بڑی جامع بات حضرت خدیجہؓ نے کہی کہ اے نبی! آپؐ نے، انسانی حقوق جب بھی خطرے میں ہوں، جب بھی کسی مصیبت کی حالت میں ہوں، تو آپؐ اُن لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں، اُن کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ [20]

حضوؐر کی سیرتِ مقدسہ کی یہ چوبیس سالہ زندگی ہے، جو حِلف الفُضول کے معاہدے سے لے کر وحیٔ الٰہی کے نزول تک کے دورانیے کا خلاصہ ہے، اس سے جامع سیرت کوئی بیان نہیں کرسکتا، جو خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضوؐر کی بیان کر دی۔ آپ دیکھئے کہ پانچوں کام انسانی خدمت کے ہیں، انسانی مسائل کے حل کرنے کے ہیں۔ اپنے سماج کو درست کرنے کے ہیں۔ لوگوں کے حقوق کی ادائیگی سے متعلق ہیں۔ حضرت خدیجہؓ نے ان میں اللہ کی عبادت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ حال آں کہ عبادت حضوؐر سے بڑھ کر کون سکتا ہے؟

5۔ غارِ حرا میں آپؐ کی عبادت کا اصل مقصد

عبادت ہی کے لیے تو حضورؐ غارِ حرا میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ کیوں؟ اس کی بھی وجہ خود قرآن نے بیان کردی کہ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (21) ہم نے آپؐ کو پایا کہ آپؐ مسائل کے حل میں سرگرداں ہیں۔ تو ہم نے آپ کو راستہ بتلایا۔ کیا نبی اکرمؐ مظلوموں کی مدد کرتے ہیں؟ لیکن مکہ کے باقی سردار تو اس معاہدے پر عمل درآمد نہیں کرتے۔ خود حضورؐ صادق بھی ہیں، امین بھی ہیں، لیکن اکیلا ایک آدمی کتنے انسانوں کے انسانی مسائل حل کرسکتا ہے؟ اس حوالے سے آپؐ پریشان ہیں، سرگرداں ہیں، سوچتے ہیں کہ اس کا کیا حل ہے کہ انسانیت پر ظلم نہ ہو۔ عدل و انصاف کا نظام قائم ہو۔ ظالموں کے ہاتھ روک لیے جائیں۔ اس کے لیے آپ پریشان ہیں تو قرآن کہتا ہے: ''فَهَدٰى'' ہم نے آپ کو راستہ دکھلا دیا۔ قرآن کے نزول کی صورت میں ہدایت دی۔

6۔ پہلی وحی کا نزول اور تعلیم و تربیت کے بنیادی انقلابی اصول

چناں چہ پہلی سورت العلق نازل ہوتی ہے۔ ابتدائی پانچ آیات میں حضورؐ سے کہا جا رہا ہے کہ: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ (22) اپنے ربّ کا نام پڑھیے۔ وہ رب جس نے آپ کو پیدا کیا، جس نے آپ کو علم و شعور دیا۔ علم کی اہمیت بیان کی۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (23) آپ جو جانتے نہیں تھے، اس کا علم اور کام کا طریقہ سکھایا۔ تعلیم و تربیت کے بنیادی اُصول اس سورت میں بیان کردیے کہ تعلیم کے اہداف کیا ہونے چاہئیں؟ نبی اکرمؐ نے خود فرمایا کہ ''بعثت معلّما'' (24): مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ مجھے استاذ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ پہلی وحی میں ہی علم کی اہمیت واضح کی۔ قرآن نے علم کی اہمیت واضح کی ہے۔ لوگوں سے ایک سوال کیا ہے کہ: هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (24) کیا وہ لوگ جو علم اور شعور رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو علم و شعور نہیں رکھتے، برابر ہیں؟ یقیناً دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ پھر علم کے مقاصد کیا ہوں گے؟ علم سے نتائج کیا لینے چاہئیں؟ اس پہلی ہی سورت میں علم کے نتائج بیان کردیے، طریقۂ تعلیم اور اُس کے مقاصد واضح کردیے کہ یہ علم و شعور جو سوسائٹی کے گرد و پیش کے ملاحظے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اس حوالے سے موجود چیلنجز کے مقابلے پر اس علم سے کیا نتیجہ نکلنا چاہیے؟ اسے بیان کردیا۔

قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم کے مقاصد

پہلی وحی میں ہی قرآن حکیم نے تعلیم کے درجِ ذیل مقاصد واضح کیے ہیں:

1۔ ظلم کے خلاف حریتِ فکر اور آزادیٔ عمل پیدا کرنا

خبردار! یہ بات کسی طور پر قابل قبول نہیں کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر ظلم اور زیادتی کرے۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى (25) یہ بات درست نہیں کہ انسان سرکشی کرے، اپنی حدود کے دائرے سے باہر نکلے۔ ''طاغوت''، طغیانی اور سرکشی کسے کہتے ہیں؟ اس کی تعریف فرعون کے واقعے میں خود اللہ تعالیٰ نے بیان کردی کہ فرعون طاغوت تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب بھیجا تو کہا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (26) جاؤ فرعون کی طرف اس نے سرکشی کی ہے۔ اور سرکشی کیا ہوتی ہے؟ وہی جو ابھی شروع خطبے میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں ذکر کی گئی کہ فرعون نے ایسی بالادستی قائم کی ہوئی تھی کہ بنی اسرائیل کی

نسل کے لڑکوں اور مردوں کو قتل کرنا، عورتوں کو زندہ رکھنا، اُن سے خواہشات پوری کرنا، اور انسانوں پر طبقاتی نظام مسلط کرنا، فساد برپا کرنا، اُن کی طاقت اور قوت کو چھین لینا، دوسری قوموں کو غلام بنانا، اُن کی منڈیوں پر قبضہ کرلینا، یہ طاغوت اور سرکشی ہے۔

اللہ پاک نے اس سورت میں تین ''کَلَّآ'' کہے ہیں۔ تعلیم وشعور کا سب سے پہلا ہدف یہ ہے کہ اگر کسی قوم پر ظلم ہو رہا ہو تو مظلوم قوم پر لازمی اور ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ نظریہ رکھے کہ کسی ظالم انسان کے ظلم، زیادتی اور سرکشی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ مظلوم، ظالم کے ظلم کو ہرگز ہرگز قبول نہ کرے۔ گویا کہ حریتِ فکر پیدا کرے۔ آزادیٔ رائے پیدا کرے۔ تعلیم کے نتیجے میں جو جوہر طلبا میں منتقل ہونا چاہیے، وہ یہ کہ وہ اپنی رائے سے ایک نئی چیز تخلیق کرسکیں۔ ایک نئی سوچ اُن کے اندر پیدا ہو۔ وہ لکیر کے فقیر نہ ہوں کہ کسی نے جو بات کہہ دی، اس کے پیچھے چل پڑے۔ علم سے تخلیقی صلاحیت پیدا ہونی چاہیے۔ تقلیدی علم و عمل، علم نہیں کہلاتا، وہ تو رٹّا ہے۔ وہ تو محض نقل ہے۔ اور دنیا میں نقل سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ جب تک دل سے تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ کام نہ کیا جائے، علم کی پختگی پیدا نہیں ہوتی۔ کسی بھی فن اور شعبے کو ہم سیکھ رہے ہیں تو اس میں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنا، اپنی رائے بنانا، اپنے آپ کو تربیت کے مرحلے سے گزارنا، یہ تعلیم کا پہلا اور بنیادی ہدف ہے۔ حریت فکر پیدا کرنا ضروری ہے۔

تاریخ نے دیکھا کہ حضورؐ کی اس تعلیم کے نتیجے میں وہ بلالؓ جو پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں تھا، حبشی اور کالے لوگوں کی ویسے بھی کوئی عزت نہیں تھی، انھیں غلام بنا کر اُن سے بیگار لی جاتی تھی، اُمیہ ابن خلف — جس کے وہ غلام تھے — ظلم وتشدد کرتا تھا۔ ابوجہل مارتا پیٹتا تھا۔ لیکن جب قرآن اُن کے سینے میں آیا، حضورؐ کی تعلیم انھوں نے قبول کی، تو وہی بلالؓ ہے، جو اپنی ایک رائے رکھتا ہے، اپنی رائے سے ایمان لاتا ہے اور جب ایمان لاتا ہے تو آقا بھی ظلم کرتا ہے، قریش کے سردار بھی ظلم کرتے ہیں، تپتی ریت پر ڈالتے ہیں۔ بلالؓ کہتا ہے کہ جو بات میں نے اپنی رائے سے قبول کرلی، جان جاسکتی ہے، میں اپنی رائے سے منحرف نہیں ہوسکتا۔ میں نے جو چیز سمجھ لی، جو شعور پیدا ہوگیا، جو میرے علم و فکر نے میرے سامنے راستہ کھولا ہے، میں اس راستے سے کسی صورت انحراف نہیں کروں گا۔ اس تعلیم نے بلالؓ میں حریتِ فکر پیدا کی، صہیب رومیؓ کی سوچ بلند کردی۔ سلمان فارسیؓ میں یہی فکر اور سوچ پیدا کی، یاسرؓ اور عمارؓ میں پیدا کی۔ کتنے ہی مظلوم صحابہؓ ہیں، جن کو حضورؐ نے جرأتِ فکر عطا کی۔ رائے کی بلندی ان کے اندر پیدا کی۔ اُن کی سوچ میں تخلیقی صلاحیت پیدا کی۔ جب غریبوں اور مظلوموں نے حضورؐ پر ایمان لاکر اس تعلیم کو قبول کیا، اس نے انھیں اعلیٰ درجے کا انسان بنایا، تو مکہ کے سردار کہنے لگے کہ اے محمد! ہم آپ کی اس مجلس میں آتو جائیں، لیکن کیا کریں آپ کی مجلس میں تو غریب کمزور لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر، اپنے سے کم تر سماجی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ہم تعلیم حاصل کریں گے؟ یہ تو ہمارے سٹیٹس کے خلاف ہے، یہ ہمارے تکبر اور طاقت کے خلاف ہے۔

حضورؐ نے ایک دفعہ ارادہ فرما لیا کہ چلو ان لوگوں کو بھی دین کی تعلیم سکھانے کے لیے الگ سے ان کی مجلس بلا لیتے ہیں تو اللہ پاک نے تنبیہ کی ''سورت الکہف'' میں اللہ نے کہا:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (27)

اے محمد ﷺ! جو لوگ عقل وشعور اور فہم وبصیرت سے انسانوں کے ساتھ بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، آپ کو انھیں کے

ساتھ رہنا ہے۔ ان کے لیے علاحدہ سے کوئی مجلس کا انتظام نہیں کرنا۔ کیا تم نے دنیا کی زیب و زینت کا ارادہ کرلیا ہے؟ جو اِن لیڈروں کے لیے اور ان بڑے بڑے سرداروں کے لیے الگ سے آپ نے مجلس بنانے کا ارادہ کرلیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ نازل فرمائی۔ اس پر حضورؐ نے ارادہ ترک کردیا۔

2۔ حضور ﷺ کی جانب سے کمزوروں کی مدد، دشمنوں کا اعتراف

اسلام قبول کرنے سے پہلے حضرت ابوسفیانؓ جب ہرقل کے دربار میں سوالوں کے جوابات دے رہے تھے تو اُس نے پوچھا تھا کہ جس آدمی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اُن کے ماننے والے کون لوگ ہیں؟ ''**فأشراف النّاس يتّبعونه أم ضعفائهم؟**'' [28] کیا وہاں کے بڑے بڑے سردار اور طاقت ور اشرافیہ لوگ ہیں؟ یا اُن کے کمزور لوگ ہیں؟ تو حضرت ابوسفیانؓ نے کہا کہ ''**بل ضعفائهم**'' مکہ کے کمزور لوگ حضورؐ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ تو ہرقل نے کہا کہ ''ایسے ہی لوگ رسولوں کی اتباع کرتے ہیں''۔ نبی وہی ہوتا ہے کہ جس کی تعلیم کے نتیجے میں کمزوروں میں حریتِ فکر پیدا ہوجائے۔ وہ ترقی کی طرف جائیں۔ اُن کے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارا جائے۔ تو پہلا بنیادی کام تعلیم کا یہ ہے کہ انسانوں میں حریتِ فکر پیدا کی جائے۔ وہ آزادیٔ رائے سے آگے بڑھیں۔ اپنی آزادی کی اجتماعی جدوجہد کریں۔ اپنے فیصلے خود کرنے کی اہلیت بنائیں، یہ پہلا تقاضا ہے۔

3۔ ظالم ظلم سے باز نہ آئے تو مزاحمتی اقدام کرنا

تعلیم کا دوسرا مقصد۔ پھر اس سورت میں دوسرا ''كَلَّا'' آیا ہے، یعنی یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ [29] خبردار! اگر یہ ابوجہل ظلم سے باز نہیں آتا، جسے نبی اکرمؐ نے اس اُمت کا ''فرعون'' کہا ہے اور حضرت موسیٰؑ کے فرعون نے موسیٰؑ کو اتنی تکلیف نہیں دی، جتنی اس اُمت کے فرعون ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ کو تکلیفیں دیں۔ [30] یہ ''ابوجہل'' ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے: كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ، اگر یہ ظلم سے باز نہیں آتا تو لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ، تو ہم اس کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹ لیں گے۔ اٹھو مزدورو، کسانو! بلال، یاسر، صہیب، عمار، یاسر، اٹھو! اور ابوجہل کی پیشانی پکڑ کر گھسیٹ لو۔ مت ڈرو کہ سردار کی پیشانی ہے۔ مت ڈرو کسی حکمران کی پیشانی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ قرآن نے جواب دیا: ''نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ'' [31] یہ پیشانی جھوٹی ہے۔ حِلف الفضول کا معاہدہ انھوں نے کیا تھا۔ اُس آئین کے مطابق عدل و انصاف کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ چوبیس سال کی تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس معاہدے پر عمل درآمد نہیں کیا۔ اس لیے یہ پیشانی جھوٹی ہے۔ جیسے نبی صادق تھے اس لیے کہ انھوں نے حلف الفضول کے معاہدے پر عمل کیا تھا، ایسے ہی یہ جھوٹے ہیں کہ جو اس معاہدے پر مبنی آئین بنایا، دستور بنایا، میثاق کیا، اُس کی پاسداری نہیں کی۔ آئین میں انسانی حقوق بڑے طمطراق سے لکھے ہوئے ہیں۔ اُس پر انھوں نے دستخط کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اُس پر عمل نہیں کرتے۔ مظلوموں پر مزید ظلم ڈھاتے ہیں۔ سوسائٹی کو یرغمال بناتے ہیں۔ لہٰذا مت گھبراؤ۔ اس کی پیشانی پکڑو اور گھسیٹ لو۔

اس سے کیا ہوگا؟ یہی کچھ ہوگا نا کہ پہلی سورت میں قرآن کہتا ہے کہ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ [32] اس (ابوجہل) سے کہہ دو کہ اپنے

www.rahimia.org

دارالندوہ کے شریک لوگوں کو بلا لے۔ ''نادیہ''، ''نادی'' عربی میں مجلس کو کہتے ہیں۔ نادیہ جو اُس مجلس کا ممبر ہوتا تھا۔ ممبرانِ مجلس کے لیے نادیہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اگر اپنی ''نادیہ'' کو بلائے گا تو سَنَدۡعُ الزَّبَانِيَةَ (33) ہم بھی اپنے سیاسی پیادے میدان میں کھڑے کردیں گے۔ ''زبانیہ'' کو کھڑا کردیں گے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ''الزَّبَانِيَةَ'' کا ترجمہ کیا ہے کہ: ''ہم بھی بلاتے ہیں اپنے پیادے سیاست کرنے کو''۔ یعنی حضرات ابوبکر وعمر، وعثمان وعلی، صحابہ — رضوانُ اللّٰہِ علیھم اَجمعین — کی جماعت اس کے مقابلے میں کھڑی کریں گے۔ ''نادیہ'' اور ''زبانیہ'' کا مقابلہ ہوگا، دونوں کے درمیان ٹکراؤ ہوگا۔

4۔ ظالم کے ظالمانہ نظام کی اطاعت نہ کرنا

تعلیم کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ ''كَلَّا ۖ لَا تُطِعۡهُ'' (34) یعنی جب آپ نے علم وشعور اور حقائق کی دنیا میں قدم رکھ کر جو فیصلہ کرلیا، جو حق اور سچ آپ کے سامنے آگیا۔ اُس کی موجودگی میں کسی ظالم کے ظلم کی اطاعت نہیں کرنی۔ خبردار! ہرگز ہرگز یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ کوئی انسان ایسے ظالم کی اطاعت اور فرماں برداری کرے۔ بلکہ اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو اور اللہ کا قرب تلاش کرے۔ مسلمان جماعت کو حکم دیا کہ اللہ سے تعلق قائم کرے اور اُس کا قرب حاصل کرے۔

اس طرح قرآن حکیم نے پہلی ہی وحی میں تعلیم کے حوالے سے تین بنیادی اُصول بیان کیے کہ:

1۔ پہلے سوچ اور فکر کو غلامی کے جھنجھٹ سے نکالا جائے۔ حریتِ فکر پیدا کی جائے۔

2۔ اگر ظالم ظلم سے باز نہیں آتا تو اُس کے مقابلے میں مزاحمت کی جائے۔

3۔ پھر اُس کی کسی بھی صورت میں اطاعت اور اُس ڈسپلن کو نہ مانا جائے جو ظلم اور زیادتی اور حقوقِ انسانیت کے مخالف ہو۔

آپ دیکھیے کہ یہ تعلیم سب سے پہلی سورت میں نبی اکرمؐ نے دے دی۔

قرآن حکیم کے علوم؛ آپ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کے بنیادی اَخلاق ہیں

یاد رکھیے! نبی اکرمؐ کی سیرت کیا ہے؟ یہ سوال حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحابہؓ نے کیا۔ عائشہ صدیقہؓ اُمت کی معلّمہ ہیں۔ اپنے حجرہ مبارکہ میں حضورؐ کے بعد پچاس سال انھوں نے تعلیم وتربیت کی ہے۔ پردے کے پیچھے حضرت عائشہ صدیقہؓ بیٹھ جاتیں۔ اور مسجدِ نبویؐ صحابہؓ سے بھری ہوتی۔ صحابہؓ نے سوال کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کہ حضورؐ کی سیرت کیا ہے؟ اَخلاق کیا تھے؟ تو عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ''کان خُلُقہ القرآن'' (35)، اُن کا خُلق اور اُن کا اَخلاق اور اُن کی سیرت قرآن ہے۔ قرآن اگر چلتا پھرتا دیکھنا ہو تو وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اس سے بڑھ کر سیرت بیان کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں کہ قرآن کی عملی تصویر حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پچاس سال تعلیم دی ہے۔ وہ فقیہہ ہیں۔ مجتہد ہیں۔ صحابہؓ کی بہت ساری غلطیوں کی اصلاح کی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک حدیث بیان کردی، حضرت عائشہؓ کو پتہ چلا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابن عمرؓ نے بات نہیں سمجھی۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے۔ اور پھر ایک دوسری حدیث حضور کی بیان کرکے مسئلے کو حل کردیا۔ علما جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے مسئلہ ہیں، جن میں عائشہ صدیقہؓ نے اصلاح کی ہے۔ علم اور تعلیم کی وہ اعلیٰ ترین حالت جو نبی اکرمؐ نے

صحابہؓ اور صحابیات کو منتقل کی، اُس کا عملی نمونہ مردوں میں چار صحابہ اور عورتوں میں عائشہ صدیقہؓ اور اُم سلمہؓ ہیں کہ جن کی فقاہت، جن کی تعلیم و تربیت سے سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ کی تربیت ہوئی ہے۔ اگلے دور میں تابعینؒ کی تربیت ہوئی ہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں آں حضرت ﷺ کی انقلابی جدوجہد

قرآن حکیم نے آکر سب سے پہلے آزادی اور حریت کا نظریہ دیا۔ چناں چہ تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں حضورؐ نے ان اُصولوں پر جو قرآن نے پہلی سورت میں بیان کردیے، صحابہؓ کی جماعت بنائی۔ تعلیم ایک فرد سے صرف ایک فرد تک نہیں ہوتی۔ تعلیم ایک نظریے پر ہوتی ہے۔ اُس نظریے کو عمل میں لانے کے لیے ایک اجتماعیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اُستاذ شاگرد کا رشتہ قائم ہونا ضروری ہے۔ استاذ اپنے علم اور عمل سے طلبا میں وہ سوچ اور فکر منتقل کرتا ہے، جس فکر اور نظریے پر نصاب اور اصولِ تعلیم تیار کیے گئے ہوں۔ حضورؐ نے قرآن حکیم کے نصاب اور اصولِ تعلیم پر تیرہ سال تک مکہ مکرمہ میں صحابہؓ کی تربیت کی۔ آپؐ جب یہ تعلیم دے رہے ہیں تو مکہ والے حضورؐ کے بارے میں — نعوذ باللہ — کہتے ہیں کہ ''مجنون'' ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ آپؐ ''ساحر'' یعنی جادوگر ہیں۔ آپؐ حقائق پر مبنی علم کی شمع روشن کر رہے ہیں اور یہ لوگ آپؐ کو مجنون اور ساحر کہتے ہیں! آپؐ مکہ کے ظلم کے نظام کے خلاف اپنی اجتماعیت پیدا کر رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ حضورؐ حج کے موقع پر قبائل کی طرف جاتے، عرفات اور منیٰ کے میدان میں لوگوں کو دعوت دیتے۔ سچے دین کی دعوت دیتے تو سگا چچا ابولہب ساتھ ساتھ پیچھے پیچھے چلتا۔ کہتا ہے کہ ''یہ میرا بھتیجا ہے''۔ — نعوذ باللہ — ''یہ مجنون اِدھر اُدھر کی پاگل پن کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی بات نہ ماننا''۔ اب اگر گھر میں باپ نہیں ہے تو چچا باپ کی جگہ ہوتا ہے، وہ آکر کسی طالبِ علم کے بارے میں کہے کہ یہ پاگل ہے، کسی استاذ کے بارے میں کہے کہ سر گھوم گیا اس کا، اس کی بات نہ ماننا، اس کے باوجود نبی اکرمؐ اس پُرمشقت حالت میں انسانیت کے لیے انسانیت کی آزادی اور حریت کی شمع بلند کر رہے ہیں۔ دارِ ارقم میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہاں مسجدِ حرام میں آپؐ کا داخلہ بند ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابتدائی دور کے مسلمان ہیں۔ فرماتے ہیں کہ: ''حضورؐ کعبہ کے قریب نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل (عمرو ابن ہشام)، عتبہ (بن ربیعہ)، شیبہ (بن ربیعہ)، ولید (بن عتبہ)، اُمیہ ابن خلف، عقبہ (ابن ابی معیط اور عمارہ بن الولید) یہ سردارانِ مکہ ایک جگہ ٹولی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضورؐ جب سجدے میں گئے تو انھوں نے مشورہ کیا کہ فلاں نے اونٹ ذبح کیا ہے۔ کون ہے کہ جب آپؐ سجدے کی حالت میں ہوں تو اُس اونٹ کی اوجڑی لاکر حضورؐ کی کمر پر رکھ دے، تو بدبخت دو نوجوان اُٹھے اور جاکر اوجڑی اٹھا لاتے ہیں۔ حضورؐ جب سجدے میں گئے تو انھوں نے آپؐ کے سر مبارک اور کمر پر اوجڑی ڈال دی کہ آپ سر نہیں اٹھا پاتے۔ جیسے ہی سر اٹھاتے ہیں تو تکلیف کی وجہ سے سر اٹھایا نہیں جاتا۔ تو یہ سردار خانۂ کعبہ میں بیٹھ کر ٹھٹھا اور مذاق اُڑاتے ہیں، ہنستے ہیں۔ توہین کرتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ ہزلی ہیں، قریشی نہیں ہیں۔ قریشی سرداروں کے سامنے ایک ہزلی کمزور آدمی ہے۔ وہ ہزلی کیا کرسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں دوڑا دوڑا حضرت فاطمہؓ کے پاس آیا۔ حضرت فاطمہؓ ابھی بارہ تیرہ سال کی بچی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ تمھارے ابا جان کے ساتھ سرداروں نے یہ کام کیا۔ وہ تیزی سے آئیں، دلیر اور بہادر تھیں، نہیں گھبرائیں، باوجود کمزوری کے وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اُس کو دھکا دیتی رہیں اور انھیں بُرا بھلا کہتی رہیں۔ تب

www.rahnuma.org

حضوؐر کا سر مبارک اُٹھا۔ نماز سے فارغ ہو کر حضوؐر نے ان سرداروں کو بد عا دی:

''اللهم عليك بقريش''

پھر اُن میں سے ہر ایک کے نام لے کر بد دعا کی:

''اللّٰهمّ عليك بابى جهل، و عتبه ابن ربيعه، و شيبه بن ربيعه، و الوليد بن عتبه، اُميه ابن خلف، و عقبه ابن ابى معيط، و عمارة بن الوليد''.

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے ساتوں افراد کو بدر میں قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ انھیں گھسیٹ کر بدر کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا اور پھر رسول اللہ ﷺ نے اُن پر لعنت بھیجی''۔ [36]

آپ دیکھئے کہ اتنی تکلیفیں برداشت کر کے نبی اکرمؐ نے جماعت تیار کی۔ پھر شعب ابی طالب میں تین سال قید رکھا۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں۔ حضرت خدیجہؓ کھانا تیار کر کے اپنے بھائی حکیم ابن حزام کے ذریعے سے بھیجتی ہیں تو وہ بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اتنی مصیبت اور مشقت میں جماعت تیار کرتے ہیں۔ لیکن حضوؐر کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ آپؐ نے نوجوان تیار کیے۔

ہجرتِ مدینہ اور دشمنوں کے خلاف اعلانِ جہاد

پھر آپ ﷺ ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں تو اللہ کے حکم سے مدینہ منورہ پہنچتے ہیں۔ جماعتی طاقت اکٹھی کرتے ہیں۔ وہاں ان نوجوانوں کو حکم ہوتا ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا [37] (حکم ہوا اُن لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطے کہ اُن پر ظلم ہوا)

تم مظلوم ہو اور مظلوم کو ظالم کے خلاف قتال کا حق ہے، لہٰذا اُٹھو اور ان کے مقابلے میں قتال کرو۔ قتال کا حکم فرض ہوتا ہے، بدر کا معرکہ لگتا ہے۔ حضوؐر نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال میں پوری تنظیمی مینجمنٹ کے ذریعے سے جو ایک منظّم تربیت یافتہ جماعت تیار کی تھی، اس کے ذریعے بدر کے معرکے میں اُس دشمن کو شکست دی، جو تین گنا زیادہ تھا۔ ابوجہل کی قیادت میں ایک ہزار کا لشکر اور اِدھر رسول اللہ ﷺ کے پاس تین سو تیرہ ہیں، لیکن آپؐ کی سیاست دیکھئے، آپؐ کی مینجمنٹ دیکھئے۔ اُس زمانے میں جنگی طریقۂ کار ہجومی جنگ کی بنیاد پر تھا کہ ایک ہجوم دوسرے ہجوم سے ٹکراتا تھا اور ظاہر ہے کہ جو ہجوم بڑا ہوتا تھا، وہ فاتح ہو جاتا تھا۔

حضور ﷺ کی جنگی حکمتِ عملی

حضوؐر نے تنظیم کی حکمتِ عملی بنائی۔ آپؐ نے تین صفیں بنائیں: ایک ٹیلے پر، پہلی صف میں نیچے وہ لوگ جن کے پاس تلواریں تھیں۔ تقریباً سو آدمی نیچے کھڑے کر دیے اور انھیں حکم دیا کہ تمھیں جب تک آرڈر نہ ملے، تم نے کوئی اقدام نہیں کرنا۔ اس سے اوپر بلندی پر نیزہ چلانے والے، نیزہ تقریباً پچاس فٹ پر کسی کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ تو دوسری صف میں نیزہ چلانے والے کھڑے تھے۔ اس سے کچھ اَور بلندی پر تیر اندازوں کی ایک صف بنائی۔ تین صفوں پر مشتمل اپنا نیا ملٹری اِزم متعارف کرایا، جس کو قرآن نے کہا: صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ [38] (قطار باندھ کر گویا وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی)۔

نبی اکرمؐ نے ان سب سے اوپر اپنا ہیڈکوارٹر بنایا۔ اور فرمایا کہ جس صف کو آرڈر ملے، اس نے حرکت میں آنا ہے۔ جب جنگ شروع ہوتی ہے اور دشمن یلغار کرتے ہوئے آتا ہے، سب سے پہلے جو تیر انداز ہیں، ان کو ٹارگٹ دیے گئے کہ اپنے تیروں کو ہجوم پر ضائع نہیں کرنا۔ دشمن کا جو لشکر حملہ آور ہو رہا ہے، ان میں جو ٹارگٹ تمھیں دیا گیا ہے، اسی کو نشانہ بنانا ہے۔ فلاں سردار، فلاں سردار۔ اب سو فٹ دور تک تیر جاتا ہے۔ تو سو فٹ دور سے ہی نشانہ بنانا شروع کر دیا تیر اندازوں نے۔ ان کو کہا کہ حرکت میں آ جاؤ۔ لشکر دشمن کا پچاس فٹ تک پہنچتا ہے۔ تو حضورؐ نے حکم دیا نیزہ بازوں کو کہ اب اپنے نیزے جو تمھیں ٹارگٹ دیے ہوئے ہیں، اگر کوئی بچ کر تمھاری زد میں آ چکا ہے تو اس کو مارو۔ اور پھر اس کے بعد جو لوگ اُس سے بھی نکل کر تلواروں کی زد میں آ جائیں تو اب تلوار والے اپنا کام شروع کریں۔

تینوں صفوں کو تین مرحلوں میں نبی اکرمؐ نے نئی جنگی حکمتِ عملی متعارف کرا کے اُس غزوۂ بدر میں اپنی تنظیمی طاقت سے جنگ جیتی۔ فرشتوں کی مدد اپنی جگہ پر رہی، لیکن فرشتوں کی مدد کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ فرشتوں نے قتلِ عام بھی کیا۔ انھوں نے حوصلہ بڑھایا۔ ''اَیّـدہ'' قرآن نے کہا ہے، نُصرت کی اُن کی، حوصلہ بلند کیا اُن کا۔ لیکن کام اُس تربیت یافتہ فورس نے کیا۔ تیرہ سال کی مینجمنٹ آج غزوۂ بدر کے میدان میں سیاسی مظہر کے طور پر سامنے آئی کہ اپنے سے تین گنا بڑی طاقت کو شکست دے دی۔ دنیا بھر کی اکیڈمیز میں حضورؐ کی یہ جنگی حکمتِ عملی پڑھائی جاتی ہے۔ پاکستان کا ایک جنرل گزرا ہے جنرل اکبر خان۔ اس نے ''حدیثِ دفاع'' کے نام سے کتاب لکھ کر جنگی نقشوں کی مدد سے پوری تفصیلات بتلائی ہیں کہ حضورؐ کے غزوات میں نیا ملٹری اِزم حضورؐ نے کیا متعارف کرایا، جس کے نتیجے میں دشمن کی طاقت کو شکست دی جا سکی۔ آپ دیکھیے کہ اس طریقے سے وہ جو حِلف الفُضول میں معاہدہ ہوا تھا، مظلوموں کی مدد کرنے کا اور ظالموں کے مقابلے پر، آپؐ نے اس کی تکمیل غزوۂ بدر میں کی۔

رسول اللہ ﷺ نے ''میثاقِ مدینہ'' پر مشتمل اجتماعی اصولوں کا تعین کیا

پھر مدینہ جا کر ایک نیا معاہدہ کیا، جسے ''میثاقِ مدینہ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی جب مظلوموں کو آزادی دلوا دی، جزیرۃ العرب میں سے مکہ کے ریاستی نظام کی سیاسی طاقت توڑ دی، ستر بڑے بڑے سردار قتل کر دیے اور تاریخ نے دیکھا کہ ان ظالموں کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر بدر کے کنوئیں میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ نے ایک نیا میثاق کیا: ''میثاقِ مدینہ''۔ اس میثاقِ مدینہ میں سوسائٹی کے سماج کی تشکیل کے مزید اگلے چار اُصول متعین ہوئے:

1۔ پہلا اُصول آزادی اور حریتِ فکر تھا، جس پر نبی اکرمؐ نے پندرہ سال خرچ کیے۔ اور جب آزادی حاصل ہو کر مدینہ کی ریاست کی تشکیل ہوتی ہے تو ریاستی تشکیل کے لیے حضور ﷺ نے سماجی معاہدوں کو پورا کرنے کے لیے بنیادی اَساسی اُصول متعارف کرائے۔

2۔ انسانی معاہدات عدل و انصاف کے اصول پر ہونے چاہئیں۔ وہ یہ کہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب، نسلی اور مذہبی شناخت سے بالاتر ہو کر ہر ایک انسان کو عدل و انصاف ملے۔ جب ظلم کے خلاف آپ اقدام کر رہے ہیں، ظالم کا مقابلہ کر رہے ہیں، مظلوم کو آزادی دِلا رہے ہیں تو نیا سماج تشکیل دیتے وقت آپ کو آزادی اور حریت کے بعد ضرورت ہے کہ عدل کی بنیاد پر

سماجی معاہدات وجود میں آنے چاہئیں۔ چناں چہ بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب حضورؐ معاہدہ کرتے ہیں۔ یہ میثاقِ مدینہ 52 دفعات پر مشتمل ہے۔ اس میں ساڑھے نو ہزار غیر مسلم مشرک یہودی شریک ہیں۔ حضورؐ کی مسلمان جماعت سے بھی پانچ سو ہیں۔ تین سو تیرہ وہ افراد ہیں، جو بدر میں تھے۔ مدینہ میں رہنے والی عورتیں اور بچے ملا کر کل صحابہؓ کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی۔

آپ دیکھئے کہ یہ معاہدہ ہوتا ہے اور اس معاہدے میں کیا طے کرتے ہیں کہ

''أنّ یھود بنی عوف اُمّةً مع المؤمنین'' [39] بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک قوم ہیں۔ ایک اُمت ہیں۔ اُن کے بھی سیاسی، معاشی، سماجی حقوق ایسے ہی ہیں جیسے ایک مسلمان کے ہیں۔ چناں چہ حضورؐ کی عدالت میں مقدمہ آتا ہے ایک یہودی اور ایک منافق مسلمان کا۔ آپ دیکھئے کہ آپ ﷺ نے ان کے درمیان عدل و انصاف کا فیصلہ کیا ہے، جب آپؐ نے دیکھا کہ اس معاملے میں یہودی برحق ہے تو یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ مسلمان کے خلاف فیصلہ کر دیا۔ اس طرح عدل کی بنیاد پر آئین بنایا اور اس پر عمل کیا۔

3۔ پھر اس آئین کے مطابق ایک ایسا سیاسی نظام بنایا، جو پُرامن ہے، وہ بھی بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانیت کے لیے ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ ہر آدمی کے لیے امن ہے۔ حکومت کی ذمہ داری یہی ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں تمام لوگوں کی جان، مال، عزت آبرو کے لیے تحفظ اور امن فراہم کرے۔ امن کے بغیر قومی معاشرے آگے نہیں بڑھتے۔ حکومتوں کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ بغیر امن و امان کے کسی حکومت کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اپنے جیسے انسانوں کو حکمران اسی لیے مانا جاتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے لیے امن کو یقینی بنائیں۔

4۔ چوتھی بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے وہ معاشی نظام متعارف کرایا، جس سے معاشی خوش حالی پیدا ہوئی بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب تمام انسانوں کے لیے؛ یہودیوں کے لیے، مشرکوں کے لیے، مسلمانوں کے لیے۔ ایسا نظام جو تمام کے لیے منصفانہ معاشی سسٹم قائم کرتا ہے۔ یثرب جو ایک گاؤں تھا، بخار اور مصیبتوں کا گھر تھا، زراعت فرسودہ تھی۔ اَور تو کوئی چیز تھی نہیں۔ حضورؐ آئے تو یثرب کو مدینہ بنایا۔ ''مدینہ'' تمدن سے ہے، سویلائزیشن ہے، مدنیت ہے، نئی شہریت عطا کی۔ ایک نیا سماجی ڈھانچہ تشکیل دیا۔ آپؐ نے زراعت کے نئے طریقے متعارف کرائے۔ کھجوروں کے نئے بیج دریافت کیے۔ عجوہ کھجور حضورؐ کی وہی یادگار ہے، جو حضورؐ نے مدینہ میں کاشت کروائی تھی۔ پانی کا نیا طریقہ وضع کیا۔ درختوں کی سیرابی کے لیے کردار ادا کیا۔ اجتماعی طور پر کاشت سے ملکی پیداوار کو بڑھایا۔ پھر تجارت کو ترقی دی۔ مدینہ میں مسجدِ نبویؐ کے ساتھ ہی بازار لگایا۔ سوقِ مدینہ بنایا۔ تجارتی Relationship (تعلقات) قائم کیے۔ یمن کی تجارت، شام کی تجارت اس مدینہ سے، تمام قافلے یہاں سے آتے جاتے ہیں۔ Means of production (ذرائع پیداوار) جو کسی معاشی نظام کی بنیاد ہوتے ہیں، یہ تینوں اُس پوری سوسائٹی کے لیے نبی اکرمؐ نے متعارف کرائی۔

آپ دیکھئے! آپؐ کی جدوجہد سے سماجی تشکیل کے 4 بنیادی اُصول ہمارے سامنے آتے ہیں: (1) آزادی اور حریت کا فکر، (2) عدل و انصاف کا آئین، (3) امن و امان قائم کرنے والا مستحکم سیاسی نظام، (4) معاشی خوش حالی پیدا کرنے والا اقتصادی نظام۔ اس سے سوسائٹی ترقی کرتی ہے۔ نئی ٹیکنالوجی، نئے زاویے، سوسائٹی کی ترقی کے لیے متعارف کرانا، علم و شعور منتقل کرنا، یہ

نبی اکرمؐ کی سیرت کا خلاصہ ہے۔

آپ ﷺ کی قائم کردہ سوسائٹی ؛ ایک مہذب معاشرہ

آپ دیکھئے کہ یہ وہ اجتماعیت ہے، جس نے اُس پوری سوسائٹی کو ترقی دے کر ریاستِ مدینہ کی نوعیت اُس کو دی اور سوسائٹی میں ایک مہذب معاشرہ قائم کیا۔ خود قرآن نے یہ بات واضح کردی کہ مدینہ کی مثالی سوسائٹی وہ ہے کہ جس میں امن ہے، معاشی خوش حالی ہے۔ زوال پذیر سوسائٹی وہ ہے، جس میں بھوک ہے، افلاس ہے اور خوف اور دہشت کی چادر تنی ہوئی ہے۔

حضورؐ کی ایک حدیث سنا کر بات مکمل کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا:

''ثلاث مَن جَمعَهُنّ فقد جمع الإيمان''. تین باتیں ایسی ہیں، جس مسلمان جماعت میں پائی جائیں، وہ کامل ایمان والی ہے:

1۔ ''الانصاف من نفسک'': تمھارے دل سے عدل وانصاف کا نظریہ پھوٹنا چاہیے، پوری انسانیت کے لیے۔ لِلمُسلِم یا لِلعَرَب کی بات نہیں۔

2۔ اسی طرح دوسری بات فرمائی: ''بذل السّلام للعالَم'' ۔ پورے عالم کی امن اور سلامتی کے لیے اپنی جان خرچ کرنا اور مال خرچ کرنا۔ بدامنی پیدا کرنے کے لیے نہیں، دہشت گردی کے لیے نہیں، امن کے لیے اپنی جان مال خرچ کرنا۔

3۔ تیسری بات فرمائی: ''الانفاق من الاقتار'' ۔ معاشی وسائل تھوڑے بھی ہوں تو پوری سوسائٹی میں انھیں مل بانٹ کر استعمال کرنا۔ (40)

علم کے مقاصد؛ قومی آزادی کی حفاظت، عدل وانصاف، امن وامان اور معاشی خوش حالی

ایک بہتر اجتماعیت اور متوازن معاشرے کے لیے تینوں باتیں حضورؐ نے بیان فرما کر واضح کردیا کہ سماج کی تشکیل انصاف، امن، معاشی خوش حالی اور منصفانہ معاشی نظام کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

عزیز طلبا و طالبات! ہمیں آج یہ سمجھنا چاہیے کہ جو علم ہم حاصل کر رہے ہیں، اس کے مقاصد اپنی قومی آزادی کی حفاظت ہے۔ اپنے ملک کے لیے ایک عدل وانصاف پر مبنی بہتر نظام قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ امن وامان کو یقینی بنانا۔ تشدد اور بدامنی کے راستے سے ہٹ کر عدمِ تشدد کے اصول پر جدوجہد اور کوشش کرنا۔ اور اپنی سوسائٹی کی معاشی ترقی کے لیے، معاشی وسائل کو آگے بڑھانے کے لیے، اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا، دوسروں کی دریوزہ گری کرنے کے بجائے اپنی قومی سوسائٹی کی ترقی کے لیے کردار ادا کرنا، یہ ہماری تعلیم کا ہدف ہونا چاہیے۔

آپ کسی بھی شعبے میں تعلیم حاصل کریں، لیکن اُس شعبے میں خدمتِ انسانیت کا جذبہ ہو۔ عدل وانصاف کی سوچ، امن و امان کو برقرار رکھنے، اور انسانی سوسائٹی میں خوش حالی کے لیے اپنی خدمات کو سرانجام دینے کا عزم اور ارادہ ہو۔ یہی ہماری قومی شناخت، ہمارے ملک کی ترقی، ہمارے ایمان کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرمؐ کی سیرت کے ان تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور اس کے مطابق پُرعزم جدوجہد اور کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ و آخر دعوانا أن الحمد للّٰه ربّ العالمين.

---

www.rahimia.org

تأثّرات

پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن بُچہ (ڈائریکٹر بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، بہادر کیمپس، لیّہ)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

آج کی اس محفل، اس سیمینار کے انعقاد میں عزیز طلبا و طالبات! مجھے نہایت خوشی ہے کہ ہمارے پاس علمائے کرام موجود ہیں۔ اور اس میں بھی خاص الخاص جناب مفتی آزاد رائے پوری جیسے عالم جو کہ نہ صرف دینی علوم کے حوالے سے، بلکہ عصری اور سماجی علوم کے حوالے سے بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس میں آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے حوالے سے وہ کنسپٹ (Concept) جو اجتماعیت کا کنسپٹ ہے، جس کا تعلق سماج کی تشکیل سے ہے، سوسائٹی کی فارمیشن (Formation) سے ہے، اُس کے حوالے سے انھوں نے بڑی مدلل اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ماشاء اللہ اُن کے علم کی بنیاد پر انھوں نے جس طرح سے اس انتہائی دقیق قسم کے ٹاپک کو اس ایک گھنٹے کے لیکچر میں سمویا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ میں اس حوالے سے کوئی بات اگر کروں گا تو وہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگی۔

اُن کے ہی خطبے میں سے چند بلکہ نہایت اہم ایک دو چیزیں مَیں عرض کرتا ہوں۔ جیسا کہ حضورؐ کا رول جو انھوں نے بہ حیثیتِ پولیٹیکل لیڈر یہاں پر بتایا ہے اور جس طرح سے انھوں نے اس سوسائٹی کو، اس نبوت کے بعد تھوڑے سے عرصے میں ٹرانسفارم (Transform) کیا، اور پھر اُس کے اثرات تھوڑے سے عرصے میں پوری دنیا تک پھیل گئے اور وہ آج تک موجود ہیں۔ میں آپ سے عرض کروں کہ اُن کا رول بہ حیثیت ایک سیاست دان کے ہو، ایک رہنما کے ہو، ایک استاد کے ہو، یا ایک جنگی کمانڈر کی حیثیت سے ہو، کہیں بھی اگر آپ ان کو دیکھتے ہیں تو اُس وقت کے حساب سے اور آج تک ان جیسا کوئی بھی نہیں ہے۔

اس کی مثال میں آپ کو یوں دوں گا کہ جب مائیکل ہارٹ نے کتاب لکھی "Hundred Great Men" اور اُس نے شروع سے لے کر آج تک سو بڑی شخصیات کا اُس میں ایک تقابلی جائزہ لیا تو اُس نے اس میں نمبر وَن پوزیشن پر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام لکھا۔ اور پھر یہ نہیں کہ اُس نے وہ نام لکھا، اُس کے بعد وہ ریزنز (Reasons) دیتا ہے کہ کس طرح سے اُس درجہ بندی میں ہستیوں کے نام لکھے ہیں۔ اس میں نمبر وَن کی پوزیشن کے وہ حق دار اس لیے ہیں کہ انھوں نے اس سوسائٹی کے اوپر جو اِمپریشنز (Impressions) چھوڑے ہیں، وہ لامحدود ہیں، وہ رہتی دنیا تک ہیں اور آج تک اور اس کے بعد آنے والی دنیا تک اس کے اثرات ہم محسوس کرتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ اُنؐ کے صحابہ کرامؓ، اُن کے سکول کے پڑھے ہوئے لوگ، وہ لوگ جن کی ٹریننگ، جن کی تربیت آپؐ کے ہاتھ سے ہوئی اور اُن لوگوں نے بعد میں جو سوسائٹی ایون (even) تشکیل دی، وہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ اُس میں مَیں کہوں گا

کہ حضرت عمرؓ کا رول بہ حیثیت ایک پولیٹیکل لیڈر کے، اور ایک رولر کے وہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ دنیا میں چار پانچ بڑے جنگی کمانڈر گزرے ہیں۔ جس میں ہم الیگزینڈر دی گریٹ کی بات کرتے ہیں، اس میں ہم چنگیز خان کی بات کرتے ہیں، جس میں ہم مسلمانوں میں حضرت عمرؓ یا اُن کے بعد جو کمانڈرز ہیں، اُن کی بات کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ منگولز یا چنگیز خان کی جو سلطنت تھی، وہ شاید ایریا کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو کسی بھی شخص کا سب سے بڑا ایریا تھا، جو اُس نے اپنی لائف ٹائم میں کاؤنٹر کیا تھا۔ آج کہیں آپ کو منگول سلطنت نظر آتی ہے؟ کہیں اُس کے اثرات نظر آتے ہیں؟ وہ سُکڑ کر وہی منگولیہ تک محدود ہوگئی اور وہاں ایک سٹیچو موجود ہے چنگیز خان کا اور دنیا اُس کو ایک بڑے جنگی جارح کے طور پر جانتی ہے۔

اب اسی طرح آپ الیگزینڈر دی گریٹ (سکندر اعظم) کی مثال لے لیں۔ وہ مقدونیہ سے چلتا ہے اور یہاں ہمارے برصغیر تک پہنچتا ہے۔ رومن امپائر سے لے کر پرشین امپائر تک تمام یہ پورا علاقہ الٹی میٹلی (Ultimatley) اُس کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے اندر آجاتا ہے اور وہ اس پورے علاقے کو فتح کرتا ہے۔ آج کہیں آپ الیگزینڈر یا اُس کے ماننے والے یا اُس کی کوئی فتوحات کے نشان ملتے ہیں؟ کہیں بھی نہیں ملتے۔

بات فتوحات کی نہیں ہوتی، بات یہ ہوتی ہے کہ اس فتح کے پیچھے، اس وکٹری کے پیچھے فلاسفی کیا ہے؟ اور اسلام کی اگر فتوحات کے حوالے سے آج دیکھیں، چاہے اُن جگہوں کے اوپر اسلامی سلطنت یا اسلامی مملکت آج موجود ہو یا نہ ہو، مسلمان آپ کو ان جگہوں پر ضرور ملیں گے، جہاں تک اسلامی فتوحات پہنچیں۔ اس کی وجہ وہ پیغام ہے، اس کی وجہ وہ فلاسفی ہے، جو آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے ہمیں دی اور اُن کے سکھائے ہوئے لوگ جہاں تک پہنچے، اور انھوں نے جو پیغام وہاں پر چھوڑا، اس کے ماننے والے آج تک اور ہمیشہ وہ موجود رہیں گے۔ تو بات ہے اس پیغام کی، فلاسفی کی اور اُس پر عمل درآمد کی۔ اور موجودہ دور کے حوالے سے جیسا کہ مفتی صاحب نے سماج کی تشکیل میں اُس کا ذکر کیا ہے۔

میں اس کے ساتھ شکرگزار ہوں اپنے معزز مہمانوں کا کہ وہ یہاں تشریف لائے ہیں، انھوں نے مصروفیات میں سے وقت نکالا اور خاص کر ہمارے نوجوان طلبا و طالبات جو کہ اس ملک کا مستقبل ہیں، اس قوم کا مستقبل ہیں، اُنھوں نے ان کے قلوب کو، اُن کے اذہان پر دستک دی اور کوشش کی، تاکہ یہ چیزیں جو کہ میں سمجھتا ہوں کہ نہایت ضروری ہیں آگے چل کر سوسائٹی تشکیل کے حوالے سے وہ اپنا حصہ ڈالیں۔ بہت شکریہ!

---

www.rahimia.org

حوالہ جات

1۔ 33- الاحزاب: 66۔

2۔ 33- الاحزاب: 67۔

3۔ 33- الاحزاب: 21۔

4۔ 21- الانبیاء: 107۔

5. سلسلة الاحاديث الصّحيحة للألبانی، حديث: 3399. و فی مؤطّا إمام مالک و لفظه: ''بعثتُ لأتمّم حُسن الأخلاق''. (حديث: 2633)

6. مشکوٰة المصابيح، حديث: 257.

7۔ صحیح بخاری۔ باب ما ذکر عن بنی اِسرائیل۔ حدیث 3455، طبع بیروت

8۔ 12- یوسف: 47۔

9۔ تفصیلات کے لیے سورت یوسف کا مطالعہ کیجیے۔

10۔ 28- القصص: 4۔

11۔ 28- القصص: 5۔

12۔ 20- طٰہٰ: 44۔

13۔ 26- شعرا: 17۔

14. صحيح بخاری، حديث: 6008.

15. رواه البيهقی فی السّنن الكبرىٰ، باب الإيضاع فی وادی محسّر، حديث: 9524.
و فی رواية مسلم عن جابر رضی الله عنه: ''رأيت النّبیّ يرمی علىٰ راحلته يوم النّحر، و يقول: ''لتأخذوا مناسككم''.
(باب استحباب رمی جمرة العقبة يوم النّحر راكبا الخ، حديث: 1297).

16۔ 2- البقرہ: 183۔

17۔ 42- الشوریٰ: 15۔

18۔ 5- المائدہ: 8۔

19. السّيرة النّبويّة لابن كثيرؒ، جزء أوّل، ص: 259، طبع: مكتبة دار المعرفة للطّباعة و النّشر و التّوزيع، بيروت.

20۔ دیکھئے صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث: 3۔

21۔ 93- الضحیٰ: 7۔

22۔ 96- العلق: 1۔

23۔ 96- العلق: 5۔

24. مشکوٰة المصابيح، حديث: 257.

25۔ 39- الزمر: 9۔

26۔ 96- العلق: 6۔

27۔ 20- طٰہٰ: 24۔

28۔ 18- الکہف: 28۔

29۔ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث: 7۔

30۔ 96- العلق: 15۔

31. دیکھئے! البدایہ و النہایہ، ج: 3، ص: 289، طبع: دار الکتب العلمیہ، بیروت. قال البکری:
فلمّا اتیٰ رسول اللّٰہ ﷺ عبد اللّٰہ برأس ابی جہل و أخبرہ بما قالہ ابوجہل قال ﷺ:
''کما إنّی أکرم النّبیّین علیٰ اللّٰہ و أمّتہ أکرم الأمم عند اللّٰہ کذٰلک فرعون ہٰذہ الأمة أشد و أغلظ من فراعنة سائر الأمم إذ فرعون موسیٰ حین غرق قال: أمنت انہ لا إلٰہ إلا الّذی آمنت بہ بنو إسرائیل. فرعون ہٰذہ الأمّة إزداد عداوة و کفرا'' (کتاب تاریخ الخمیس فی احوال أنفس النفیس ﷺ، للدّیار البکری المتوفی ٩٦٦ھ، ج: 1، ص: 385، طبع: دار صادر، بیروت)

32۔ 96- العلق: 16۔

33۔ 96- العلق: 17۔

34۔ 96- العلق: 18۔

35۔ 96- العلق: 19۔

36. مسند احمد، حدیث: 25108، 23460.

37۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰة، حدیث: 520۔

38۔ 22- الحج: 39۔

39۔ 61- الصّف: 4۔

40. السیرة النبویة لابن ہشام، ص 144، جلد دوم، الطبعة الثالثہ، مکتبہ دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان.

41۔ رواہ البخاری، فی ترجمة الباب، باب: 20، ''باب افشاء السلام من الاسلام'' تعلیقاً عن عمار ابن یاسر و رواہ احمد فی مسندہ مرفوعاً.

☆

www.rahimia.org

سیاسیات

اسلام کے سیاسی نظام میں عوامی نمائندگی کا تصور

از ڈاکٹر مولانا محمد ناصر

1. اسلام کے سیاسی نظام میں عوامی نمائندگی کا مفہوم

اسلامی تعلیمات کی رُو سے تمام اُمور میں حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا عہد کرتے ہیں، وہ اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ الٰہی ہدایات کو ریاستی نظام کی تشکیل میں اَساسی حیثیت دے کر عملی نظام بنائیں۔ گویا ان عوامی نمائندگان کو حاکمیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے، وہ خدا کے بہ طور نمائندہ کے ہوتا ہے۔ ان کا یہ حق دراصل شریعت کی تنفیذ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ خدا کے مقرر کردہ ضابطوں کے اندر رہ کر حقِ تنفیذ استعمال کرتے ہیں۔ انھیں ان قوانین کو بدلنے کا اختیار نہیں ہوتا، جو فطری اصولوں کے مطابق خدا کی طرف سے طے کردہ ہیں۔ مثلاً عدل، دیانت اور امانت کے اصولوں کو بدلنے کا حق نہیں رکھتے، البتہ یہ اختیار ان کے پاس ہوتا ہے، بلکہ ان کی ذمے داری ہوتی ہے کہ عدل، امانت اور دیانت کے عصری تقاضوں کی نشان دہی کریں اور ان کی تکمیل کے لیے لائحۂ عمل وضع کریں۔ گویا اصولِ دین کی روشنی میں سیاسی نظام تشکیل دے کر قانون سازی اور تنفیذ کا حق انھیں حاصل ہوتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے نمائندگانِ قوم اللہ تعالیٰ کے سامنے عبودیت کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اس بنا پر حاکمیت کا مرکز و منبع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ عام اجتماعی قانون کون بنائے؟ اس بابت قرآن حکیم نے دوٹوک اور واضح رہنمائی دی ہے۔ چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ[1]

(ان (مومنوں) کا اجتماعی کاروبار (امور) باہم مشورے سے انجام پاتا ہے۔)

یہاں ''امر'' بمعنی اہم اُمور ہے۔ گویا مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی اُمور باہم مشاورت پر مبنی ہوں گے۔ اس کی عملی صورت بلکہ تجربات کے بعد بہترین صورت مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) ہے۔ اگر یہ سوال قائم کیا جائے کہ یہاں مجلسِ شوریٰ کا تذکرہ نہیں ہے، تو یہ خدشہ درست نہیں۔ اس لیے کہ آیت میں ''امر'' بمعنی اجتماعی اُمور ہے گویا اس آیت مبارکہ میں اجتماعی کاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ زیر بحث مکمل آیت یوں ہے:

وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ

(اور جنھوں نے حکم مانا اپنے رب کا اور قائم کیا نماز کو اور کام کرتے ہیں آپس کے مشورہ سے۔ اور جو ہم نے

ان کو دیا اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔)

جیسے اقامت صلوۃ، جماعت کے بغیر نہیں، اسی طرح دیگر اجتماعی اُمور جماعت کے بغیر نہیں ہوں گے، مجلسِ شوریٰ بھی اجتماعی عمل ہے۔ یہ خدشہ اس لیے بھی درست نہیں کہ آیت مبارکہ کا سیاق و سباق مسلم اجتماع کی خصوصیات پر مبنی ہے۔ یہاں دیگر سماجی اور اجتماعی اُمور کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل کے حل میں مسلمانوں کا اجتماعی طرزِ عمل بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کو اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ واضح کر کے اجتماعی مسائل کے حل کا شورائی مزاج بتایا جا رہا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ انتظامی اُمور میں مسلمانوں کو آزاد رکھا گیا ہے کہ معروضی حالات کے مطابق جیسے چاہیں اجتماعی ڈھانچہ (Set up) بنا لیں، البتہ متعلقہ حکم کی روح قائم رکھنا ضروری ہے اور کسی اجتماعی حکم کی ایسی تشکیل جو ادارہ جاتی ہو اور روحِ عصر سے ہم آہنگ بھی، تو حکم کی صورت گری کے لیے یہ زیادہ بہتر ہے۔

کیا موجودہ پارلیمنٹ (مجلسِ شوریٰ) کی ہیئت کا ثبوت قرنِ اوّل میں ملتا ہے؟ تو اس بابت یہ امر قابل توجہ ہے کہ ضروری نہیں کہ بعد کے اَدوار میں قرنِ اوّل جیسی بعینہٖ عملی (سیاسی، سماجی) شکلیں اسی طرح میسر آسکیں کہ تاریخ میں ان کی مثال موجود ہو۔ سماجی زندگی کے بدلنے سے عملاً یہ ممکن بھی نہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی ڈھانچے کی تشکیل کے وقت اسلام کے محکم اور غیر مشتبہ اُن کلی قوانین کو لازمی طور پر پیشِ نظر رکھا جائے، جنھیں اُمت نے اصولی درجے میں قبول اور اختیار کیا ہو۔ اور ان کا اُمت کی سیاسی، عمرانی اور اقتصادی زندگی سے حقیقی تعلق ہو۔

یہ سوال کہ اجتماعی اُمور کا حل کیونکر ممکن ہوگا؟ کیا اس عمل میں ساری قوم شریک ہوگی یا ایک نمائندہ جماعت؟ اس ضمن میں علامہ محمد اسد کہتے ہیں:

''ظاہر ہے پوری ملت سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ ایک جگہ بیٹھ کر قانون سازی کرے گی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اُمت قانون سازی کے اختیارات کسی ایک فرد یا افراد کی محدود تعداد کے حوالے کر دے اور اس کے فیصلے سب کے لیے واجب القبول ہوں۔ گویا سوال کی صورت یہ ہوئی کہ کس فرد یا افراد کو یہ کام سونپا جائے؟

تاریخی شہادت سے اس کی توثیق ہوتی ہے کہ کسی ایک فرد کے ہاتھ میں اتنے اختیارات دے دینا ہمیشہ شدید خطرات کا موجب ہوا ہے۔ ایک حقیقت واضح ہے کہ کوئی فرد کتنا ہی روشن دماغ، راست باز اور نیک نیت کیوں نہ ہو، اس سے فیصلوں میں بہ آسانی غلطیاں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً اس بنا پر کہ اس کا ذاتی رجحان کسی ایک معاملے کی طرف تھا۔ اس کے برعکس اگر کوئی مجلس متعدد افراد پر مشتمل ہو تو متصادم آرا کی بدولت اور ان آرا پر ہونے والی بحث کے باعث ہر مسئلے کے مختلف پہلو بہ خوبی واضح ہو جانے کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ یوں قانون سازی میں انفرادی رجحان کا خطرہ اگر بالکل ختم نہ ہوگا تو کم از کم اس میں بڑی حد تک تخفیف ہو جائے گی۔ محض یہی نہیں بلکہ مطلق العنان اقتدار، صاحب اقتدار میں اکثر خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ وہ دانستہ یا نادانستہ اپنے مفاد یا اپنے طرف داروں کے مفاد کے لیے اقتدار کے غلط استعمال پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر مملکت کے لیے قانون سازی کے اختیارات ایک مجلس قانون ساز کے حوالے ہونے چاہئیں جسے ملت صرف اسی غرض سے منتخب کرے''۔ (2)

1.1۔ شریعت کا مقصد

اسلام کس طرزِ حکومت کو درست قرار دیتا ہے اور دورِ حاضر میں طرزِ حکومت کیا ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں مفکرینِ اسلام کے خیالات ملاحظہ فرمائیں۔

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

''انّ مقصوده إقامة العدل بين عباده، وقيام النّاس بالقسط، فأىّ طريق استخرج بها العدل و القسط، فهى من الدّين ليست مخالفة له''. [3]

(شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا، اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا۔)

ڈاکٹر حمید اللہ (م: 2002ء) زیادہ وضاحت سے کہتے ہیں:

''نظامِ حکومت کیا ہو؟ اس بارے میں اسلام کوئی حکم نہیں دیتا۔ بادشاہت بھی جائز ہے اور اگر جمہوریت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ اور جماعت کی حکومت ہو تو وہ بھی جائز ہے۔ ان سب کو اسلام جائز قرار دیتا ہے۔ تو ان حالات میں ہر دور کے حالات اور ہر ملک کے لوگ باہم مشاورت کے ساتھ خود ہی طے کریں گے کہ ہمیں کون سا طرز حکومت اپنے زمانے کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ آپ شاید اس بات کی ضرورت سمجھیں کہ میں بتا دوں کہ میں کیوں بادشاہت کو بھی جائز قرار دیتا ہوں۔ بعض احباب فوراً کہیں گے کہ قرآن مجید میں ملکہ سبا، بلقیس کے ضمن میں ذکر آیا ہے: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا [4] (جب بادشاہ کسی بستی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد برپا کرتے ہیں) اس سے ہمارے بھائی استدلال کریں گے کہ بادشاہت کے خلاف حکم ہے مگر میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں اچھے بادشاہوں کا ذکر بھی ہے اور برے بادشاہوں کا بھی، جہاں پیغمبروں کو بھی بادشاہ کا لقب دیا گیا ہے، جب ایسے جلیل القدر پیغمبر بادشاہت کر چکے ہیں تو پھر ہم اسے حرام کیسے قرار دے سکتے ہیں؟ قرآن میں یہ آیت جو بلقیس کے سلسلے میں آئی ہے، اس کا جواب میں یہ دوں گا کہ یہ بلقیس کے خیالات تھے جو قرآن نے نقل کیے ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر آپ کے خیال میں بادشاہت مناسب ہے تو اسے اختیار کیجیے، آپ کے خیال میں مناسب نہیں تو نہ کیجیے''۔ [5]

آج کے جمہوری دور میں ڈاکٹر حمید اللہ کے یہ خیالات بادی النظر میں تعجب خیز ہیں۔ اگر ان کا مفہوم یہ لیا جائے کہ اصل مقصد عدل و انصاف کا قیام ہے' وہ جمہوریت کے ذریعے ہو، بادشاہت کے ذریعے سے یا کسی جماعت کی حکومت کے ذریعے، تو اشکالات رفع ہو جاتے ہیں کہ حکومت و سیاست کا مقصود اصلی یہی ہے۔ اس ضمن میں خلفائے راشدینؓ کا عہد منارۂ حق اور ان کے دور کے سیاسی ڈھانچے کی روح، آج کے سیاسی نظام کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہی مخصوص وضع آج بھی اختیار کی جائے کہ زمانے کے بدلاؤ سے ہر چیز کی ظاہری شکل بدل جایا کرتی ہے مگر اس کی حقیقی روح کا قائم رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے آج کا سیاسی ڈھانچہ ظاہری شکل کے لحاظ سے خواہ مختلف ہو لیکن عہد خلفائے راشدینؓ میں سیاسی ڈھانچے کی

تشکیل کے وقت جو مقاصد اور اہداف پیش نظر رہے ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دیگر احکام کی طرح سیاسی نظام کے بارے میں قرآن و سنت میں زیادہ تفصیلی احکامات یا متعین ڈھانچہ اسی لیے نہیں ہے تاکہ مقصود اصلی کو حالات کے مطابق اختیار کیا جا سکے۔ اس بنا پر قرآن و سنت کے مفصل احکام کا محدود دائرہ محض اتفاقی یا اغماض (نظر انداز کرنے) کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اسے عمداً اس لیے محدود رکھا گیا ہے کہ قانونی و عمرانی لچک پیدا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

1.2۔ عہد اول میں عوامی نمائندگی

اس مسئلے کو اسلام کے عہد اول کے حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو مسئلہ نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ علامہ محمد اسد لکھتے ہیں:

> ''ظہورِ اسلام کے وقت عرب معاشرے کی سیاست قبائلی طرز کی تھی۔ اگرچہ اسلام نے ان میں خاصی ڈھیل پیدا کر دی تھی، مگر اس وقت کے عربی معاشرے نے بڑی حد تک قبائلی نظام باقی رکھا تھا۔ چناں چہ قبیلوں اور خاندانوں کے رئیس قانوناً نہیں تو عملاً اپنے گروہوں کی طرف سے بولنے اور عمل کرنے کے حق دار تھے۔ اجتماعی معاملات میں جو آرا قریش یا انصار کے سردار دیتے تھے، وہ ان قبیلوں اور خاندانوں کے دوسرے ارکان کی آرا سے بالکل ہم آہنگ تھیں۔ اگر خلیفہ نظامِ انتخابات جاری کرتا تو اس صورت میں بھی یہی سردار منتخب ہوتے اور ان میں سے اکثر رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ قوم انھیں کو نمائندے نامزد کرتی۔ لہٰذا انتخاب کی ضرورت نہ تھی، خلیفہ ہر ضرورت کے وقت ان ممتاز صحابیوں اور قبائلی رئیسوں کو بلا لیتا اور یہی لوگ جماعت کے نمائندوں کی حیثیت میں مجلسِ شوریٰ کے ارکان تھے۔ انتخابات میں بھی یہی لوگ کامیاب ہوتے۔ چاروں خلفائے راشدین کے زمانے میں ملت اسلامیہ کے معاشرے کے اس انتظامی ڈھانچے میں عملاً کوئی تبدیلی نہ ہوئی لہٰذا کسی کو مجلسِ شوریٰ کی ترکیب کے طریقے میں تبدیلی کی کوئی ضرورت پیش نہ آئی۔ اگر خلفائے راشدین کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا جو ہمیں پیش آئے تو یقیناً وہ ان سیاسی نتائج پر پہنچتے جو تیرہ سو سال پیش تر کے نتائج سے بہت مختلف ہوتے۔ بالفاظ دیگر ان کی مجلسِ شوریٰ رائے عامہ کی بنا پر منتخب ہوتی''۔ (6)

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر ایسا سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا جانا ضروری ہے جس میں عوامی آرا اور اُمنگوں کا مکمل لحاظ رکھا گیا ہو۔ یوں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلام کے پیش نظر ایسے عادلانہ سیاسی نظام کا قیام ہے جو عدل و انصاف فراہم کرنے میں مددگار رہو۔ دراصل نمائندگی کی اساس اعتماد ہے نہ کہ کوئی رسمی کارروائی۔ اس لیے اس دور کے نمائندے اپنے حلقہ کے معتمد ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں کو اپنے حلقے کا اعتماد حاصل ہوتا تھا۔

1.3۔ عوامی نمائندگی قرآن و سنت کی روشنی میں

قرآن نے عوامی نمائندگی کے لیے ''نقیب'' کا لفظ استعمال کیا ہے:

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا (7) (اور مقرر کیے ہم نے ان میں بارہ سردار)

تفسیر ابن عباس میں ''نقیبا'' کا معنی رسولا (نمائندہ) ملکا (بادشاہ) ذکر کیا گیا ہے کہ ہر قبیلے کا ایک بادشاہ تھا۔ [8]

قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں:

''نقیب سے مراد ہے ہر خاندان کا ایک سردار جو اپنی قوم کے احوال کا نگران تھا اور سب کی طرف سے ذمے دار تھا''۔ [9]

گویا قرآن میں ''نقیبا'' کا لفظ عوامی نمائندگی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی معنی کو حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی لیا ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

''و لیتّخذ لکلّ قوم نقیباً منهم عارفا بأخبارهم ینتظم به أمرهم لیواخذه بما عندهم''. [10]

(حاکم وقت کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر قوم سے ایک ایک نقیب نگران مقرر کرے۔ [11] جو اپنی اپنی قوم کے حالات سے باخبر ہو اور ان نقیبوں اور نگران کار لوگوں کے ذریعہ لوگوں پر اپنی حکومت قائم رکھ سکے۔)

اسی طرح ہجرت مدینہ سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے بھی ''نقبا'' کا تقرر کیا تھا۔ یہ سب رئیس القبائل تھے۔ ان کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے۔ ان میں نو (9) خزرج کے اور تین (3) اوس کے تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔ ان بارہ نقبا کا تقرر 72 اشخاص میں سے ان کی مرضی سے کیا گیا تھا۔ [12]

عمادالدین ابن کثیر (م:۷۷۴ھ) نے اس بیعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

قال رسول اللہ ﷺ: ''أخرجوا إلیَّ منکم إثنی عشر نقیبًا یکونون علیٰ قومهم بمافیهم'' فأخرجوا منهم إثنی عشر نقیبًا، تسعة من الخزرج و ثلاثة من الأوس''. [13]

(حضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس اپنی قوم کے سربرآوردہ بارہ منتخب نمائندے بھیجو۔ تو انھوں نے اپنے بارہ سردار مقرر کیے۔ نو قبیلہ خزرج سے اور تین اوس سے۔)

یہ حدیثِ مبارکہ عوامی نمائندگان کے چناؤ پر واضح طور پر دلالت کر رہی ہے۔ اس بنا پر نمائندگی کا جدید تصور نیا نہیں ہے، بلکہ آغاز اسلام ہی میں اس کے وجود کی شہادت ہمیں ملتی ہے۔

عوامی نمائندوں کو حدیث میں عرفا بھی کہا گیا ہے۔ یعنی وہ لیڈر جو قومی اُمور کو جاننے اور مسائل کو حل کرنے والے ہیں۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

''إنّ العرافة حقّ و لا بدّ للنّاس من العرفاء، و لکنّ العرفاء فی النّار.][14]

(علاقائی نمائندگی ضروری ہے اور لوگوں کے لیے نمائندے مقرر کرنا لازم ہے، لیکن برے نمائندے جہنم میں ہوں گے۔)

یہ حدیث مبارکہ عوامی نمائندگان کے چناؤ کی اہمیت اور ان کے مثبت کردار کی ضرورت کو اجاگر کر رہی ہے۔

اس حدیث میں ''عرفا'' کا لفظ ہے، جو عریف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں:

''القیّم و السّیّد لمعرفته السّیاسة القوم'' [15]

(مدبر و منتظم اور سردار جو قوم کے سیاسی معاملات کو جانتا ہو۔)

اس مفہوم کے لحاظ سے ''عریف'' اس عوامی نمائندے کو کہتے ہیں جو قومی مسائل کا ادراک رکھتا ہو۔

مشہور شارح حدیث ابوسلیمان خطابی (م:۲۷۵ھ) کہتے ہیں:

''العریف القیّم بأمر القبیلة و المحلّة یلی أمور هم و یتعرّف الأمیر منهم أحوالهم قال الشّاعر ؎

أو كلّما وردت عكاظ قبيلہ بعثوا الی عریفهم یتّق سم (16)

(عریف اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے قبیلے یا اپنے محلے کا منتظم ہو اور ان کے معاملات کا ذمے دار ہو۔ امیر اس قبیلے اور محلے کے حالات اسی کے ذریعے معلوم کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے عکاظ کے میلے میں جب بھی کوئی قبیلہ آتا ہے تو وہ اپنا عریف یعنی لیڈر اور ذمے دار نمائندہ میرے پاس بھیجتا ہے جو حالات معلوم کرتا ہے۔)

یہ مفہوم بعینہٖ وہی ہے جو عصرِ حاضر میں بلدیاتی، صوبائی اور قومی سطح کے نمائندگان کا پایا جاتا ہے کہ یہ نمائندگان اپنے اپنے فورم پر علاقائی مسائل کو زیرِ بحث لاتے ہیں اور پارلیمنٹ میں اس کی روشنی میں قانون سازی ہوتی ہے۔

نُقَبا اور عُرَفا سے متعلق مذکورۃ الصدر احادیث سے یہ بات واضح کرنا مطلوب ہے کہ عوامی نمائندگان ایسے ہونے چاہئیں جنھیں عوامی اعتماد حاصل ہو۔

قرآن و سنت اور تاریخ اسلام میں بیعت کا وجود بھی اسی حقیقت کو اُجاگر کرتا ہے کہ سیاسی نظام میں عوامی نمائندگان کی قبولیت کی پہچان بیعت کے ذریعے ہوتی تھی۔ یہ بیعت ایک عہد اور اطاعت قبول کرنے کے اظہار کے ساتھ نمائندگان پر اعتماد کا اظہار و اعلان ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے رسول اللہ ﷺ کو ان خواتین سے بیعت لینے کا حکم دیا جو اطاعت میں آنا چاہتی تھیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ ٱلْمُؤْمِنَٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِٱللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَٱسْتَغْفِرْ لَهُنَّ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾ (17)

(اے نبی ﷺ! جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو اس بات پر کہ شریک نہ ٹھہرائیں اللہ کا کسی کو اور چوری نہ کریں اور بدکاری نہ کریں اور اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں اور طوفان نہ لائیں باندھ کر اپنے ہاتھوں اور پاؤں میں اور تیری نافرمانی نہ کریں کسی بھلے کام میں، تو ان کو بیعت کر لے۔ اور معافی مانگ ان کے واسطے بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔)

اس بنا پر بیعت خلیفہ اور عوام کے درمیان دوطرفہ معاہدہ ہوتا ہے۔ جس میں امیر احکامِ الٰہی کی تنفیذ، عوام کے حقوق کی پاسداری اور عوام امام کی اطاعت اس شرط پر کرتے ہیں کہ وہ احکامِ الٰہی کا پابند رہے گا۔ چناں چہ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

''علی المرء المسلم السّمع و الطّاعة فیما احبّ و کره إلّا أن یّأمر بمعصیة، فإن أمر بمعصیة فلا سمع و لا طاعة''. (18)

(مسلمان پر پسندیدہ اور ناپسندیدہ اُمور میں امیر کی اطاعت لازم ہے جب تک کہ وہ امیر معصیت کا حکم نہ

www.rahmia.org

کرے اور اگر امیر معصیت اور گناہ کا حکم کرے تو اس مسلمان کا نہ حکم سنے گا اور نہ ہی اطاعت کرے گا۔)

''اسی بنا پر تاریخ اسلام میں امیر کے تقرر کے لیے بیعت عامہ کو ضروری قرار دیا جاتا تھا حتیٰ کہ اگر اکثریت مخالفت کرتی تھی تو گورنر معزول کر دیے جاتے تھے۔ چناں چہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ عام مسلمانوں کی رائے کا لحاظ کرتے ہوئے عمال معزول کر دیتے تھے''۔ [19]

عوامی نمائندگی کے تاریخی ارتقا پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید میں ''قوم'' کا لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس میں نہ صرف عام رائے دہندگان شہر بلکہ ایک حد تک جملہ ساکنینِ ملک شامل معلوم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو حق رائے حاصل ہوتا تھا اور وہ شورائے عمومی میں حصہ لینے کے مجاز ہوتے۔ ان کو قرآن میں ہمیشہ ''ملأ'' (Council of Elders) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ ''ملأ'' کی ''تراضی'' یعنی رضامندی ہی ہوتی تھی جس کے مطابق مقامی حکمران فیصلہ کرتا تھا۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں فرعون کے ''ملأ'' کا ذکر ہے، اس سے بنی اسرائیل خارج نظر آتے تھے جن کو کوئی شہری حقوق حاصل نہ تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں جو عزیزِ مصر تھا۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جو ملکہ سبا تھی، اس کے ہاں بھی قرآن مجید کے مطابق جو مجلسِ شوریٰ تھی اس کا نام ''ملأ'' ہی تھا۔ اس مجلس میں ''الوقوہ'' یا ''اہلِ حل وعقد'' ہی ہوا کرتے تھے اور اگر کوئی چیز نامناسب پیش آتی تو یہ مداخلت بھی کیا کرتے تھے''۔ [20]

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ قرآن کا رُجحانِ فکر قومی اُمور طے کرنے میں عوام اور عوامی نمائندگی کی آرا کے دخل کو قائم رکھنے کا ہے۔

2. شوریٰ کی معنویت اور ہمہ گیریت

دین اسلام کے علمی ذخیرے اور تاریخ اسلام کے تابناک دور کے مطالعے سے رہنمائی ملتی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد اہل الرائے سے مشاورت کے اصول پر ہے۔ چناں چہ سیاسی نظام میں جماعت سازی اور تشکیل حکومت سے لے کر قانون سازی کے تمام مراحل میں مشاورت اسلام کے سیاسی نظام کا اصل الاصول رہا ہے۔

2.1۔ شوریٰ کا لغوی و اصطلاحی معنی:

لفظ شوریٰ اسم ہے اشار علیہ جس کا معنی ہے مجلسِ شوریٰ بمعنی کونسل۔ المشور: شہد نکالنے کا آلہ۔ المشیر: مشورہ دینے والا حکومت کا نمائندہ۔ [21]

جب کہ اصطلاحی مفہوم یہ ہے:

''استطلاع الرّأی من ذوی الخبرة فیه للتوّصل إلٰی أقرب الأمور للحقّ''. [22]

(کسی معاملے کے باخبر لوگوں سے ان کی رائے معلوم کرنا تاکہ سچ اور معاملہ کی تہہ تک پہنچا جا سکے۔)

علامہ ابوحیان اندلسی (م:۷۵۴ھ) شوریٰ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

www.rahmia.org

''الاستظهار برأيهم فيما لم ينزل فيه وحى فقد يكون عندهم من أمور الدّنيا ما ينتفع به و اختبار عقولهم، فينزلهم منازلهم و اجتهادهم فيما فيه وجه الصّلاح''. [23]

(شوریٰ ان اُمور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوئی اظہار رائے کے اس تقاضے اور مطالبے کا نام ہے جس کے تحت اُمت کے افراد کے پاس موجود دنیوی معاملات میں مفید معلومات حاصل کرنا اور ان کے معاملات کی بہتری کے لیے ان کی عقل اور اجتہاد سے کام لینا ہے۔)

اس بنا پر شرعی مفہوم کے لحاظ سے شوریٰ کہتے ہیں کہ تمدنی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی بصیرت سے کام لینا۔

مولانا حامد الانصاری لکھتے ہیں:

''اسلامی حکومت اپنے شوروی میلان اور سچے جمہوری رجحان کے لحاظ سے تمام دنیا کے لیے ایک نمونہ اور معیار و منہاج ہے۔ افلاطون کے زمانہ (427 ق م) سے لے کر انگلستان میں پارلیمنٹ کے زمانہ قیام (1688ء) تک زمین کے کسی حصے میں ایسی عظیم الشان پارلیمنٹ کا پتہ نہیں چلتا جو اسلام کے نظام شوریٰ کی طرح سادہ ہو، حقیقی ہو، بے قید ڈکٹیٹر شپ اور بے لگام سرمایہ دارانہ شہنشاہیت سے بے واسطہ ولاتعلق ہو۔'' [24]

سیاسی نظام میں مشاورت کی تین بنیادیں ہیں:

۱۔ مشاورت کی معنویت۔ ۲۔ مشاورت میں تمام سماجی حلقوں کی شرکت۔

۳۔ انفرادی کی بجائے اجتماعی رائے کا اثر ونفوذ۔

مشاورت کی پہلی بنیاد کا دائرہ اثر سیاسی نظام کے تمام اداروں میں ہے۔ یہ سیاسی سرگرمیوں کی بحالی، اجتماعیت کا قیام، قانون سازی اور اس کے اطلاق کے اُمور میں چراغ راہ کی حیثیت کی حامل بنیاد ہے۔

دوسری بنیاد کے حوالے سے عہد نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے مکمل رہنمائی ملتی ہے۔

جب کہ تیسری بنیاد کے حوالے سے سیرۃ نبویؐ، آثارِ صحابہؓ، محدثین کرام اور مجتہدین عظام کی زندگیوں سے دوٹوک حکمت عملی سامنے آتی ہے اور بعض صورتوں میں یہی اجماع کی شکل اختیار کرتا ہے۔

موضوع کی مناسبت اور اختصار کے پیشِ نظر پہلی دو بنیادوں کے حوالے سے مختصر دلائل پیش ہیں۔

2.2۔ مشاورت کی معنویت

نئے پیش آمدہ مسائل اور صالح سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے اسلام میں شوریٰ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ ارشاد خداوندی ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ [25] (ان مسلمانوں کے اہم معاملات مشاورت سے طے پاتے ہیں۔)

اور حضورؐ کو حکم ہوتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ [26] (اہم معاملات میں ان صحابہؓ سے مشورہ کیجیے۔)

ابوبکر جصاص حنفیؒ (م ۳۷۰ھ) قرآن کی آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ [27] کے بارے میں

''عزم'' کا معنی لکھتے ہیں: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

''و فی ذکر العزیمة عقیب المشاورة دلالة علٰی أنّها صدرت عن المشورة''. [28]

(قرآن میں عزم کو '' وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ '' کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہوسکتا ہے جو شوریٰ کے فیصلہ کا نتیجہ ہو اور شوریٰ سے صادر ہوا ہو۔)

ابن کثیر، ابن مزدویہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ '' عزم'' سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا:

''مشاورة أهل الرّأی ثمّ اتّباعهم''. [29]

(پہلے اہل الرائے کا باہمی مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے فیصلہ کی پیروی۔)

معلوم ہوا کہ عزم وہ ارادہ ہے جو امام کے دل میں شوریٰ کے فیصلے پر کاربند ہونے کے لیے پیدا ہوتا ہے۔ یہ ارادہ شوریٰ کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ شوریٰ کے اتفاق کے مطابق ہوتا ہے۔

فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴿٢١﴾ [30]

(پھر جب بات قرار پا جائے تو اگر وہ اللہ سے سچے رہے تو ان کے لیے بہتر ہے۔)

کی روشنی میں اگر مشورہ لینے کی ایک طرف پابندی عائد کی گئی ہے تو دوسری طرف شوریٰ کے بعد جو بھی چیز قرار پا جائے، تعمیل کرنا بلا لحاظ اس کے کہ وہ اپنی رائے اور مشورے کے مطابق تھی یا مخالف، ضرورت قرار دیا گیا ہے۔

نبی ﷺ کے اسی طرز عمل کی بنا پر ابوبکر جصاصؒ نے لکھا ہے کہ:

نبی ﷺ کے لیے مشاورت ضروری ہے۔ [31]

امام ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کہتے ہیں:

''لا غنی لولی الأمر عن المشاورة، فإنّ اللّٰه أمر بها نبیّه ﷺ فغیّره أولی بالمشورة''. [32]

(کسی بھی کام کے ذمے دار کو مشورہ سے بے نیاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مشورہ کا حکم دیا ہے تو آپ کے علاوہ اَور لوگوں کے لیے بدرجہ اولی مشورہ کا حکم ثابت ہوگا۔)

ابوحیان اندلسیؒ کہتے ہیں:

''الاستظهار برأیهم فیما لم ینزل فیه وحی فقد یکون عندهم من أمور الدّنیا ما ینتفع به و اختبار عقولهم، فینزلهم منازلهم و اجتهادهم فیما فیه وجه الصّلاح''. [33]

(شوریٰ ان اُمور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوئی اظہار رائے کے اس تقاضے اور مطالبے کا نام ہے جس کے تحت اُمت کے افراد کے پاس موجود دنیوی معاملات میں مفید معلومات حاصل کرنا اور ان کے معاملات کی بہتری کے لیے ان کی عقل اور اجتہاد سے کام لینا ہے۔)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ لکھتے ہیں:

www.rahmia.org

’’الغرض! شوریٰ کو اسلام کے نظام حکومت میں ایک اساسی ستون کی حیثیت حاصل ہے جس کی بنیاد پر اب کسی مطلق العنانیت یا آمریت کی گنجائش باقی نہیں رہتی‘‘۔ (34)

اسی بنا پر مستند ماہر قانون امام عبدالحق بن غالب بن عطیہؒ (م:۵۴۶ھ) کہتے ہیں:

’’إنّ الشّوریٰ هی من قواعد الشّريعة وعزائم الأحكام‘‘. (35)

(بلاشبہ شوریٰ شریعت کے بنیادی ضابطوں اور عزیمت کے احکام میں سے ہے۔)

انھی حقائق کے سبب انگریز قانون دان ’آرمینس وان میری‘ نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ:

’’کائناتِ ارضی کے تمام مذاہب میں اسلام ایک ایسا مذہب ہے جسے ڈیموکریسی کی بنیاد پر امتیاز اور فوقیت حاصل ہے۔ انسان کی عمرانی تاریخ سے آج تک اگر صحیح معنی میں کوئی جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے تو بقسم یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ خلفائے راشدین کی خلافت راشدہ تھی‘‘۔ (36)

2.3۔عہدِ رسالت میں مشاورت اور نمائندگی کا طریق کار

آں حضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب سیاسی کلچر میں عوامی نمائندگی، قانون سازی اور اس کے نفاذ کے حوالے سے چند روایات کا پتہ چلتا ہے۔ اس بابت ڈاکٹر حمید اللہ کہتے ہیں:

’’مکہ مکرمہ میں دس ارکان کی ایک مجلس ہوتی تھی جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پالمیرا میں اسی طرح کی ایک مجلس موجود اور کارفرما تھی جس کے علاوہ ایک مجلس عام یا سینیٹ بھی تھی جس کا اپنا صدر اور اپنا معتمد ہوا کرتا تھا۔ مجلس دہگانہ اور سینیٹ قانون بناتے، قوانین مالی کے نفاذ کی نگرانی کرتے اور ضرورت پر سزاؤں کے احکام دیتے‘‘۔ (37)

مگر اس کے ساتھ ایک یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ عربوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو عوامی نمائندگی کے اس طرز کو پسند یا اختیار نہ کرتے تھے۔ چناں چہ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

’’شہر مکہ میں کوئی فردی حکومت نہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ عرب کے مختلف حصوں میں فردیت یا بادشاہت کی طرف رغبت پیدا ہو چلی تھی۔ چناں چہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عثمان بن الحویرث نے مکہ میں بادشاہ بننے کی کوشش کی تھی۔ مدینے میں عبداللہ بن اُبی بن سلول کے لیے تو تاج شہریاری کی تیاری تک کاریگروں کے سپرد ہو چکی تھی کہ اتنے میں جناب رسالت مآب ﷺ کی ہجرت کا واقعہ پیش آیا اور پھر اس کے ساتھیوں کے لیے اس کا موقع نہ رہا کہ کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز کر سکیں‘‘۔ (38)

اس تناظر میں اسلام کا شوروی میلان اور عوامی نمائندگی کا رجحان واضح ہوتا ہے۔

اُمورِ مُہِــــمّــــہ میں فیصلہ سازی کے لیے رسول اکرم ﷺ کو براہ راست وحی سے رہنمائی حاصل تھی۔ اس بنا پر آپ کو مشاورت کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن آپؐ کے بعد منصب نبوت کسی اور کو ملنے والا نہ تھا۔ ضرورت تھی کہ اسلام میں قانون سازی کے لیے مشاورتی نظام کو حضورؐ خود اپنے قول و عمل سے مستحکم کر دیں۔ اس بنا پر قرآن نے حضورؐ کو ایک بنیادی اور اساسی حکم دیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (39) (اہم اُمور (انتظامی) میں (صحابہ کرامؓ سے) مشورہ کیا کریں۔)

اس آیت مبارکہ میں قرآن نے حضور ﷺ کو صحابہ کرامؓ سے مشاورت کے التزام کا حکم دیا جس کے دو مقاصد تھے:

ایک تو یہ کہ انتظامی اُمور میں صحابہؓ کو مشاورت اور عملی حوالے سے شریک کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس سرگرمی اور عملی شراکت سے تعبیر دین، نفاذِ دین اور اس کے متعلقہ اُمور میں صحابہؓ کو حضور ﷺ کی نگرانی میں تجربہ حاصل ہوتا کہ جماعت صحابہؓ اس ذمے داری کو حضور ﷺ کے بعد درست طور پر سنبھال سکے۔

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝ (40)

کا یہی مفہوم ہے کہ وہ کام اور ذمے داری جو حضور ﷺ کی ہے جسے قرآن لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (41) کے ساتھ تعبیر کرتا ہے۔ اس فرض اور ذمے داری کو نبھانے کے لیے اب آپؐ اکیلے نہیں رہے بلکہ پوری ایک جماعت آپ کے ساتھ مصروف عمل ہوگئی ہے۔ اس بنا پر انتظامی اُمور میں صحابہؓ سے مشاورت محض ان کی دل داری کے لیے نہ تھی بلکہ اس کی قانونی حیثیت بھی تھی۔ علامہ ابوبکر جصاص نے اسی حقیقت کو اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

''و غير جائز أن يكون الأمر بالمشاورة علٰى جهة تطييب نفوسهم، و رفع أقدارهم، و لتقتدى الأمّة به فى مثله، لأنّه لو كان معلوماً عندهم أنّهم إذا استفرغوا مجهودهم فى استنباط ما شوروا فيه، و صواب الرّأى فيما سئلوا عنه، ثمّ لم يكن ذٰلک معمول عليه، و لا متلقى منه بالقبول بوجه لم يكن فى ذٰلک تطييب نفوسهم و لارفع أقدارهم، بل فيه ايحاشهم و اعلامهم بأن آراء هم غيرمقبولة و لا معمول عليهم''. (42)

(اور یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی ہے کہ صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا یہ حکم محض صحابہ کی دلداری اور ان کی عزت افزائی کے خیال سے دیا گیا ہو یا محض اس خیال سے دیا گیا ہو کہ اس طرح کے معاملات میں اُمت کو آپؐ کے اس طریقے کی اقتدا کرنے کی تعلیم دی جائے۔ حال آں کہ صحابہؓ کو اگر یہ علم ہوتا کہ جب وہ زیرِمشورہ اُمور میں خوب غور و فکر کے بعد کوئی رائے قائم کریں گے تو نہ اس پر عمل ہی ہوگا اور نہ ہی کسی پہلو کے لحاظ سے اس کی قدر کی جائے گی تو دل داری اور عزت افزائی کی بجائے الٹا اس کا اثر ان پر یہ پڑتا کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی آرا نہ قبول کیے جانے کے لیے ہیں نہ عمل کیے جانے کے لیے بلکہ محض پیش کیے جانے کے لیے ہیں۔)

علامہ جصّاصؒ کی اس رائے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے حضور ﷺ کا مشورہ محض ان کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ تھا، بلکہ دین کے عملی نظام کی تشکیل کے لیے حقیقی اور عملی تھا اور یہ کہ زیرِ بحث امر کی بابت پیش کی جانے والی تجاویز قانون کا درجہ نہیں رکھتیں، لیکن بحث کے بعد طے پانے والا قانون دراصل اسی شوریٰ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور وہ قانون ہر ایک کے لیے لازم ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال قابل حل ہے کہ مشاورت کی حدود کیا ہیں؟ کن اُمور میں مشورہ لیا جانا ضروری ہے؟ اس اہم مسئلے کو بھی علامہ ابوبکر جصاصؒ نے حل کیا ہے۔ کہتے ہیں:

''و قال آخرون: كان مأموراً بمشاورتهم فى أمور الدّين والحوادث الّتى لا توقيف فيها

عن اللّٰہ تعالیٰ وفی أمور الدّنیا أیضاً ممّا طریقہ الرّأی و غالب الظّنّ و قد شاورھم یوم بدر فی الأساریٰ و کان ذلک من أمور الدّین. (43)

(ایک رائے یہ ہے کہ نبی ﷺ کو صحابہؓ سے مشورہ لینے کا یہ حکم دینی معاملات اور اسی طرح کے حوادث میں تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی متعین ہدایت وارد نہ ہو چکی ہو اور ان دنیوی معاملات میں بھی تھا جن میں فیصلے رائے و مشورے اور گمان غالب کے تحت ہوا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے بدر کے موقع پر قیدیوں کے بارے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا حال آں کہ یہ (اُمور دین) معاملات کی قسم میں سے تھا۔)

علامہ جصاص کی اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ نبی ﷺ ان تمام اُمور میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو خواہ وہ اُمور دینی ہوں یا دنیوی نوعیت کے ہوں۔

اسی بنا پر حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

’’مارأیت أحداً أکثرمشورۃ لأصحابہ من رسول اللّٰہ ﷺ‘‘. (44)

(میں نے کسی کو بھی حضور ﷺ سے زیادہ اپنے رفقا کار سے مشورہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔)

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (45) کی وضاحت رسول اللہ ﷺ یوں فرماتے ہیں:

(اور ان کے اہم معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔)

’’حدّثنی أبوسلمۃ أنّ النبیّ ﷺ سُئل عن الأمر یحدث لیس فی کتاب و لا سنّتہ، فقال: ’’ینظر فیہ العابدون من المؤمنین‘‘. (46)

(حضرت ابوسلمہؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس معاملے پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کر لیں گے۔)

اس مضمون کی ایک اور حدیث ہے:

’’عن علیّ قال: قلتُ: یارسول اللّٰہ! إن عرض لی أمر لم ینزل قضاء فی أمرہ و لا سنۃ، کیف تأمرنی؟ قال: ’’تجعلونہ شوریٰ بین أھل الفقہ، و العابدین من المؤمنین، و لا تقص فیہ برأیک خاصّۃ‘‘. (47)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا ذکر نہ تو قرآن میں ہو نہ سنت میں تو اس معاملے میں آپ مجھے کیا روش اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اس کو قانون اسلامی میں بصیرت رکھنے والوں اور صالحین کے مشورہ سے طے کرو اور اس میں تنہا اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو‘‘۔)

ذخیرۂ احادیث میں اس اَمر (شوریٰ) پر متعدد واقعات ملتے ہیں، جنھیں موضوع بحث کی وضاحت کے لیے یہاں ذکر کیا جاتا

ہے۔ چناں چہ: ان میں سے ایک واقعہ بیعت عقبہ ثانیہ کا ہے کہ جب مدینہ منورہ کے لیے نقبا کے تقرر کی ضرورت پیش آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''أخرجوا إليَّ منكم إثني عشر نقيبًا يكونون علىٰ قومهم بمافيهم''، فأخرجوا منهم إثني عشر نقيبًا، تسعة من الخزرج وثلاثة من الأوس''. (48)

(میرے پاس اپنی قوم کے سربرآوردہ بارہ منتخب نمائندے بھیجو تو انھوں نے اپنے بارہ سردار مقرر کیے۔ نو قبیلہ خزرج سے اور تین اوس سے۔)

یہ واقعہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ نبی ﷺ کسی بھی قوم پر عوامی نمائندگان کے تقرر کو ان کی مشاورت اور مرضی کے بغیر کرنا' پسند نہ فرماتے تھے۔

بدر الکبریٰ کے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا حکم دیا اور مجلس کا افتتاح ان الفاظ سے فرمایا:

''أشيروا عليّ في أناس''. (49) (آپ سب لوگ مجھے مشورہ دیں کہ کیا کرنا چاہیے۔)

بحث و تمحیص کے بعد جنگ کے حق میں فیصلہ ہو گیا اور اس کی تعمیل میں اسلامی لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم مل گیا۔

اسی طرح دوسرا واقعہ بدر کے قیدیوں کی مشاورت کا ہے کہ اس اجتماعی اَمر میں رسول ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا اور آرا کے مذاکرے اور بحث و گفتگو کے بعد قیدیوں سے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا۔ (50)

اس ضمن میں آں حضرت ﷺ کے الفاظ یہ تھے:

''ما تقولون في هؤلآء الأسارى''. (51) (تم ان قیدیوں کے بارے میں کیا کہتے ہو۔)

ذخیرہ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے کئی ایک مواقع پر شوریٰ کے فیصلوں پر عمل کیا۔ حال آں کہ آپ کی رائے مختلف ہوتی تھی۔ چناں چہ:

آپؐ نے غزوہ احد کے موقع پر مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے بارے میں صحابہؓ کی رائے پر عمل کیا۔ (52)

واقعہ افک کے بعد حضور ﷺ نے صحابہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ما تشيرون علي في قوم يسبّون أهلي''. (53)

(کیا مشورہ ہے تمھارا ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے میرے گھر والوں پر تہمت لگائی۔)

حضور ﷺ اس اَمر میں اس حد تک صحابہ کرامؓ کی آرا اور مشورہ کا خیال کیا کرتے تھے کہ آپ اپنی قطعی رائے بلکہ طے شدہ اُمور کو بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ کی وجہ سے بدل دیا کرتے تھے۔ چناں چہ غزوہ احزاب کے موقع پر آں حضرت ﷺ نے بنو غطفان کے سامنے یہ پیش کش کرنا چاہی کہ اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو آپ ان کو مدینہ منورہ کے پھلوں کا ثلث حصہ سالانہ دیتے رہیں گے۔ اس کے لیے ایک معاہدہ کا مسودہ بھی قلم بند ہو چکا تھا لیکن جب آپؐ نے اس معاملے میں صحابہ رضی اللہ عنہم خصوصاً انصار کے لیڈروں سے مشورہ کیا تو انھوں نے اس اَمر میں شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا کہ ہم تو ان سے تلوار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر نبی ﷺ نے صحابہ کی رائے قبول فرمائی اور معاہدہ کا مسودہ چاک کر دیا۔ ابن کثیر نے یہ طویل قصہ

ذکر کیا ہے۔ اس کے درج ذیل الفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم کی حتمی رائے کو ظاہر کر رہے ہیں، جن پر کہ حضور ﷺ نے عمل کیا:

''و اللّٰہ لا نعطیھم إلّا السّیف، حتّٰی یحکم اللّٰہ بیننا و بینھم، فقال النبیّ ﷺ: ''أنت وذاک''، فتناول سعد بن معاذ الصّحیفۃ فمحا ما فیھا من الکتاب''. (54)

(اللہ کی قسم! ہم تو ان سے تلوار کی زبان ہی میں بات کریں گے یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دیں۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا بہتر۔ پھر آپ ﷺ نے سعد بن معاذ سے وہ معاہدہ لیا اور جو کچھ اس میں لکھا تھا قلم زد فرما دیا۔)

صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک خاتون کے مشورہ پر عمل کیا۔ اس کی نوبت یوں پیش آئی کہ صلح حدیبیہ کی روشنی میں آپ ﷺ کو عمرہ کیے بغیر واپس مدینہ منورہ لوٹنا تھا جب کہ آپؐ اور صحابہ رضی اللہ عنہم حالت احرام میں تھے اور آپ ﷺ احرام کھولنا چاہتے تھے مگر دل میں خدشہ تھا کہ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو کہا گیا اور انھوں نے بات نہ مانی تو ان کے حق میں بہتر نہ ہو گا۔ اس تشویش کا اظہار زوجہ محترمہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ان کو پوچھنے پر کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ آپ ﷺ کسی سے کچھ کہے بغیر خاموشی سے قربانی کا جانور ذبح کر کے بال اُتروا دیں اور احرام کھول دیں۔ آپ ﷺ کا عمل دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم ذاتی رائے چھوڑ دیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ (55)

عہد نبوی ﷺ میں شورائے اسیران ہوازن ۸ھ میں ہوا۔ غزوہ حنین میں ہوازن کے چھ ہزار جنگی قیدیوں کے متعلق نمائندہ اسمبلی طلب کی گئی۔ سب نے آپ ﷺ کی رائے کی حمایت کی مگر آپ ﷺ نے فرمایا:

''فارجعوا حتّٰی یرفع إلینا عرفاء کم أمرکم''. (56)

(تم واپس چلے جاؤ یہاں تک کہ تمھارے سردار آ کر ہمارے پاس یہ معاملہ پیش کریں۔)

اس حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ اُمور مہمہ میں اجتماعی رائے کو اہمیت دے رہے ہیں جو اس بات کا غماز ہے کہ سماجی اور سیاسی اُمور میں عوامی رائے کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اور اولوالامر کی اطاعت کی عملی تعبیر ہے جو اجتماعی حکومت کی شکل اختیار کرتی ہے۔

آپؐ نے طائف کا حصار کرنے کے بارے میں مشورہ کیا۔ ہوا یوں کہ حنین میں شکست کھا کر چند قبائل عرب یہاں قلعہ بند ہو گئے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے دوران مشاورت حضرت سلمان فارسیؓ نے مشورہ دیا کہ آلہ قلعہ شکن ''منجنیق'' کا استعمال کیا جائے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے اس مشورہ پر عمل فرمایا۔ (57)

حضور ﷺ کے اسی مزاج کے پیش نظر حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

''ما رأیت أحدًا أکثر مشورۃ لأصحابہ من النبیّ ﷺ''. (58)

(میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہو۔)

چناں چہ حضرت علیؓ ایک حدیث روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''لو کنت مئومرا أحداً من غیر مشورۃ منھم لأمرت علیھم ابن أمّ عبداللّٰہؓ''. (59)

(اگر میں مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو امیر مقرر کرتا تو ان پر عبداللہ بن مسعودؓ کو مقرر کرتا۔)

ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا:

[ألا أخبركم بخيار أمراء كم و شرارهم الّذين تحبّونهم و يحبّونكم و تدعون لهم، و شرار امراء كم الّذين تبغضونهم و يبغضونكم، و تلعنونهم و يلعنونكم''. (60)

(کیا تم کو میں تمھارے بہترین امرا اور بدترین امرا کی خبر نہ کردوں۔ تمھارے بہترین امرا وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کے لیے تم دعا (خیر) کرو وہ تمھارے لیے دعا (خیر) کریں۔ اور تمھارے بدترین امرا وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں تم ان پر لعنت کرو وہ تم پر لعنت کریں۔)

یہ حدیث مبارکہ ایک صالح سیاسی نظام کی تشکیل کی نشان دہی کر رہی ہے کیوں کہ اس حدیث میں لیڈرشپ کی اچھائی اور برائی کو ظاہر کیا گیا ہے جو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ مسلمانوں کی ذمے داری ہے کہ حکمرانی کے لیے وہ ان لوگوں کو پسند اور اختیار کریں جو ان کے لیے خیر خواہی اور بھلائی چاہیں کیوں کہ کسی انسان سے الفت و محبت کا رویہ اسی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔

اس بیداری شعور کی بنا پر دورِ خلفائے راشدین میں انعقاد خلافت کے مختلف طریقے اس امر کا غماز ہیں کہ دین اسلام میں شروع دن سے یہ اسلوب اپنایا گیا کہ قوم و ملت کی قیادت کسی ایسی جماعت کے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جس کو جمہور نے ان کی استعداد اور قابلیت سے مطمئن ہو کر تمدنی وحدت قائم رکھنے کا اہتمام سپرد کیا ہو یا اس جماعت کا کوئی ایسا شخص ہو جس کے سامنے ہر شخص سرِ تسلیم خم کرے۔ آں حضرت ﷺ نے اپنی زندگی میں خلافت کا دوٹوک فیصلہ بھی غالباً اسی لیے نہ کیا تھا کہ آپؐ عربوں کے شورائی نظام کو پسند کرتے تھے۔ صحابہؓ اس سے واقف تھے بالخصوص وہ مرکزی جماعت جو حضور ﷺ کے ہر وقت قریب تھی اس لیے حضور ﷺ کو اعتماد تھا کہ مسلمان عربی جمہوری طریقہ انتخاب سے ایک شخص کو اپنا حاکم بنا لیں گے۔

2.4۔ دورِ خلفائے راشدین میں عوامی رائے دہی

خلافت راشدہ کے دور میں عوامی مسائل کے حل کی عملی صورت یہ تھی:

''عن المسيّب بن رافع قال: كانوا إذا نزلت بهم قضية ليس فيها من رسول الله ﷺ أثراً اجتمعوا فالحق فيما رأوا''. (61)

(حضرت مسیّب بن رافعؒ سے روایت ہے کہ جب صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آتا جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نہ ہوتی تو اس کے لیے وہ مجتمع ہوتے اور ایک بات پر اتفاق کرتے تو جس بات پر وہ متفق ہو جاتے حق اسی کے اندر ہوتا۔)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا طرز عمل اس آیت مبارکہ کی روشنی میں تھا:

وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (62)

(اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو (منافقین) پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو

رسول ﷺ اور اپنے اہل حل وعقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہل بصیرت ہیں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔)

دینی سیاسی نظام میں جن لوگوں کے سامنے اہم اُمور پیش کیے جانے چاہئیں۔ اس آیت میں ان کی دو صفات متعین طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولوالامر یعنی سربراہ کار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ اہل استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی وسیاسی بصیرت رکھنے والے ہوں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ معاشرے کے امن و جنگ کے معاملات کو ہمیشہ ان کا نظام ہی دیکھتا بھالتا ہے اور کسی اور کو قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ ذمہ داری اس جماعت کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں زمام کار ہوتی ہے، اور یہ جماعت اسی معاشرہ میں سے ہوتی ہے جس کے لیے آیت میں ''منھم'' کا لفظ خاص طور پر ذکر ہوا۔ اس جماعت (نظام) کے کئی شعبے ہوتے ہیں، جن میں سے ایک شعبہ اہل استنباط کا ذکر یہاں ہے۔

تفسیر کشاف میں اس آیت کی تفسیر یہ ہے:

''هم كبراء الصّحابة البصراء بالأمور''. (63)

(اس (اولوالامر) سے مراد اکابر صحابہ اور اہل بصیرت لوگ ہیں۔)

سنن دارمی میں میمون بن مہران کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے دورِ خلافت میں اُمورِ مہمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے قرآن وسنت کی طرف رجوع کرتے، اگر انھیں سوال کا جواب نہ ملتا تو:

''فان أعياه أن يجد فيه سنّته من رسول الله ﷺ جمع رؤوس النّاس و خيارهم فاستشارهم فإذا اجتمع رأيهم علىٰ أمرٍ قضى به''. (64)

(اگر اس تلاش کے بعد بھی ان کو رسول اللہؐ کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق وہ معاملے کا فیصلہ کر دیتے۔)

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ رقم طراز ہیں:

''و كانت النّازلة إذا نزلت بأمير المؤمنين عمر بن الخطّابؓ ليس عنده فيها نصّ عن الله و لا عن رسوله جمع لها أصحاب رسول الله ﷺ ثمّ جعلها شوریٰ بينهم''. (65)

(جب بھی امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس میں ان کے پاس اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے کوئی نص (واضح حکم) نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ کو جمع کرتے اور ان میں مسئلے کو مشاورت کے لیے پیش کرتے۔)

مؤرخ بلاذری حضرت عمر فاروقؓ کی مجلس مشاورت کا حال لکھتے ہیں:

''كان للمهاجرين مجلس في المسجد فكان عمر يجلس معهم فيه و يحدثهم عمّا ينتهى إليه من أمور الأفاق''. (66)

(مہاجرین کی ایک مجلس مسجد نبویؐ میں اپنی نشست کیا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ اس مجلس کے سامنے وہ تمام حالات رکھا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف گوشوں سے ان کو پہنچا کرتے تھے۔)

عراق و شام کے فتح ہونے پر وہاں کی زمینوں کی تقسیم کی بابت اختلاف پیدا ہو گیا۔ ایک رائے تھی کہ یہ زمین حسب معمول فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے جب کہ ایک رائے یہ تھی کہ زمین اصل باشندوں کے پاس رہنے دی جائے۔ آخر الذکر رائے حضرت عمرؓ اور کئی ممبرانِ شوریٰ کی تھی۔ اس اختلافی مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے کے لیے حضرت عمر فاروقؓ نے جب ایک مجلس مشاورت بلائی تو دورانِ گفتگو فرماتے ہیں:

''إن تشركو في أمانتي فيما حملت من أموركم فإنّي واحد كأحدكم، و أنتم اليوم تقرون بالحقّ خالفني من خالفني، و وافقني من وافقني، ولست أريد أن تتّبعوا هٰذا الّذي هو رائي''. (67)

(وہ ذمے داری جو میں نے تمھارے معاملات چلانے کے لیے سنبھالی ہے تم اس میں مکمل طور پر میرے ساتھ شریک ہو۔ تم میں سے ہر ایک فرد کی طرح میں بھی ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہوں (گویا میرا ووٹ دوسرے کسی ایک فرد کے ووٹ کی طرح ہے) آج کے دور میں تمھاری جماعت حق پر قائم ہے۔ گویا حقائق کو سامنے رکھ کر آج تم نے ہی صحیح فیصلہ کرنا ہے جو میری رائے کی مخالفت کرنا چاہتا ہے بخوشی میری مخالفت کرے اور جو میری رائے سے اتفاق کرنا چاہے، بغیر کسی جبر و اکراہ کے کرے۔ میں قطعاً یہ نہیں چاہتا' کہ تم لوگ میری رائے کو ضرور تسلیم کرو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو۔)

حضرت عمر فاروقؓ اُمورِ مہمہ میں مشاورت کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ اس بابت ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا:

''لا خلافة إلّا عن مشورة''. (68) (مشورہ کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔)

حضرت عمر فاروقؓ نہ صرف اہم حکومتی اُمور' شوریٰ کے ذریعے طے کرتے بلکہ صوبوں اور اضلاع کے حکام بھی اکثر و پیشتر رعایا کی مرضی سے مقرر فرماتے۔ چناں چہ قاضی ابو یوسفؒ لکھتے ہیں:

''كتب عمر بن الخطّاب إلٰى أهل الكوفة يبعثون إليه رجلاً من أخيارهم و أصلحهم و إلى أهل البصرة كذٰلك، و إلٰى أهل الشّام كذٰلك، قال: وبعث إليه أهل الكوفة عثمان بن فرقد و بعث إليه أهل الشّام معن بن يزيد، و بعث إليه أهل البصرة الحجّاج بن علاط، كلّهم سميون، قال: فاستعمل كلّ واحد منهم علٰى خراج أرضه''. (69)

(کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عُمّال مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمر فاروقؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک ایسے شخص کا انتخاب کر کے بھیجیں جو ان لوگوں کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانت دار اور قابل ہو۔ چناں چہ کوفہ سے عثمان بن فرقد، شام سے معن بن یزید، بصرہ سے حجاج بن علاط کو لوگوں نے منتخب کر کے بھیجا اور حضرت عمرؓ نے انھی لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا۔)

دورِ عمر فاروقؓ کے سیاسی اور اختلافی اُمور کے حل کا طریقہ بیان کرتے ہوئے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کہتے ہیں:

''كان من سيرت عمر ؓ كان يشاور الصّحابة و يناظرهم، حتّٰى تنكشف الغمّة وتأنيه الثلج فصار غالب قضايا. و فتاواه متّبعة في مشارق الأرض و مغاربها'. (70)

(حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کرتے اور ان سے بحث کرتے یہاں تک کہ اُلجھن دور ہو جاتی۔ اور دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کے فتوؤں اور فیصلوں پر مشرق و مغرب میں عمل درآمد ہوتا رہا۔)

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں نمائندگان کے لیے بوڑھے، جوان کی تخصیص نہیں تھی۔ چناں چہ امام بخاریؒ کتاب التفسیر سورۃ الاعراف میں ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں:

''كان القرّاء أصحاب مجالس عمرؓ و مشاورته كهولاً كانوا أو شبّان''. (71)

(حضرت عمرؓ کی مجالس مشاورت میں ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان ہوں۔)

یعنی معاشرے کے ذی عقل، ذی شعور لوگ خلیفہ کو مشورہ دیتے۔ آرا کا تبادلہ اور بحث و مباحثہ کرتے۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ مشاورتی ادارہ بہت مؤثر انداز میں کام کرتا ہے۔ عوامی نمائندگی کی یہ بہترین مثال ہے۔

عہدِ حضرت عثمان غنیؓ کے حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

''تحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمانؓ اختلاف مسائل فقہیہ واقع نمی شد در محل اختلاف بہ خلیفہ رجوع مے کردند و خلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار مے کرد و ھماں امر مجمع علیہ مے شد''۔ (72)

(تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک قانونی اُمور میں کوئی ایسا اختلاف سامنے نہیں آیا کہ اس اختلافی مسئلے میں خلیفۂ وقت نے اہل الرائے کی طرف رجوع نہ کیا ہو اور ہر ایسے مسئلے میں غور و خوض اور مشاورت کے بعد جو متفقہ فیصلہ ہو جاتا اسے نافذ کر دیا جاتا۔)

مذکورہ بالا دلائل سے اسلام کا شوروی میلان قرآن و سنت و آثارِ صحابہؓ سے واضح ہوا' جس کی روشنی میں یہ بات نمایاں ہوئی کہ متعدد متعین احکام اسلام کے علاوہ بے شمار پیش آمدہ مسائل کے حل اور لائحۂ عمل طے کرنے میں شوریٰ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ چناں چہ مولانا ابوالکلام آزادؒ رقم طراز ہیں:

''الغرض! دورِ نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ میں شوریٰ کے ادارہ کو مکمل طور پر انتخابی و انتظامی معاملات میں فوقیت دی گئی اور اس کے بغیر کسی فیصلے کو نہ تو پسند کیا گیا اور نہ ہی اسے نافذ کیا گیا۔ ایسے میں اس اَمر کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ دورِ حاضر کے مروجہ جمہوری نظام سے مرعوبیت کے نتیجے میں اسلام پر استبدادیت یا مطلق العنانیت اور فرد واحد کی صوابدید کو اختیار کرنے کا بدنما داغ لگا دیا جائے''۔ (73)

تفسیر مظہری میں ایک روایت درج ہے:

''كان عمر يشاور حتّٰى المرأة''. (74) (حضرت عمرؓ مشورہ کیا کرتے تھے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی۔)

اس روایت کی روشنی میں اسلام کے حریت رائے کا علمبردار ہونے اور شوریٰ کے دائرہ کار کی وسعت اور ہمہ گیریت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

2.5۔ مشاورت میں تمام سماجی حلقوں کی نمائندگی

اسلام کے سیاسی نظام کی دوسری بنیاد (سیاسی عمل میں سماج کے تمام حلقوں کی مشاورت) کے حوالے سے عہد نبویؐ اور دورِ صحابہؓ سے ہمیں واضح رہنمائی ملتی ہے۔ چناں چہ:

جنگِ بدر کے اقدام سے پہلے آپ ﷺ نے صرف مہاجرین کی رائے پر فیصلہ نہ فرمایا، بلکہ انصار سے رائے طلب کی اور انھوں نے تائید کی۔ اس ضمن میں حضرت سعد بن عبادہؓ کے الفاظ قابل غور ہیں۔ انھوں نے کہا:

''إیّانا ترید یا رسول اللّٰہ و الّذی نفسی بیدہ لو أمرتنا أن نخیضھا البحر لأخفناھا، و لو أمرتنا أن نضرب أکباد ھا إلٰی برک الغماد لنعلنا''. (75)

(اے اللہ کے رسول! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے۔ اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد (یمن کے ایک علاقے کا نام) پر دھاوا بول دیں تو ہم ایسا کریں گے۔)

اسی طرح آں حضرت ﷺ نے غزوہ حنین کے موقع پر اسیران ہوازن کے متعلق عوام کی رائے معلوم کرنی چاہی تو مجمع عام سے پکار آئی ''ہم راضی ہیں'' یعنی ہم آپؐ کے فیصلے پر راضی ہیں اور یہ کہ اسیران ہوازن پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اسے قبول نہ فرمایا بلکہ امیرانِ ہوازن کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے طور پر اپنے اپنے حلقے میں فرداً فرداً ہر ایک کی رائے معلوم کریں۔ جب ان کی رپورٹیں موصول ہوگئیں تب آں حضرت ﷺ نے فیصلہ فرمایا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''فإنّ إخوانکم جاؤوانا تائبین، و إنّی قد رأیت أن ارد إلیھم سبیھم، فمن أحبّ منکم أن یطیب ذٰلک فلیفعل، و من أحبّ منکم أن تکون علٰی حظّہ حتّٰی نعطیہ إیّاہ من أوّل ما یفیء اللّٰہ علینا فلیفعل، فقال النّاس: وقد طیّبنا ذٰ لک یارسول اللّٰہ! فقال رسول اللّٰہ ﷺ: ''أنا لا ندری من أذن منکم فی ذٰلک ممّن لم یأذن، فارجعو حتّٰی یرفع إلینـاعرفاء کم أمرکم، فرجع النّاس فکلّھم عرفاء ھم، ثمّ رجعوا إلٰی رسول اللّٰہ فأخبروہ أنّھم طیبوو اذنو''. (76)

(تمھارے بھائی تائب ہوکر آئے ہیں اور میری رائے یہ ہے کہ میں ان کے قیدی انھیں لوٹا دوں۔ تم میں سے اس بات کو جو بہ خوشی پسند کرے تو وہ ایسا کرے البتہ جو تم میں سے یہ پسند کرے کہ ہم اس کا حصہ اس کے پاس رہنے دیں تو اسے اس کا اختیار ہے۔ تو سب لوگ بیک زبان ہوکر بولے اے رسول اللہ ﷺ! ہم آپؐ کی رائے سے متفق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہمیں کیا معلوم کہ تم میں سے کس نے بہ خوشی یہ بات کہی ہے۔ واپس پلٹ جاؤ یہاں تک کہ تمھارے سردار آکر ہمارے پاس یہ معاملہ پیش کریں تو تمام لوگ واپس چلے گئے اور یہ ان کے سربرآوردہ لوگ تھے۔ پھر مشورہ کے بعد یہ لوگ حضور ﷺ کے پاس پلٹے اور آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ سب لوگوں نے برضا و رغبت اجازت دی ہے۔)

اسی اصول کے پیش نظر بیعت عقبہ ثانیہ میں حضورؐ نے آنے والے وفد کو فرمایا:

www.rahmia.org

''اخرجو إلی منکم اثنی عشر نقیبا لیکونوا علی قومهم بمافیهم''.[77]

(اپنے میں سے بارہ افراد کو ہمارے حوالے کرو تاکہ وہ تربیت پا کر قوم کو رہنمائی دیں۔)

سرداران قوم عوامی چناؤ کے ذریعے سے لانے اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا:

''الااخبر کم بخیار امراء کم وشرارهم الذین تحبونهم ویحبونکم وتدعون لهم وشرار امراء کم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنو نکم''.[78]

(کیا تم کو میں تمھارے بہترین امرا اور بدترین امرا کی خبر نہ کردوں۔ تمھارے بہترین امرا وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں اور جن کے لیے تم دعا (خیر) کرو اور تمھارے بدترین امرا وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان پر لعنت کرو وہ تم پر لعنت کریں۔)

حضور ﷺ کی نگرانی میں جماعت صحابہؓ کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ:

''اُمت نے آں حضرتؐ کی وفات کے بعد شوریٰ کے اصول پر عمل کیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے انتخاب میں جو آزادانہ شورائی بحثیں ہوئیں اور بعد میں اُمت کی قوتِ فیصلہ نے جس شان سے فیصلہ کیا اس سے پہلے دنیا کی کسی پارلیمنٹ نے ایسی مثال پیش نہیں کی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے فاروق اعظمؓ کی نامزدگی سے پہلے اصول شوریٰ پر عمل کر کے اصحاب رسولؐ سے مشورہ کیا تھا''۔[79]

پھر یہ عمل رُک نہیں گیا بلکہ:

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب سے لے کر حضرت علی المرتضیٰؓ کے انتخاب تک رائے عامہ کا یکساں عمل دخل رہا ہے اگر چہ چاروں انتخابوں میں جداگانہ اصول کارفرما نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے، وہ ہر انتخاب میں ایک مؤثر عنصر کی صورت میں موجود ہے۔[80]

چناں چہ حضرت عمر فاروقؓ کا واضح ارشاد ہے:

فمن بایع رجلا عن غیرمشورة من المسلمین فلا یبایع هو ولا الذی بایعه تغره ان یقتلا.[81]

(اگر مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کسی کو قابل بیعت یعنی سربراہ حکومت بنایا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا اور ایسے شخص کی پیروی نہ کی جائے گی اور جس کی بیعت بغیر مشورہ کے کی گئی تو قریب ہے کہ وہ اور اطاعت قبول کرنے والا قتل کر دیئے جائیں۔)

حضرت صدیق اکبرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انتخاب خلیفہ کے حوالے سے جو گفتگو کی تو سب نے یہی مفہوم اخذ کیا کہ اہل عرب اس اَمر (خلافت) کو قریش کے سوا کسی اور کے لیے پسند نہ کریں گے۔[82] اس قسم کی روایات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ عوام الناس کی رائے کو خلیفہ کے چناؤ میں اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کی رائے نظر انداز نہیں کی گئی حتیٰ کہ اس عمل میں خواتین اسلام کو بھی شریک کیا گیا۔ چناں چہ اس اَمر کا اظہار حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے وقت واضح طور پر یوں ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ جن کو عوام الناس سے رابطہ کر کے خلیفہ کے چناؤ کی ذمے داری سونپی گئی تھی انھوں نے اس

ذمے داری کو نبھانے کے لیے اس وسعت سے کام لیا کہ ابن کثیر کے الفاظ ہیں:

''حتّی خلص إلی النّساء المخدّرات فی حجابهنّ، و حتّی سأل الولدان فی المکاتیب، وحتّی سأل مَن یرد مِن الرّکبان والاعراب إلی المدینة فی مدّة ثلاثة أیّام بلیالیها''. (83)

(یہاں تک کہ وہ ان خواتین تک پہنچے جو گھروں میں پردہ نشین تھیں اور یہاں تک کہ انھوں نے مکاتب کے لڑکوں سے پوچھا اور یہاں تک کہ مدینہ آنے والے قافلوں اور دیہاتیوں سے دریافت کیا اور یہ عمل تین دن تین رات مسلسل جاری رہا۔)

حاصل کلام یہ کہ اسلام کے سیاسی نظام کے لیے قرآن و سنت اور دورِ خلفا سے اصولی رہنمائی واضح اور مکمل طور پر ملتی ہے۔ اب کوئی کوتاہ بیں ہی کہہ سکتا ہے کہ اسلامی علوم کے ورثہ اور دورِ اول کی روشنی میں اسلام کا سیاسی نظام قائم کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئے مسائل سامنے آئے ہوں جن کا حل ضروری سمجھا جا رہا ہو تو یہ معاملہ تو ہر شعبہ زندگی سے ہے اور اسلام کا نظریہ اجتہاد انھی مشکلات کے حل کے لیے ہے۔

البتہ یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک شوریٰ میں شرکت کرنے والوں کے چناؤ کے وقت اس بات کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو کہ وہ عوامی نمائندگی کی اہلیت (علم و عمل) کے معیار پر پورے اُترتے ہوں اور عوام کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کی مکمل آزادی ہو۔ چناں چہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُم (84) (بے وقوف لوگوں کو اپنا مال نہ دو۔)

یعنی جو عقل و دانش سے عاری ہیں اسے اس کا اپنا مال نہ دیا جائے کہ کہیں ضائع کر دے۔ تو جسے اپنے مال کے استعمال کا اختیار نہیں اسے دوسروں کی نمائندگی نہیں دی جا سکتی۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں:

لایصلح لسیاسة غیره من لایصلح لسیاسة نفسه. (85)

(جو شخص بذات خود سیاسی صلاحیت سے محروم ہے وہ دوسروں کی سیاسی بہتری کے لیے اپنی صلاحیت ظاہر نہیں کر سکتا۔)

اسی بنیاد پر نبی اکرمؐ نے ایسے نااہل نمائندہ افراد کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا:

''ان اللّٰه لایقبض العلم انتزاعا ینتزعه من العباد ولکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذالم یبق عالم اتخذ الناس رؤوسا جهالا فسئلو فافتوا بغیر علم فضلّوا و أضلّو''. (86)

(بے شک اللہ علم کو (بلا کسی واسطے کے) نہیں اٹھاتے بلکہ علما کو اٹھا لیتے ہیں (اس طرح علم اُٹھ جاتا ہے) یہاں تک کہ کوئی عالم باقی نہیں رہ جاتا تو لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں۔ پس وہ ان سے مسائل پوچھتے ہیں اور وہ بغیر علم کے ان کو فتویٰ دیتے ہیں۔ اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور ان کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔)

قاضی ابو یوسفؒ اہل نمائندہ جماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''إنّ اللّٰه بمنّه و رحمته جعل ولاة الامر خلفاء فی ارضهٖ وجعل لهم نوراً یضیئی للرعیة

ما أظلم عليهم، وضاء ة نور ولاة الامر اقامة الحدود وجور الرّاعی هلاک الرّعية''. (87)

(قومی ذمے داروں، اولی الامر کو اللہ تعالیٰ نور عطا کرتا ہے، قوم اس نور سے فیض یاب ہوتی ہے۔ اس نور کی روشنی یہ ہے کہ اللہ کی مقرر کردہ حد بندیاں صحیح طور سے قائم رکھی جائیں، حق داروں کو ان کے حقوق پورے ملیں۔ حاکم کا ظلم رعایا کو تباہ کر دیتا ہے۔ نا اہل اور غیر معتمد لوگوں کو کام پر لگانے سے رعایا برباد ہو جاتی ہے۔)

سیاسی نظام کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ قومی مسائل کو خوش اسلوبی سے حل کرے اور بہتر نتائج کے حصول کو ممکن بنائے۔ یہ مقاصد شوریٰ کے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یوں تو شوریٰ کے بے شمار مفید نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، البتہ اجمالاً ان فوائد کو مولانا حامد الانصاری نے اس طرح بیان کیا ہے۔

۱۔ تکوین قانون عامہ: عہد نبوی ﷺ اور خلافت راشدہؓ کے تعامل کی وجہ سے شوریٰ نے ہمیشہ کے واسطے اُمت کے لیے واجب التعمیل قانون کی صورت اختیار کر لی۔

۲۔ حصول رہنمائی: حکومت کو اعلیٰ رہنمائی سے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا ہے اور رشد و ہدایت حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ اجتہاد: شوریٰ سے مدبرانہ غور و فکر کی طرف رہنمائی ہوتی ہے اور درست نتائج تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے۔

۴۔ استصواب رائے عامہ: اس سے رائے عامہ اپنی اجتماعی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

۵۔ رائے عامہ کا اطمینان: شوریٰ کے فیصلہ سے رائے عامہ مطمئن ہو جاتی ہے۔ (88)

علامہ شوکانی شوریٰ کے متعلق اسلامی تعامل کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے ہیں۔ جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے۔ (89)

2.6۔ نمائندگی کی لازمی شرائط

گو کہ پارلیمنٹ (مجلسِ شوریٰ) کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات سے متعلق کئی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں' بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شوریٰ صرف علما اور فقہا پر مشتمل ہو گی، دوسرے لوگوں کو اس میں کوئی حیثیت حاصل نہ ہو گی۔ بعض لوگ اس کو بالکل مبہم اور غیر متعین چیز سمجھتے ہیں یعنی خلیفہ جن اشخاص سے چاہے مشورہ کر لے، کسی متعین پارلیمنٹ (شوریٰ) سے مشورہ کرنے کا وہ پابند نہیں ہے۔ (90)

مگر محقق علما نے قرآن و سنت کو سامنے رکھ کر ارکان مشورہ کی صفات بیان کی ہیں جس سے ابہام دور ہو جاتا ہے۔

عصرِ حاضر میں نمائندگان کا کام پارلیمنٹ میں اجتماعی مشاورت کے ذریعے عوامی مسائل کا حل نکالنا ہوتا ہے۔ علمائے اُمت نے ان کی خصوصیات اور اہلیت کے حوالے سے چند اُمور ذکر کیے ہیں۔ اس لیے جن لوگوں کو نمائندگی کے لیے قوم منتخب کرے ان میں چند اوصاف کی موجودگی اور چند اُمور کی پابندی لازمی ہے۔

دورِ حاضر میں نمائندگان حکومت کے اوصاف اور ان کی اہلیت کی مندرجہ ذیل شرائط ذکر کی گئی ہیں:

۱۔ عقل مند ہو ۲۔ عمر رسیدہ ہو ۳۔ صاحبِ رُشد و ہدایت ہو ۴۔ صاحب علم ہو ۵۔ عادل ہو

٦۔فاسق نہ ہو ٧۔اخلاقی جرم میں سزایافتہ نہ ہو ٨۔امین ہو ٩۔صادق ہو ١٠۔شجاع ہو

ذیل میں ہر ایک کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے۔

١۔عقل و بلوغ:۔عاقل و بالغ ہوں اور فرائض حکومت ادا کرنے کے قابل ہوں۔[91]

چوں کہ نمائندگان حکومت کو ملک وقوم کی ترقی کے لیے بہترین تدابیر اختیار کرنی ہوتی ہے اور عقل کے فقدان کے وقت ’’تدبیر‘‘ کا وجود ناممکن ہے۔[92] قرآن میں ہے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُم[93] (اور مت پکڑاؤ اپنے مال بے عقلوں کو۔)

یعنی مجنون اور نابالغ کو مال نہ دو کیوں کہ مجنون بے وقوف اور نابالغ بچے اپنے (ذاتی) معاملات میں تصرف کرنے سے شرعاً روک دیئے گئے ہیں اور ان کے کاموں کی انجام دہی کے لیے ولی مقرر کیا جاتا ہے۔جب ذاتی اُمور میں سفیہ اور بے عقل پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تو اجتماعی اُمور ایسے شخص کے حوالے کیسے کیے جاسکتے ہیں۔حضور ﷺ کی حدیث ہے:

[ان القلم رفع عن ثلاثة: عن المجنون حتی یفیق، و عن الصبی حتی یدرک، وعن النائم حتی یستیقظ][94]

(تین انسان غیر مکلّف ہیں: مجنون یہاں تک کے صحت یاب ہو جائے، بچہ یہاں تک کہ بالغ ہو جائے اور سونے والا یہاں تک کہ بیدار ہو جائے۔)

اس ضمن میں حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں:

’’وازاں جملہ آں ست کہ عاقل و بالغ باشد زیرا کہ مجنون وسفیہ وصبی مجورند از تصرفات جزئیہ خویش قال اللہ تعالیٰ:وَ لاَ تُؤتُوا السُّفهاء أموالکم چوں بر مال خودھا قادر نباشد براموال ورقاب مسلمین البتہ ایشاں صحیح نباشد وکارہائے مطلوب از استخلاف بالقطع ازیں جماعت سرانجام نمے شود۔‘‘[95]

(یہ کہ عاقل بالغ ہو‘اس لیے کہ مجنون‘سفیہ اور بچے کو اپنے ذاتی اُمور میں تصرفات سے روک دیا گیا ہے۔ اللہ کے ارشاد ’’اور نہ دو بیوقوفوں کو اپنا مال‘‘ کے بموجب۔جب وہ اپنے مال پر تصرف کی قدرت نہیں رکھتے تو ان کا مسلمانوں کی گردنوں کا مالک بننا صحیح نہ ہوگا اور خلافت کے کام اس جماعت سے سرزد نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک عمومی جسمانی صحت کا تعلق ہے تو قرآن نے حضرت طالوت کی اہلیت کے حوالے سے ’’بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ‘‘ کا ذکر کیا ہے۔[96]

٢۔عمر: پچیس سال سے کم عمر نہ ہوں۔

یہ امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ کی رائے ہے کیوں کہ ان کے ہاں سن رشد پچیس سال ہے۔[97] پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل نے چالیس سال کی عمر مقرر کی ہے۔[98]

امام عبدالرحمٰن شیزریؒ (م:۵۸۹ھ) کہتے ہیں:

أن یّکونوا من کبار الدّولة، ومشائخ الأعوان. لأنّ المشائخ قدحنکتھم التّجارب، و

عركتهم النّوائب، و قد شاهدوا من اختلاف الدُّوَل ما أوضع لعقولهم صواب الرّأى". [99]

(ایک صفت یہ ہے کہ ارکانِ شوریٰ ملک کے عمر رسیدہ اور بزرگ لوگ ہوں کیوں کہ عمر رسیدہ لوگ بصیرت، تجربہ اور پکی رائے کے مالک ہوتے ہیں اور دنیا کے گزرے ہوئے حادثات سے بہت کچھ سیکھ چکے ہوتے ہیں اور ان کے سامنے حکومتوں کی تبدیلیوں کی وجہ سے ان چیزوں اور اُمور کا مشاہدہ کیا ہوتا ہے جو ان کی عقلوں کے لیے درست رائے واضح کر دیتے ہیں۔)

دارالندوہ مکۃ المکرّمہ میں صرف معمر اہلِ مکہ شریک ہو سکتے تھے، جن کی عمر کم ازکم چالیس (40) سال کی ہو۔صرف حکمرانِ شہر قُصَیٰ کے بیٹوں کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ عمر کی اس شرط سے مستثنیٰ تھے۔غالبًا اس حق رائے کی عمر چہل سالگی ہی کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید نے:

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً [100]

(یہاں تک کہ جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا۔)

کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ قُصَیٰ کے زمانے کا ذکر تھا۔ بعد کے زمانوں میں نرمیاں برتی جاتی نظر آتی ہیں۔ چناں چہ بیان کیا جاتا ہے:

''ابوجہل کو تیس (30) سال کی عمر میں اس کی عمدہ رائے کے باعث دارالندوہ کے اجلاس میں شریک کیا جاتا تھا اور حکیم ابن حزام کو تو بیس یا پندرہ سال کی عمر میں یہ عزت حاصل ہوگئی تھی''۔ [101]

نبی اکرم ﷺ کے دور میں قضاۃ کے لیے زیادہ عمر کی شرط نہ تھی چناں چہ:

''حضرت علیؓ کو حضور ﷺ نے جب یمن کا قاضی بنایا تو آپ کی عمر بیس (20) سال تھی۔اسی طرح یحییٰ بن اکثمؒ کو جب قضا کی ذمے داری سونپی گئی تو اس وقت ان کی عمر اکیس (21) سال کی تھی۔عتاب بن اُسیدؓ کی بھی یہی عمر تھی جب کہ ان کو مکہ مکرمہ کا قاضی بنایا گیا۔حضرت معاذؓ کو اٹھارہ (18) سال کی عمر میں عامل بنایا گیا۔حضرت اسامہؓ کی عمر بیس (20) سال کی تھی جب اُن کو لشکر کا امیر بنایا گیا''۔ [102]

عہدِ نبوی ﷺ میں نمائندگی کے لیے مختلف عمروں کے لوگوں کا وجود ثابت کرتا ہے کہ حالات کے مطابق اس کی مدت مقرر کی جاسکتی ہے۔عہدِ نبوی ﷺ میں مختلف لوگوں کے لیے مختلف عمروں کا لحاظ صلاحیت اور ضرورت کے تحت تھا۔

دستورِ پاکستان میں نمائندگی کے لیے 25 سال کی عمر مقرر کی گئی ہے۔ چناں چہ دستورِ پاکستان کے آرٹیکل 62 میں درج ہے:

62. A person shall not be qualified to be elected or chosen as a member of Majlis-e-Shoora (Parliament) unless.

ترجمہ:۔کوئی بھی شخص مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کا ممبر منتخب ہونے کا اہل نہیں ہوگا جب تک ....

[(b) he is in the case of National Assembly, not less than twenty-five years of age.

ترجمہ:۔قومی اسمبلی کی صورت میں وہ امیدوار 25 سال سے کم عمر نہ ہو۔

۳۔ رشد و حکمت و فراست:۔ عام حالات میں درست رائے رکھتے ہوں تا کہ لوگوں کے رجحانات اور ضروریات کو ازخود محسوس کر سکے اور ایسا فکر زیرک ہو کہ جس کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرے تو وہ اس طرح درست ثابت ہو جیسے اس نے اسے اپنی آنکھوں اور کانوں سے دیکھا اور سنا ہے۔ (103)

قرآن حکیم نے حضرت سلیمانؑ کی کامیاب بادشاہت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَشَدَدْنَا مُلْكَهُ وَآتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ (104)

(اور قوت دی ہم نے سلیمانؑ کی سلطنت کو اور دی اس کو تدبیر۔)

اور حضرت یوسفؑ اپنے حسن تدبیر کے وصف کو اجاگر کرنے کے لیے بادشاہِ مصر کو کہتے ہیں:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ (105)

(یوسفؑ نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر نگران مقرر کر' میں نگہبان اور خوب جاننے والا ہوں۔)

حضرت طالوتؑ کی بادشاہت کے خلاف بنو اسرائیل کی رائے کے برعکس قرآن نے ان کا مقام اور بادشاہت کی اہلیت بیان کرتے ہوئے بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ کی نشان دہی کی ہے۔ (106)

نمائندگان قوم کے سربراہ یعنی امام اور حکمران (وزیراعظم/صدر) کے لیے سیاسی بصیرت، تدبر اور انتظامی صلاحیت کو اضافی اہمیت حاصل ہے۔ چناں چہ:

''امام احمد بن حنبلؒ جیسے امام الاتقیا کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر امیر کے انتخاب کا سوال درپیش ہو، ایک طرف ایک دین دار شخص ہو لیکن اسے انتظام کا تجربہ نہ ہو، دوسری طرف ایک ایسا مسلمان ہو جو زیادہ دین دار نہ ہو لیکن انتظام ملک کا تجربہ ہو تو ترجیح اس کم دین دار اور زیادہ تجربہ کار کو دی جائے گی۔ یہی رائے اس معاملہ میں ابن تیمیہ کی ہے''۔ (107)

حاصل یہ کہ حاکم ایسا مردم شناس اور روشن دماغ ہو کہ ایک جھلک دیکھ کر ہی آدمی کی اندرونی صلاحیتیں پہچان لے نیز وہ ایسی گہری نظر رکھتا ہو کہ فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ جائے اور اس کے نتائج سے باخبر ہو جائے۔ چناں چہ ماوردی کہتے ہیں:

''الرّأی و الحکمة المؤدیان إلٰی اختیار من هو للإمامة أصلح و بتدبیر المصالح أقوم و أعرف''. (108)

(ریاست عامہ کے اربابِ اختیار کے لیے قوتِ فیصلہ اور سیاسی بصیرت ضروری ہے تا کہ وہ اُمت کے لیے اصلح ہستی کا اور مصالح کے لحاظ سے ایک اچھے مدبر کا انتخاب کر سکیں۔)

راغب اصفہانی کہتے ہیں:

''لا یصلح لسیاسة غیره من لا یصلح لسیاسة نفسه''. (109)

(جو شخص بذات خود سیاسی صلاحیت سے محروم ہو، وہ دوسروں کی سیاسی بہتری کے لیے اپنی صلاحیت ظاہر نہیں کر سکتا۔)

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس امر کی وضاحت ایک عربی شاعر کے شعر سے کی ہے:

لا یصلح النّاس فوضی لا سراۃ لھم ولا سراۃ إذا جُھّالھم سادو (110)

(جو لوگ بے سر ہوں اور ان کا کوئی سردار نہ ہو تو ان میں کوئی صلاح و فلاح نہیں پیدا ہو سکتی اور جب کسی قوم کے جاہل سردار بن جائیں تو اس قوم کو بے سر سمجھنا چاہیے۔)

امام عبدالرحمٰن شیزری اس صفت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''الفطنۃ والذّکاء. لئلّا تشتبہ علیھم الأمور فتلتبس فلا یصح مع اشتباھھا عزم، و لا یتمّ مع التباسھا حزم''. (111)

(ایک صفت یہ ہے کہ وہ سمجھ دار اور زیرک ہوں تا کہ ان پر اُمور مشتبہ نہ ہوں اور خلط ملط نہ ہوں۔ بصورت دیگر وہ اپنے عزم و ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔)

۴۔علم:۔ تعلیم یافتہ ہوں اور قرآن و سنت کا بنیادی علم رکھتے ہوں۔

قرآن و سنت کے بنیادی علم سے مراد یہ ہے کہ نمائندگان قوم قرآنی ہدایت اور احکامات شرعیہ کا کم از کم اتنا علم رکھتے ہوں کہ حلال و حرام کی تمیز رکھتے ہوں اور قانون سازی کے دوران کسی قانون کی شرعی دلیل کے لیے اہلِ علم سے رجوع کر کے اس پر عمل کرنے کو لازم سمجھتے ہوں اور خود بھی اس کی افادیت کا درک پیدا کر سکیں۔ (112)

''اسلامی نظریاتی کونسل نے قوم کی نمائندگی کے لیے گریجویٹ یا مستند فاضل درس نظامی یا اس کے مساوی مسلمہ سند یافتہ کو معیار مقرر کیا ہے''۔ (113)

۵۔عدالت:۔ نمائندہ حکومت کے لیے عدل پسند ہونا ضروری ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں آپ کو انسانوں کا امام بنا رہا ہوں تو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذُریت کے بارے میں پوچھا، تو اللہ نے فرمایا:

قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (114) (فرمایا! میرا وعدہ ظالموں کو نہ پہنچے گا۔)

حضرت مجاہد قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''انّہ أراد ان الظّالم لا یکون إمامًا''. (115) (اللہ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ ظالم امام نہیں بن سکتا۔)

۶۔ فاسق نہ ہو:۔ یعنی اعلانیہ احکام اسلام سے انحراف میں مشہور نہ ہوں۔ (116)

اچھی شہرت اور رہنمایانہ صلاحیت رکھتے ہوں یعنی ذاتی مفاد پرستی سے دور ہوں اور عام حالات میں درست رائے رکھتے ہوں۔ (117) امام عبدالرحمٰن شیزریؒ نے اس صفت کو یوں بیان کیا ہے:

''أن لا یکونوا من أھل الأھواء فیخرجھم الھوی من الحقّ إلی الباطل، فإنّ الھوٰی خادع للألباب. و صارف عن الصّواب''. (118)

(ایک صفت یہ ہے کہ ارکان شوریٰ خواہشات نفسانی کی پیروی کرنے والے نہ ہوں ورنہ نفسانی خواہش ان کو حق

سے باطل کی طرف نکال دے گی۔ اس لیے کہ نفسانی خواہشات عقلوں کو دھوکہ دیتی ہیں اور درستی سے پھیر دیتی ہیں۔)

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''إنّ اخوف ماالخوف علیٰ اُمّتی الهوی، و طول الأمل، فامّا الهوی فیصدّ عن الحقّ. و امّا طول الأمل فینسی الآخرة''. (119)

(اپنی امت کے بارے میں جن چیزوں کا مجھے خوف ہے ان سب میں زیادہ ڈراؤنی دو چیزیں ہیں، نفسانی خواہش اور لمبی آرزوئیں۔ جہاں تک نفسانی خواہش کا تعلق ہے وہ حق بات سے روکتی ہے اور لمبی آرزو آخرت کو بھلا دیتی ہے۔)

حکومت پاکستان کی وفاقی کونسل کی رپورٹ میں انصاری کمیشن کی رپورٹ نے مزید اضافہ یہ کیا ہے کہ فرائض کا پابند اور کبائر سے مجتنب ہو۔ تاہم کمیشن نے غیر مسلم ارکان کے لیے صرف یہ شرط مقرر کی ہے کہ ان کی عام اخلاقی شہرت اچھی ہو۔ (120) البتہ وفاقی کونسل کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ کے یہ الفاظ ہیں ''غیر مسلم امیدوار اپنے مذہبی فرائض اور ذمے داریوں کو اپنے ایمان و مذہب کے مطابق ادا کرے گا۔'' (121)

۷۔ اخلاقی بلندی:۔ کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں سزا یافتہ نہ ہوں۔ (122)

۸۔ امانت:۔ عوامی نمائندگان کے لیے لازمی شرط یہ ہے کہ وہ امین ہوں، یعنی اپنے منصب اور عہدے کا ناجائز استعمال نہ کرتے ہوں۔ مثلاً ٹیکس چوری، وسائل قوم کا ذاتی مقاصد کے لیے استعمال وغیرہ

امام عبدالرحمٰن شیزری لکھتے ہیں:

''الأمانة. لئلاّیخونوا فیما ائتمنوا علیه، و لا یغشوا فیما استنصحوا فیه''. (123)

(ایک صفت امانت ہے یعنی وہ اس چیز میں خیانت نہ کریں، جس پر ان کو امین بنایا گیا ہے۔ اس چیز میں دھوکہ نہ دیں جس میں ان سے خیرخواہی کی توقع ہے۔)

حضرت یوسف علیہ السلام نے عقل و حکمت کے ساتھ اپنی دوسری خوبی امانت کے لحاظ کی فرمائی تھی۔ چناں چہ مذکورہ بالا آیت میں ''حفیظ'' کا لفظ اسی اَمر کی نشان دہی کرتا ہے۔

(۹) صداقت:۔ امام عبدالرحمٰن شیزری لکھتے ہیں:

''صدق اللّهجة. لیثق الملک بخبرهم فیما ینهونه إلیه، ویعمل برأیهم فیما أشارو ابه علیه''. (124)

(ایک صفت سچائی ہے کہ حکمران ان کے قول پر ان کاموں میں بھروسا کرے جن سے وہ منع کرتے ہیں اور ان کاموں میں ان کی رائے پر عمل کرے جن کا انھوں نے اس کو مشورہ دیا ہے۔)

قرآن حکیم عمومی ہدایت میں صدق کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے تو قومی ذمے داران کے لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ حضرت صفوان بن سلیمؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا:

''أیکون المؤمن کذّابا؟ قالؐ: ''لا''. (125) (کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا نہیں)۔

اس حدیث مبارکہ میں کذب کو ایمان کے منافی بیان کیا گیا ہے تو اہل الشوریٰ کے اوصاف تو عام لوگوں کے اَخلاق سے بلندتر ہونے چاہئیں۔ صدق کی شرط کے تقاضوں میں ہے کہ نمائندگان قوم جب قومی اُمور پر گفتگو کریں تو حقائق کی بنیاد پر گفتگو کریں پارٹی یا گروہی مفادات پر مبنی گفتگو نہ ہو۔ اگر نمائندگان جھوٹ کے عادی ہوں تو قوم کے عمومی اخلاق بگڑ جاتے ہیں، اسی اہمیت کی بنا پر صادق و امین ہونا متفقہ اور معتبر شرائط میں سے ہیں اور انھیں آئین پاکستان کے آرٹیکلز 63,62 [126] میں ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یہ آرٹیکلز عملاً نظر انداز ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے سیاسی نظام میں بہت سے نقائص نے جنم لیا ہے۔ اس لیے ان پر توجہ کی ضرورت ہے۔

۱۰۔ عمومی اخلاق :۔ شجاعت، حکمت و سخاوت اور عفو و درگزر کی صفات سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ عامۃ الناس کے فوائد و منافع کا پورا پورا خیال رکھنے والے ہوں۔ [127] کیوں کہ ''احسان دلوں میں محسن کی محبت پیدا کر دیتا ہے اور محبت کی زنجیریں لوہے کی زنجیروں سے زیادہ مضبوط ہوا کرتی ہیں۔ [128]

نمائندگان حکومت کے اوصاف کے حوالے سے ہر دور کے مفکرین نے متعدد شرائط ذکر کی ہیں جن میں سے اکثر مشترک ہیں اور چند مختلف۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان شرائط کے بیان میں فرق ہر دور کے حالات و واقعات اور پیش آمدہ مسائل کا اختلاف بنیادی سبب بنا لہٰذا آج اس مسئلہ پر جب کوئی مفکر رائے قائم کرے گا تو ماقبل مفکرین کی بیان کردہ شرائط کی روشنی ہی میں چند نئی ہوں گی اور چند کی تعبیر کا فرق ہوگا۔ مثلاً آج کل تیسری دنیا کے ممالک میں آلہ کار اور ایجنٹ حکمرانی کا تصور ہے اس روشنی میں نئی شرائط ذکر کی جاسکتی ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان شرائط کی تعبیر ضرور نئی ہے ورنہ یہ ''عدالت'' یا کسی اور بیان شدہ شرط کے ماتحت آتی ہے۔

2.7۔ مشاورت میں کثرت رائے کی اہمیت

اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ نمائندگان قوم کا چناؤ کیسے ہوگا؟ ان کو کون چُنے گا؟ بعثت نبویؐ کے آغاز میں دین حق کی حمایت کرنے والے بہت کم اور مخالفت کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ اس تحریک میں نمائندگان کا یہ اصول طے پایا کہ جو شخص صائب الرائے ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی لحاظ سے اعتماد یافتہ ہوگا اسے قوم کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا نیز اس تحریک کے مخالفین کی مخالفت کے بڑھنے سے ایسے لوگ اپنی قربانیوں کے ساتھ اَور زیادہ نمایاں اور قیادت کے اہل قرار پائے۔ یوں اولین دور کے اراکین شوریٰ اپنے فکر و عمل اور قربانی کی بنیاد پر خود بخود معاشرے میں ممتاز مقام حاصل کر گئے۔ ان کا انتخاب عام طریق انتخاب کی طرح یقیناً نہ ہوا لیکن وہ قوم کے اعتماد یافتہ تھے، البتہ ان میں کم یا زیادہ باصلاحیت اور مقبول ہونے کا فرق ضرور تھا جو ایک فطری بات ہے۔ مگر یہ دوسروں کے کلیتاً نامنظور ہونے کی علامت نہ تھا۔ ''الائمّۃ من قریش'' [129] والی حدیث نبی اکرم ﷺ کے اسی تجزیئے پر مبنی ہے۔ اس حدیث میں نبی ﷺ دراصل عربوں کی روایات اور پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہوئے تجزیہ فرماتے ہیں۔ قریش کی صلاحیت اور ان کی مسلّمہ اور مقبولِ عام قیادت کو دیکھ کر آپؐ نے یہ تجزیہ فرمایا کہ عرب تو قریش کی سرداری ہی قبول کریں گے۔ چناں چہ ایک اور حدیثِ نبویؐ اس کی وضاحت کرتی ہے:

''النّاس تبع لقریش فی ھذا لشأن مسلمھم تبع لمسلمھم و کافرھم تبع لکافرھم''. [130]

(لوگ اس معاملے (خلافت / حکومت) میں قریش کے تابع ہیں۔ مسلمان قریشی مسلمانوں کے اور کافر قریشی کافروں کے تابع ہیں۔)

یہ تو وہ نمائندگان تھے جو اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ میں سامنے آئے۔ اس کے بعد ہجرت کا عمل ہوا۔ اس سے بھی مزید لیڈر شپ ابھر کر سامنے آئی کہ ہر آزمائش اور مشکل گھڑی دوست دشمن کی پرکھ پیدا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ مدینہ منورہ میں وہ لوگ نمایاں حیثیت اختیار کرتے ہیں جو تین سال قبل از ہجرت اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بیعت عقبہ اولیٰ و ثانیہ کا سبب بنے۔ اور اس وقت نقبا کا تصور سامنے آیا۔ ۱۱ نبوی میں موسم حج میں قبیلہ خزرج کا یہ وفد حضور ﷺ کے پاس آ کر اسلام قبول کرتا ہے۔ اس وفد میں اسعد بن زرارۃ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ شامل تھے۔[131] اور یہ لوگ مدینہ منورہ کے بااثر لوگوں میں سے تھے۔ ان بااثر لوگوں کے ذریعے سے اوس اور خزرج کے قبیلوں کے گھروں میں اسلام پہنچ گیا' انھیں لوگوں کی دعوت پر حضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو سابقین اولین مہاجرین اور انصار کے سربرآوردہ لوگ نئی مدنی سوسائٹی کی سیاسی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اسی ریاستی نظام میں ان کے مشورے اور فعال کردار ان کے مقام و مرتبہ کو بڑھاتا ہے، گو کہ یہ سارا زمانہ اتفاقات اور لحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال پر مبنی تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کو اپنے اندرونی نظام پر توجہ دینے کی بجائے بیرونی مخالفت اور دشمنی پر زیادہ توجہ دینی پڑتی تھی۔ اس لیے وہ لوگ جو ان کٹھن لمحوں میں اپنی بہترین صلاحیتوں اور ہمتوں کو کام میں لاتے رہے' وہ لیڈر شپ کے لیے نمایاں ہوتے چلے گئے اور انھیں ہی نمائندگی کا حق دیا جانے لگا۔ اگر اس زمانے میں الیکشن ہوتے تو یقیناً یہی لوگ چنے جاتے۔

گویا گرد و پیش کا ماحول، حالات کا بہاؤ اور عملی تجربات دورِ خلفائے راشدین کے اراکین شوریٰ کی تائید کرتے ہیں۔ اس دور میں اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہ تھا اور اس دور کے حوالے سے یہی تجزیہ درست بنتا ہے کیوں کہ کسی بھی دور کے درست تجزیہ کے لیے ضروری ہے کہ اس دور کے سیاسی، سماجی اور عمرانی تصورات و معروفات کو پیش نظر رکھا جائے۔ کل کا معروف آج کا معروف نہیں ہو سکتا۔ اور آج کا معروف گزشتہ کل کے لیے معیار نہیں بن سکتا۔ اسی تناظر میں ''الائمّۃ من قریش'' والی حدیث کو دیکھنا چاہیے کہ آپ ﷺ نے اپنے بعد کے دور کے حوالے سے معروضی رہنمائی فرمائی ہے۔

مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں جو ریاستی ڈھانچہ کھڑا ہوا اسے اپنے آپ کو منوانے اور بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے آٹھ دس سال کا عرصہ لگا۔ اس دور میں دو قسم کی لیڈر شپ ابھر کر سامنے آئی۔ ایک وہ جس نے عسکری مہارت اور جرأت و بہادری سے نام اور اعتماد پیدا کیا، یہ لوگ اہلِ بدر کہلائے اور دوسری وہ جو تفقہ فی الدین اور اصابت رائے سے اپنے وجود کو منواتی ہے۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے بارے میں حضور ﷺ کے متعدد ارشادات موجود ہیں۔ یہ کسی کو گھٹانے یا بڑھانے کے لیے نہ تھا بلکہ حقیقی واقعات کے تناظر میں موقع بموقع آپ کے تبصرے تھے جو ہر باخبر کے ہاں پایۂ ثبوت کو پہنچے ہوئے تھے۔ یوں ان حضرات پر مشتمل پارلیمنٹ (مجلسِ شوریٰ) وجود میں آئی اور حضور ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے تک نمائندگان قوم کی ایک قابل ذکر تعداد سامنے آ گئی جنہوں نے فہم و بصیرت اور جرأت سے اپنی حیثیت کو منوایا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو بعد میں خلفائے راشدین کے مشیر اور اراکین حکومت قرار پائے۔ بعد میں بھی ان لوگوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور قربانیوں سے رعایا کا اعتماد برقرار رکھا۔

یہی لوگ خلفائے راشدین کے مقربین تھے؛ انھیں ہی اہل حل وعقد کہا جاتا تھا۔ چناں چہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد جب چند اصحاب نے حضرت علیؓ کو منصب امامت پر فائز ہونے کا مشورہ دیا تو آپؓ نے فرمایا:

''لیس ذٰلک إلیکم إنّما هو لأهل الشّوریٰ و أهل بدر، فمن رضی به أهل الشّوریٰ و أهل بدر فهو الخلیفة، فنجتمع و ننظرفی هٰذا الأمر''. (132)

(یہ معاملہ تمھارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے، جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ایک قول منسوب ہے کہ جب ان پر بعض لوگوں نے اعتماد کا اظہار کر کے بیعت لینے کا مطالبہ کیا، تو آپؓ نے فرمایا:

''فإن بیعتی لا تکون خفیه و لا تکون إلا عن رضا من المسلمین''. (133)

(میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہوسکتی اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں ہے۔)

حضرت علیؓ کا یہ قول واضح طور پر اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ انتخابِ امیر کا معاملہ فردِ واحد کی بجائے اہل الرائے کی ایک ایسی منتخب جماعت کے ذمے تھا جن پر عوام کو اعتماد تھا اور وہ ان کے چنیدہ لوگ تھے کہ ہر اہم امر میں وہ انھیں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ یہ **اهل الحلّ و العقد** رعایا کے معتمد ترین لوگ ہوتے تھے۔ اس تفصیل سے یہ معاملہ صاف ہو جاتا ہے کہ قرنِ اوّل میں خلفا کا تقرر محض **اهل الحلّ و العقد** کی نامزدگی کے ساتھ نہیں ہوتا رہا، بلکہ اس دور کی روایات کے مطابق انتخاب سے ہوتا تھا۔

یہ حقیقت اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ عہد اول میں نمائندگان قوم کا ادارہ نامزدگی کے ساتھ نہیں بلکہ ان کی اس حیثیت کے سبب وجود میں آیا جو ان کو سماج کی نظروں میں حاصل ہو چکا تھا۔ آج سماج کی پسندیدگی جانچنے کا معیار انتخابی طریقہ کار قرار پایا ہے اس لیے آج ان سہولتوں اور مواقع سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے جو موجودہ دور کے وسائل نے مہیا کر دیئے ہیں۔ دلائل شرعیہ اس استفادے سے مانع بھی نہیں ہیں اس لیے کہ اسلام میں کوئی لگا بندھا طریقہ متعین نہیں ہے۔ اس ضمن میں آج کل کے انتخابات کا طریقہ مفید ہے۔ اسی طرح میڈیا کے ذریعے جماعتوں کے منشورات کی تشہیر اور عوام میں ان کی مقبولیت اور استرداد کی نوعیت بآسانی معلوم ہو جاتی ہے۔

جب نمائندگان قوم کو حقیقی بنیادوں پر منتخب کرلیا جائے تو ان کی رائے بھی معتبر اور نافذ ہونی چاہیے نہ یہ کہ سطحی بیں، عام ذہن لوگوں یا میڈیا کی قوت سے ان کی رائے غیر مؤثر کردی جائے۔ اس بابت حضرت عمر فاروقؓ نے قاضی شُریح کو جو ہدایت لکھی وہ قابل توجہ ہے:

''فإن جائک مالیس فی کتاب الله، و لم یکن فیه سنّة من رسول ﷺ فانظر ما اجتمع علیه النّاس فخذ به''. (134)

(اگر تمھارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے جس کا ذکر نہ تو کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے بارے میں سنت

رسول اللہ میں کچھ ہو تو مسلمانوں نے جس بات پر اجماع کیا ہو اس کو دیکھو اور اس کو اختیار کرو۔)

یہاں یہ امر قابل حل ہے کہ کیا امیر (وزیراعظم) نمائندگان قوم (مجلس مشاورت) کے فیصلے کا پابند ہوگا؟ چند دلائل کی روشنی میں امیر کو مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کی پابندی کرنا ہوگی۔

اوّل: اس بابت علامہ ابوبکر جصاصؒ نے قطعی رائے دی ہے کہ شوریٰ سے مشاورت کا اصل مقصد ان کی اجتماعی بصیرت سے رہنمائی لے کر اجتماعی فیصلے کرنے ہوتے ہیں یہ عمل محض قیاس آرائی کے لیے نہ ہوگا۔

دوم: فرد کے مقابلہ میں ایسی جماعت جو چنیدہ ہو اور اسی مقصد کے لیے ان کا انتخاب ہوا ہو کی رائے زیادہ اہم ہے، کیوں کہ جماعت کی رائے فرد کے مقابلہ میں صحت و اصابت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے۔

سوم: حضور ﷺ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم سے اجتماعی مشاورت پر عمل درآمد ہی منقول ہے۔

قرآن حکیم نے ارکان شوریٰ کی دو خصوصیات بیان کی ہیں:

وَ اِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَ لَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ[135]

(اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اہل حل وعقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہل بصیرت ہیں، ٹھیک طور پر سمجھتے۔)

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں ارکان شوریٰ کی درجِ ذیل یہ دو خصوصیات ہیں:

1۔ مسلمانوں کے اولوالامر ان کے سربراہ کار ہوں گے۔

2۔ حکمران اہل استنباط ہوں گے۔ یعنی عقل وشعور، سیاسی معاملات کی پرکھ اور دینی اُمور کی سوجھ بوجھ رکھنے والے ہوں گے۔

صاحبِ کشاف نے اس آیت کی تفسیر:

''هم كبراء الصّحابة البصراء بالامور''.[136] (اکابر صحابہ اور اہل بصیرت سے کی ہے۔)

اسے ابن عباسؓ یوں بیان کرتے ہیں:

''كان القرّاء أصحاب مجالس عمر و مشاورته كهولاً كانوا أو شبانا''.[137]

(حضرت عمرؓ کی مجلسِ مشاورت میں ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان ہوں۔)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حوالے سے یہی بات:

''جمع رؤوس النّاس وخيارهم''.[138]

(کہ وہ بہترین لوگوں اور سربراہوں کو اہم اُمور میں مشاورت کے لیے جمع کیا کرتے تھے۔)

سے تعبیر کی گئی ہے۔

تاریخ اور سیرت میں متعین طور پر جن اصحاب شوریٰ کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ۔

ان ناموں پر غور کر کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ لوگ یا تو مختلف اجتماعیّتوں کے معتمد علیہ لیڈر تھے یا دینی و مذہبی بصیرت کے اعتبار سے کوئی نمایاں مقام مسلمانوں میں رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ مہاجرین کے متفقہ اور اعتماد یافتہ لیڈر تھے اور مذہبی بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ انصار کی دونوں پارٹیوں (اوس وخزرج) کے لیڈر تھے۔ حضرت علیؓ بنی ہاشم کے لیڈر تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ قرآنی علوم اور فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔(139)

یوں تو ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے مشاورت ضروری اور مفید ہوتی ہے، لیکن اجتماعی جدوجہد اور سیاسی کام کرنے والوں کے لیے اس کی اہمیت اور ضرورت کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ جماعت' عام عوام کا نام نہیں ہے بلکہ اہل الرائے اور مشن کے لیے وقف (Committed) لوگوں کا نام ہے۔ اس بنا پر جماعت میں مشاورت بہت مفید اور اہم ہو جاتی ہے تاکہ اجتماعی اُمور کی انجام دہی کے لیے تمام اہل الرائے کی عقل و بصیرت اور تجربات سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر امر کے تمام اہم پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں اور افرادِ جماعت میں ہر کام میں شراکت کا احساس اور اعتماد قائم ہوتا ہے جو فکر و عمل کی ہم آہنگی پیدا کرنے میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔

جن جماعتوں میں اُمورِ مہمہ کے لیے مشاورت کا ماحول نہیں ہوتا ان کے اراکین میں غلط فہمی، بے اعتمادی اور انتشار بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے۔ اندھی تقلید کو فروغ ملتا ہے، ایسی جماعتیں گروہ بندیوں اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں۔

3. خلفائے راشدین کے انتخاب میں عوامی رائے دہی (اصول اور اطلاق)

انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک بڑا حق اسلام نے یہ دیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد حکومت میں حصے دار ہیں۔ تمام افراد کے مشورہ سے حکومت ہونی چاہیے اور مشورہ اس لحاظ سے بامعنی ہونا چاہیے کہ راست مشورے کو قبول کر کے قانون سازی کی جائے اور اس پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔ اس ضمن میں قرآن وسنت اور دورِ خلفائے راشدین سے واضح رہنمائی ملتی ہے۔ چناں چہ قرآن حکیم میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (140)

(اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ایمان والوں اور ان لوگوں سے جو اچھے اعمال (قیام عدل و انصاف) کرتے ہیں کہ ہم انھیں زمین میں خلافت دیں گے۔)

اس آیت میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعض افراد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو خلافت دیں گے۔ حکومت ایک فرد، ایک خاندان یا ایک طبقے کی نہیں بلکہ پوری ملت کی ہوگی اور تمام افرادِ معاشرہ کے مشورہ سے وجود میں آئے گی۔ قرآن میں نبی ﷺ سے کہا گیا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (141) (اہم اُمور میں ان سے مشورہ کیا کیجیے۔)

یعنی یہ حکومت آپس کے مشورہ سے چلے گی۔ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاف الفاظ موجود ہیں:

''لا خلافة إلاَّ عن مشورة''. (142) (مشورہ کے بغیر خلافت کا تصور نہیں ہے۔)

یعنی کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر ان پر حکومت کرے۔ مسلمان راضی ہوں تو ان پر حکومت کی جا سکتی ہے راضی نہ ہوں تو نہیں کی جا سکتی۔ اس حکم کی رو سے اسلام ایک جمہوری اور شورائی حکومت کا اصول قائم کرتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں قبیلہ کا مفہوم افرادِ انسانی کا وہ مجموعہ تھا جو ایک خطہ پر قیام پذیر ہو۔ قبیلہ کا شیخ ان کا حاکم ہوتا تھا۔ وہ قبیلہ کے افراد کے نسب اور خون کے رشتے کی بنا پر شیرازہ بندی کرتا تھا اور افراد کی امداد سے قبیلہ کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہتا تھا۔ عربوں میں عہدِ حاضر کی حکومتوں میں سے کسی نوع کی حکومت کا وجود نہ تھا۔ نہ ان کے ہاں آج کی طرح عدالت کا نظام تھا، جہاں وہ جھگڑوں کا فیصلہ کرانے جاتے۔ نہ پولیس تھی جو امن و امان قائم رکھتی اور نہ فوج تھی جو بیرونی خطرات کی مدافعت کرتی۔ عرب کسی منظّم حکومت کے ماتحت نہ تھے اس لیے ٹیکس وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں مظلوم اپنا انتقام ظالم سے خود لے لیتا تھا۔ اس وقت قبیلہ کا فرض ہوتا تھا کہ وہ اس کی پشت پناہی کرے اگر ظالم اپنے ظلم کی تلافی کر دیتا تو پھر اس سے انتقام لینے کا حق نہ رہتا۔ اگر ظالم خود مظلوم کا کوئی عزیز رشتہ دار ہوتا تو وہ تنہا اسی سے بدلہ لے لیا کرتا، قبیلہ اس وقت دخل نہ دیتا۔ شرفا عرب اپنے ایک امیر کی قیادت میں لڑتے، اور اَمن کے زمانہ میں ان کی حیثیت ایک منظّم سوسائٹی یا معاشرہ کی ہوتی تھی۔ (143)

عربوں کی یہ اجتماعیت پسند سوچ ان کے آباؤ اجداد میں بعض اجتماعیت پسند رہنماؤں کی مرہونِ منت تھی۔ ان رہنماؤں میں ایک بڑا نام قصی بن کلاب کا ہے۔ یہی سوچ چلتے چلتے معاہدہ ''حلف الفضول'' کی شکل اختیار کرتی ہے۔ عربوں کے ہاں سیاسی اور سماجی ڈھانچے پر خاص قبائلی رنگ غالب تھا لیکن:

قبیلے میں جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ قبیلے کا شیخ خاندانوں کے سربرآوردہ اور ممتاز اشخاص کو اعلان جنگ کرنے، صلح کرنے اور قبیلے کے نظم و نسق کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے جمع کرتا اور اتفاق رائے سے جو طے ہو جاتا، اس کے مطابق عمل درآمد کیا جاتا۔ ان کی یہ مجلسِ شوریٰ پارلیمنٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ قبیلے کا کوئی لکھا ہوا دستورِ حکومت نہ تھا۔ صرف موروثی روایات پر ان کا نظام قائم تھا۔ اسی کو قانونی حکومت کی حیثیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے عہدِ جدید کا نظام سلطنت اس نظام سے مختلف تھا۔ موجودہ زمانہ میں معمولاً مملکت کے نظام کی بنیاد کسی نہ کسی دستورِ حکومت پر ہوتی ہے۔ (144)

اسلام نے عربوں کے مختلف طبقوں اور مختلف فرقوں کے افراد میں یک جہتی پیدا کر دی تھی اور اتحادِ قومی کو اتحادِ مذہبی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسلام نے آقا و غلام، امیر و غریب اور شریف و رذیل کے باطل امتیازات کو مٹا دیا تھا اور عربوں کی منتشر قوت ایک ایسی ''مستحکم عمارت'' کی شکل میں مجتمع کر دی تھی جو اینٹوں کے باہمی سہارے پر قائم ہوتی ہے۔ خدا نے اس شیرازہ بندی کو اپنا بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ (145) اس حقیقت کو قرآن نے یوں اُجاگر کیا ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ (146)

(اے پیغمبر! خدا ہی کی ذات ہے جس نے اپنی مددگاری سے مومنوں کی جماعت سے تیری تائید کی اور وہی ہے جس

نے مومنوں کے دلوں میں باہمی الفت پیدا کر دی۔ اگر تو وہ سب کچھ خرچ کر ڈالتا جو روئے زمین میں ہے جب بھی ان کے دلوں کو باہمی الفت سے نہ جوڑ سکتا لیکن یہ اللہ ہی ہے جس نے باہمی الفت پیدا کر دی۔)

عربوں کی شیرازہ بندی میں اسلام کی مساوات اور جمہوری نظام نے بہت سہارا دیا تھا اور اس کی وجہ سے عربوں کو آپ ﷺ نے ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا۔ اسلامی جمہوریت نے ان کے قبائلی امتیازات کا جنازہ دفنا دیا تھا جو ان کی شیرازہ بندی میں ایک وسیع خلیج کی طرح حائل تھا۔ قرآن نے ان باطل امتیازات کو ان الفاظ میں لغو قرار دیا۔ [147]

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ [148]

(ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ خاندان اور قبیلے محض امتیاز کے لیے بنا دیئے ورنہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے۔)

حضور ﷺ نے جس سماج کی تشکیل کی ہے وہ مذہبی اُمور تک محدود نہ تھی۔ وہ سیاسی، سماجی، اقتصادی اور عمرانی اُمور کو لیے ہوئے تھی۔ آپؐ سماجی جھگڑوں کو نمٹاتے، بیت المال قائم کیا اور اس کے ثمرات عام انسان تک پہنچائے، فوج تشکیل دے کر اس کی قیادت کی۔ آپؐ ایک مذہبی رہنما کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی رہنما بھی تھے اور اجتماعی اُمور کو مشاورت سے طے کرتے۔

اسی لیے قرآن نے اطاعت اولی الامر کا حکم دیا ہے۔ اولی الامر جمع کا صیغہ ہے جس سے اجتماعی حکومت کا تصور اُجاگر ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو آثار بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ آپؓ فرماتے ہیں:

''فمن بايع رجلا عن غير مشورة من المسلمين فلا يبايع هو ولا الّذى بايعه تغره أن يقتلا''. [149]

(جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص سے بیعت کر لی تو اس کو ایسا نہ کرنا چاہیے۔ نہ (دوسرے کو) بیعت لینا چاہیے۔ خوف ہے کہ لوگ دونوں کو قتل کر دیں گے۔)

یہی مضمون ایک روایت میں یوں ہے:

''من بايع عن غيرمشورة المسلمين و انّه لا بيعة له''. [150]

(جو عام مسلمانوں کے شوریٰ کے بغیر کسی شخص کو امیر قرار دے کر بیعت کرے گا تو یہ بیعت کالعدم ہو گی۔)

دوسری جگہ ہے:

''من أتاكم و امركم جميع علىٰ رجل واحد يريد ان يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه''. [151]

(جو شخص تمھارے پاس اس حالت میں آئے کہ تم ایک شخص پر مجتمع ہو چکے ہو اور وہ تم میں پھوٹ ڈالنا چاہے یا تمھاری جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا چاہے تو اس کو قتل کر دو۔)

نمائندگان قوم اور سربراہ مملکت کا چناؤ عوام کی مرضی سے ہو، یہ تاریخ اسلام میں اصول کی حیثیت سے مسلّم رہا ہے۔ اسی لیے علمائے اُمت نے اسے بطور اصول کے بیان کیا ہے۔ ابویعلی (م: ۴۵۸ھ) نے امام احمدؒ کا قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے:

قال احمد فی روایة اسحق بن ابراهیم: ''الإمام الّذی یجتمع علیه کلّهم یقال: الإمام. (152)

(امام وہ شخص کہلاتا ہے کہ جس پر اکثریت متفق ہو جائے۔)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انعقاد خلافت کے لیے اس قدر آدمیوں کی بیعت ضروری ہے کہ ان کی بیعت سے مسلمانوں کی ایک قابل ذکر جماعت بن جائے جس پر اجتماعی احکام جاری ہوسکیں اور جن کی وجہ سے وہ قوت حاصل ہوسکتی ہو جو اُمور خلافت کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے۔

3.1۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب

رحلتِ نبویؐ کے بعد مدینہ منورہ کے ماحول میں غم واندوہ کی گہری چھاپ تھی اور سکوتِ مرگ طاری تھا۔ اس افسردگی کے ماحول میں انتخاب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مجمع سے سوال کیا۔ کیا آپ میں سے کوئی جانتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے کسی شخص کو حکومت کے لیے نامزد کیا ہے؟ سب نے جواباً کہا! ''نہیں'' اس سوال و جواب اور بحث سے اُمت کو معلوم ہو گیا کہ آں حضرت ﷺ نے اس معاملہ کو اُمت کی رائے عامہ کے سپرد کر دیا۔ تب یہ معاملہ شوریٰ میں گیا جہاں مختلف ناموں پر غور ہوا۔

گویا حضور ﷺ کے بعد اصل اختیار شوریٰ کا تھا' تا آنکہ بحث مباحثہ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منتخب کر لیا۔ (153)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انتخابِ خلیفہ کے حوالے سے جو گفتگو کی تو سب نے یہی مفہوم اخذ کیا کہ اہلِ عرب اس امر (خلافت) کو قریش کے سوا کسی اور کے لیے پسند نہ کریں گے۔ (154) اس قسم کی روایات اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ عوام الناس کی رائے کو خلیفہ کے چناؤ میں اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور ان کی رائے نظر انداز نہیں کی گئی۔ اس بات کی مزید تائید حضرت عمر فاروقؓ کے قول سے ہوتی ہے۔ چناں چہ آپؓ فرماتے ہیں:

''فمن بایع رجلا عن غیر مشورة من المسلمین فلا یبایع هو و لا الّذی بایعه تغره ان یقتلا''. (155)

(جس شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص سے بیعت کر لی تو دونوں نے نامناسب کام کیا اس لیے خوف ہے کہ دونوں قتل کر دیئے جائیں۔)

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ خلافت کو مستحکم اور منظّم کرنے کے لیے جمہور کی قبولیت کو ضروری قرار دیتے ہوئے ایسی خلافت کو خلافت منظّم اور جس کو جمہور کی تائید حاصل نہ ہو، اسے خلافت غیر منظّم کہتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

''فاما گاہی سعادت اہل زمان اقتضامی نماید کہ جماہیر اہل اسلام بر قبول خلافت راشدہ اتفاق نمایند و بجان و دل حکومت خلیفہ راشد اختیار کنند امر خلافت ربانی انتظام میگردد و مقدمہ سیاست ایمانی بخوبی سرانجام می پذیرد وآں را خلافت منتظمہ میگویند و در بعضی احیان بحسب تقدیر ربانی و قضای آسمانی ہر چند خلیفہ راشد بر روی کار می آید و در باب اقامت خلافت سعی بلیغ بجامی آرد فاما اتفاق جماہیر مسلمین صورت نہ بندد و انتظام کافہ امت وست ندہد پس دریں صورت اگرچہ خلیفہ راشد موجود است و در اقامت خلافت ساعی فاما انتظام خلافت بوقوع نیامدہ آں را خلافت غیر

منتظمہ میگویند''۔ (156)

(کبھی جمہور اہلِ اسلام خلیفۂ راشد کے قبول پر اتفاق کر لیتے ہیں، اور دل و جان سے خلیفۂ راشد کی حکومت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو ایسی خلافت کو خلافتِ منظّم کہتے ہیں۔ بعض اوقات تقدیرِ ربانی اور قضائے آسمانی کے بموجب خلیفۂ راشد اقامتِ خلافت کے لیے بہت کوشش کرتا ہے لیکن جمہور مسلمین کا اتفاق صورت پذیر نہیں ہوتا اور اُمت کا انتظام ظہورِ عمل میں نہیں آتا اسے خلافتِ غیر منتظمہ کہتے ہیں۔

3.2۔ شورائی طریقہ

انتخاب خلیفہ (بذریعہ اتفاق اہل حل وعقد) کا یہ طریقہ اسلام کے شورائی نظام ہی کی ایک صورت ہے جس میں اہلیت اور عامۃ المسلمین کی پسند کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ خلفائے راشدین کے انتخاب کی تمام صورتوں میں مختلف انداز سے ہمیں یہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے انتخاب کا معاملہ ہے اس میں صحابہؓ کا اجتماع ہوا تھا اور تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر نقد و تبصرہ بھی ہوا تھا کہ اس انتخاب میں صحابہؓ کی اکثریت جو اس وقت مدینہ میں تھی، شریک تھی۔ اگر یہاں یہ سوال اٹھایا جائے کہ اس مشاورت کے لیے اعلان نہ کیا گیا تھا تو یہ نقطہ اس لیے اہم نہیں کہ رحلتِ نبوی ﷺ کے بعد یہ معاملہ ہر شخص کے ذہن میں تھا کہ مستقبل کی خلافت بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے سوچنے والے ذہن از خود جمع ہوئے اس کے لیے باقاعدہ اعلان سانحہ رحلت کی اطلاع تھی۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ انصار تھے یا مہاجرین۔ یہ تفریق اس لیے بے سود ہے کہ اس وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں جو صحابہ بھی موجود تھے انھوں نے انصار و مہاجرین میں سے غیر موجود حضرات کے موقف کو بھرپور انداز میں پیش کیا تھا اور اس پر بحث مباحثہ کے بعد یہ انتخاب وقوع پذیر ہوا تھا۔ دنیا کا کون سا نظام انتخاب ہے کہ جس میں موجود لوگوں کے ہوتے ہوئے مطلوبہ اکثریت پائے جانے کے بعد غیر موجود لوگوں کو بنیاد بنا کر انتخاب کالعدم قرار دیا جاتا ہو بلکہ اس کے برعکس موجود لوگوں کی اکثریت کی رائے معتبر اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ کیوں کہ دنیا میں فیصلے موجود لوگوں کی اکثریت سے ہونے کی رسم پائی جاتی ہے۔

اس بنا پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کہا ہے:

''طریق اول بیعت اہل حل وعقد است از علماء و قضات و امراء وجوہ ناس کہ حضور ایشاں متیسر شود و اتفاق اہل حل وعقد جمیع بلادِ اسلام شرط نیست زیرا کہ آں ممتنع است''۔ (157)

(کہ انعقاد خلافت کے لیے صرف انھی اہل حل وعقد کا بیعت کر لینا کافی ہے جو کہ باآسانی موجود ہو سکیں تمام بلاد اسلامیہ کے اہل حل وعقد کا متفق ہونا شرط نہیں کیوں کہ یہ محال ہے۔)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اس عبارت میں ''از علماء و قضات و امراء وجوہ ناس'' کے الفاظ اس مشاورت کا دائرہ کار واضح کر رہے ہیں کہ اس وقت جتنے بھی سربرآوردہ اور صاحب الرائے اصحاب، مدینہ منورہ میں موجود تھے وہ اس مشاورت میں شریک ہوئے اور انھوں نے حضور ﷺ کے جانشین کا اجتماعی فیصلہ کیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا انعقاد اس دور کے تمدن کے مطابق جمہوری طرز سے ہوا، اس وقت وہ

تمام صحابہؓ جو اپنے اوصاف و کردار کی وجہ سے مسلمانوں کے نزدیک خلافت کے لیے موزوں امیدوار ہو سکتے تھے' وہ سب اسلامی مملکت کے مرکز مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے آپؓ کو خلیفہ تسلیم کر لیا تھا اور دیگر علاقوں نے بھی رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ آپؓ نے خلافت کا مطالبہ کیا تھا، نہ کہ عسکری قوت سے خلافت پر قابض ہوئے تھے بلکہ تمام اُمت بلا اکراہ و اجبار آپ کی خلافت پر متفق ہوئی۔

اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں صرف حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی نہیں بلکہ تین اور نام بھی انتخاب کے لیے پیش کیے گئے۔ چناں چہ انصار نے حضرت سعد بن عبادہؓ [158] کے بارے میں تحریک پیش کی تھی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ابو عبیدہؓ اور حضرت عمرؓ کے نام پیش کیے تھے لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی رائے دینے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ اس کے بعد عام مسلمانوں نے بھی ان کی بیعت کر لی تھی۔ اس بیعت کے بعد نہ سقیفہ اور نہ حضرت ابوبکرؓ کے پورے دور خلافت میں کوئی واضح اور مضبوط اختلاف سامنے آیا۔[159]

3.3۔ نظام حکومت میں عوام کی نمائندگی

تمام خلفائے راشدین کا یہ طرز عمل رہا کہ جب بھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو اہل الرائے کو جمع کر کے ان کی مشاورت سے فیصلہ کرتے اور اس امر پر ہمیشہ کاربند رہے کہ عوام اور ان کے اہل الرائے کی رائے کو سامنے رکھ کر حکمت عملی بنائی اور اپنائی جائے۔ چناں چہ اس کی طرح جانشینِ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شروع ہی میں ڈال دی۔ جب آپؓ کی خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو آپؓ نے جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا: تو اس کے چند الفاظ یہ تھے:

> ''ان تشرکو فی أمانتی فیما حملت من أمورکم فإنّی واحد کأحدکم و أنتم الیوم تقرون بالحقّ خالفنی من خالفنی و وافقنی من وافقنی ولست أرید أن تتبّعوا هٰذا الّذی هو رائی''.[160]

> (وہ ذمے داری جو میں نے تمھارے معاملات چلانے کے لیے سنبھالی ہے تم اس میں مکمل طور پر میرے ساتھ شریک ہو۔ تم میں سے ہر ایک فرد کی طرح میں بھی ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہوں۔ (گویا میرا ووٹ دوسرے کسی ایک فرد کے ووٹ کی طرح ہے) آج کے دور میں تمھاری جماعت حق پر قائم ہے گویا حقائق کو سامنے رکھ کر آج تم نے ہی صحیح فیصلہ کرنا ہے۔ جو میری رائے کی مخالفت کرنا چاہتا ہے بخوشی میری مخالفت کرے اور جو میری رائے سے اتفاق کرنا چاہے، بغیر کسی جبر و اکراہ کے کرے۔ میں قطعاً یہ نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری رائے کو ضرور تسلیم کرو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو۔)

3.4۔ حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب اور عوامی نمائندگی

حضرت عمر فاروقؓ کا انتخاب تین مرحلوں سے گزرا۔

i۔ نامزدگی بصورت تجویز ii۔ شوریٰ iii۔ استصواب رائے عامہ

i۔ نامزدگی: حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کو نامزد کیا۔ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ اس نامزدگی پر بحث ہوئی اور اُمت

دو آرا میں منقسم ہو گئی۔

ii۔ شوریٰ: حضرت صدیق اکبرؓ نے شوریٰ سے رائے طلب کی جس میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عثمان بن عفانؓ، علیؓ المرتضٰی شامل تھے۔ دوران بحث دو(2) آرا سامنے آئیں۔ ایک رائے کے مطابق لوگوں نے حمایت کی اور ایک رائے یہ تھی کہ آپؓ ہماری اُمت کی زمام ایک سخت گیر انسان کو دینا چاہتے ہیں۔ آپ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ اس ضمن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے الفاظ یہ تھے:

''هو واللّٰه أفضل من رأيک فيه من رجل ولكن فيه غلظته''. (161)

''حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا! میں کہوں گا کہ میں نے منصب امارت کے لیے تیرے انسانوں میں سے بہترین آدمی کو مسلمانوں کا امیر بنایا ہے۔ مجھے یقین ہے امیر ہونے کے بعد ان کی سخت گیری ختم ہو جائے گی کیوں کہ وہ اس لیے سخت ہیں کہ وہ مجھے نرم دیکھتے ہیں۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے تبصرہ کیا تھا کہ حضرت عمرؓ کا باطن ظاہر سے اچھا ہے''۔

iii۔ استصواب رائے عامہ: شوریٰ سے مشورہ کے بعد رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے حضرت صدیق اکبرؓ نے عوام کے سامنے نام پیش کیے اور پوچھا کیا آپ لوگ ان کے حق میں ووٹ دیتے ہیں؟ ابن اثیر کہتے ہیں:

''و استشار المسلمين في ذلک (أمر عمرؓ) فمنهم من رضي و منهم من كره ...... و شاور من المهاجرين و الأنصار''. (162)

(آپؓ نے حضرت عمرؓ کے معاملے پر مسلمانوں سے مشورہ کیا بعض ان میں سے راضی تھے اور بعض نے اس رائے کو ناپسند کیا اور آپؓ نے مہاجرین وانصار سے مشاورت کی۔)

تجویز پر غور کرنے کے بعد سب نے کہا! ہم سب کی مرضی عامہ اس تجویز کو منظور کرتی ہے اور حضرت علی المرتضٰیؓ نے بلند آواز سے کہا! ہم عمرؓ بن خطاب کے علاوہ کسی دوسرے کا نام منظور نہیں کر سکتے۔

یوں ان مراحل سے گزر کر انتخابِ عمرؓ ہوا اور یہ اس وقت ہوا جب موجودہ مروّجہ انتخاب کا طریقہ دنیا میں رائج نہ تھا۔

حضرت عمرؓ کا انتخاب جمہوری روایات کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ نامزدگی سے ہی تو انتخاب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ مشاورت یا انتخاب سے اس کی توثیق یا استرداد ہوتا ہے۔ یہی جمہوری طریقہ کار ہے۔ کیوں کہ حضرت عمرؓ کو نامزد کرتے وقت حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ذاتی رائے کو عوام پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اکابر صحابہؓ کے مشورہ اور تائید کو کافی سمجھا تھا بلکہ عام لوگوں کے سامنے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا تھا اور ان سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اس بارے میں خلیفۂ وقت کی رائے سے متفق ہیں؟ تو سب نے بلا جبر و اکراہ اپنی رضا مندی اور اطاعت کا یقین دلایا اور اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔ چناں چہ اس ضمن میں روایت ہے:

قال ابن الجوزي: عن الحسن بن ابي الحسن رضي اللّٰه عنه قال: لمّا ثقل أبوبكر رضي اللّٰه تعالٰى عليه و استبان له من نفسه. جمع النّاس فقال: انّه قد نزل بي ماترون و لا أظنّني إلاّ لموتي، و قد أطلق اللّٰه أيمانكم من بيعتي، وحلّ عنكم عقدتي، ورد عليكم أمركم،

فامروا علیکم من أحببتم فانکم ان امرتم علیکم فی حیاة منی کان أجدر ألا تختلفوا بعدی' فقالو: ارأ لنا یا خلیفة رسول اللّٰه! قال: فلعلّکم تختلفون؟ قالوا: لا' قال فعلیکم عهد اللّٰه علٰی الرّضا؟ قالوا: نعم ! قال: فأمهلونی أنظر للّٰه ولدینه ولعباده ، فأرسل أبوبکر إلٰی عثمان بن عفّان رضی اللّٰه عنه فقال: أشر علی برجل. و اللّٰه انّک عندی لها لأهل و موضع فقال. أی عثمان: عمر فقال: اکتب فکتب حتّٰی انتهٰی إلٰی الإسم فغشی علیه ثم أفاق فقال: اکتب عمر''. (163)

(حسن بن ابوالحسنؒ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ پر مرگ الموت کی حالت طاری ہوئی تو انھوں نے صحابہ کرامؓ کو اکٹھا کیا اور اپنی حالت سے آگاہ کرنے کے بعد کہا کہ میں اپنی موت کا وقت قریب پاتا ہوں، اللہ نے تمھیں میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے تم لوگ اس معاملے میں خودمختار ہو جس کو چاہو اپنا امیر چن لو لیکن بہتر یہ ہے کہ تم میری زندگی میں اپنا امیر منتخب کر لو، تاکہ میرے بعد اس معاملے میں تمھارے اندر جھگڑا نہ ہو' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا آپ اپنی رائے دیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے سوال کیا کہ پھر تم اختلاف اور جھگڑا تو نہ کرو گے تو انھوں نے کہا کہ نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ کیا تم اللہ کی تقدیر پر راضی ہو جاؤ گے؟ تو انھوں نے کہا ہاں تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا مجھے غور و فکر کا موقع دو تاکہ میں دیکھوں کہ اللہ اس کے دین اور اس کے بندوں کے لیے کون زیادہ مفید ہے بعد میں حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عثمانؓ کو بلا بھیجا اور ان سے پوچھا کہ اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو اللہ کی قسم آپ اس معاملہ کو سمجھتے ہو تو عثمانؓ نے کہا کہ عمرؓ بہتر ہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ لکھو تو انھوں نے لکھنا شروع کیا جب وہ نام تک پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ پر غشی طاری ہوگئی جب ہوش آیا تو آپؓ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کا نام لکھو۔)

اس روایت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انتخاب خلافت کے تمام معاملات لوگوں کے سپرد کر دیئے تھے اور وہ لوگ جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے رجوع کیا اور ان کو تمام اختیارات سونپ دیئے، آج کی سیاسی اصطلاح میں اسے Mandate کہتے ہیں۔

3.5۔ دورِ فاروقی میں عوامی رائے کی اہمیت

منصب اقتدار پر فائز ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف علاقوں میں گورنرز کی تعیناتی میں وہاں کے لوگوں کی رائے کو ترجیح دی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کی رائے مخالف پائی' تو اسے وہاں تعینات نہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر علاقہ کے لوگوں سے ان کے نمائندگان کے نام طلب کیے اور ان کی رائے کے مطابق گورنرز کا تقرر کیا۔ قاضی ابو یوسف لکھتے ہیں:

''کتب عمر بن الخطّاب إلٰی أهل الکوفه یبعثوا إلیه رجلا من اَخیَرُکُمْ و أصلحهم و إلی أهل البصرة کذٰلک و إلٰی أهل الشّام کذٰلک قال فبعث إلیه أهل الکوفة عثمان بن فرقد و بعث إلیه أهل الشّام معن بن یزید وبعث إلیه أهل البصرة الحجّاج بن علاط کلّهم مسلمون. قال: ''فاستعمل کلّ واحد منهم علٰی خراج أرضه''. (164)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل کوفہ کو لکھ بھیجا کہ وہ اپنی پسند سے اپنے بہترین اور موزوں ترین افراد میں

سے کسی کو آپ کے پاس بھیج دیں، یہی تقاضا اہل بصرہ اور اہل شام سے کیا گیا، تو اہل کوفہ نے عثمان بن فرقد اور اہل شام نے معن بن یزید اور اہل بصرہ نے حجاج بن علاط کو منتخب کر کے آپ کے پاس بھیجا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ہر ایک کو انھی کے علاقے میں عُمّال اور حاکم مقرر فرما دیا۔)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عوام کی مرضی کے خلاف کوئی ذمے دار (نمائندہ قوم) مقرر نہ فرماتے تھے۔ اس حوالے سے ذیل میں ایک اہم واقعہ ذکر کیا جاتا ہے کہ عرفجہ بن ہرثمہ کو قبیلہ بجیلہ پر حاکم بنا کر بھیجا گیا مگر انھوں نے ناپسند کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تبدیلی کرنی پڑی۔ واقعہ یہ ہے:

''اعفنا من عرفجه فقال (عمر) لا اعفيكم من اقدمكم هجرة و اسلاماً و اعظمكم بلاأً و احسانا قالوا استعمل علينا نزيعاً فينا فأرسل عمر إلٰى عرفجه فقال ان هؤلآء استعفونى منک و زعموا انّک لست منهم فما عندک؟ قال: صدقوا و ما يسرنى انّى منهم انا امرأ من الازد. فقال عمر لا يضرک فاعتزلهم اِزْكِرِهُوُکَ ثم امره على الازد''. (165)

(جب قبیلہ بجیلہ نے عرفجہؓ کی بابت شکایت کی اور کہا کہ ہمیں عرفجہؓ کے بارے میں معاف کیجیے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جو آپ سے ہجرت اور اسلام میں مقدم اور آزمائش اور احسان میں بہتر ہو اس کو میں آپ سے ہٹا نہیں سکتا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہم پر ہم میں سے ہی کوئی آدمی حاکم مقرر فرما دیجیے اور ہم پر اجنبی کو حاکم مقرر نہ فرمائیے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عرفجہؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ یہ لوگ تیرے بارے میں مجھ سے رستگاری کے طالب ہیں، یہ کہتے ہیں کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں تو آپ کی کیا رائے ہے تو عرفجہؓ نے کہا وہ سچ کہتے ہیں۔ مجھے اس بات میں کوئی خوشی نہیں کہ میں ان کے قبیلے میں شمار ہو جاؤں۔ میں تو ازد قبیلہ کا ہوں۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا تجھے کوئی نقصان نہ ہوگا لہٰذا تو ان کو چھوڑ دے جب کہ وہ تجھے نہیں چاہتے، پھر انھیں ازدیوں پر حاکم مقرر فرمایا۔)

حضرت عمر فاروقؓ نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ اگر کسی قبیلے کا سردار حضور ﷺ کے دور میں کہیں تعینات کیا گیا اور عوام ان سے مطمئن تھے تو آپؓ نے کوئی تبدیلی نہیں کی لہٰذا:

حضرت عمر فاروقؓ نے حضور ﷺ کے دور میں ایمان لانے والے قبائل کے سرداروں کو ان کی سرداری پر بدستور فائز رکھا۔ چناں چہ عدی بن حاتم طائی کو قبیلہ بنی طے پر، شبر بن سفیان کعبی کو خزاعہ کی شاخ بنی کعب پر، اباس بن قیس اسدی کو بنی اسد پر، سعود بن رجیل اشجعی کو بنی اشجع پر، عامر بن مالک کو بنی عامر پر، ضحاک بن سفیان کلابی کو بنی کلاب پر بہ حیثیت شیخ اور سردار کے بحال رکھا۔ (166)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم اور طرز عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر علاقہ کے نمائندگان کی تقرری کے احکامات باوجود اس کے کہ وہ سب مرکزی حکومت کی طرف سے جاری ہوتے تھے مگر ان کی تقرری سے پہلے ان کے بارے میں اسی علاقے کے مقامی لوگوں کی رائے معلوم کی جاتی تھی اور ان لوگوں ہی کی تائید سے انھیں مقامی لوگوں ہی میں سے ذمے دار لوگ منتخب کر کے مختلف عہدوں پر مقرر کیے جاتے اور انھیں اقتدار میں شریک کیا جاتا تھا۔ گویا عہد خلافت میں نہ صرف مرکزی نظام میں عوام کی

نمائندگی ملحوظ رہی بلکہ ذیلی نظام (صوبہ جات، علاقہ جات وغیرہ) میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا۔

حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں ہر شخص کو اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنی رائے کے اعلانیہ اظہار کا موقع دیا جاتا تھا۔ حاکم کے اختیارات محدود تھے، اور ان کے طریق عمل پر ہر شخص کو نکتہ چینی کا حق حاصل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حکام پر نکتہ چینی کرنے کی ایسی عام آزادی دی تھی کہ معمولی سے معمولی آدمی کو خود خلیفہ وقت پر اعتراض کرنے میں کوئی باک نہیں تھا۔

عوام اور نمائندگان قوم کی رائے کا احترام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا اساسی ستون رہا ہے۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح کو لکھا تھا:

فإن جاءك ماليس فى كتاب الله و لم يكن فيه سنّته من رسول الله فانظر ما اجتمع عليه النّاس فخذ به''. (167)

(اگر تمھارے سامنے ایسا معاملہ آجائے جس کا ذکر نہ تو کتاب اللہ میں ہو اور نہ اس کے بارے میں سنت رسول اللہ میں کچھ ہو تو لوگوں نے جس بات پر اجماع کیا ہو اس کو دیکھو اور اسی کو اختیار کرو۔)

حضرت عمر فاروقؓ اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

فإنّى واحد كأحدكم و أنتم اليوم تقرون بالحق، خالفنى من خالفنى و وافقنى من وافقنى، ولست اريد ان تتبعوا هواى. (168)

(میں آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں اور آج آپ حق بات کا اقرار کریں۔ جس کو میری مخالفت کرنی ہو وہ مخالفت کرے اور جس کو میری موافقت کرنی ہو موافقت کرے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہشات کے پیچھے چلیں۔)

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں علامہ ابن قیم رقم طراز ہیں:

''وكانت النّازلة إذا نزلت بأمير المؤمنين عمر بن الخطّابؓ ليس عنده فيها نصّ عن الله و لا عن رسوله جمع لها أصحاب رسول الله ﷺ ثمّ جعلها شورىٰ بينهم''. (169)

(جب بھی امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کو کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس میں ان کے پاس اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے کوئی نص (واضح حکم) نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ کو جمع کرتے اور ان میں مسئلہ کو مشاورت کے لیے پیش کرتے۔)

چناں چہ اس بات پر حضرت عمرؓ کاربند بھی رہے اگر کوئی آپؓ پر تنقید کرتا تو اس کا برا نہ مناتے۔ چناں چہ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو کہا: ''**اتق الله يا عُمر**'' (170) اور وہ یہ جملہ بار بار حضرت عمرؓ کو کہنے لگا تو کسی نے اس کو منع کیا اور کہا آپ امیر المؤمنین کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''دعهُ لا خير فيهم ان لم يقولوها لنا، و لا خير فينا إن لم نقبل''. (171)

(انھیں کہنے دو، اگر وہ یہ بات ہم سے نہ کہیں تو ان میں کوئی بھلائی نہیں اور اگر ہم ان کی اس بات کو قبول نہ

www.rahima.org

کریں تو ہم میں کوئی بھلائی نہیں۔)

''كان من سيرة عمرؓ انّه كان يشاور الصّحابة و يناظر هم حتّى تنكشف الغمّة و يأتيه الثّلج فصار غالب قضاياه و فتاواه متبعة في مشارق الأرض و مغاربها''. [172]

(حضرت عمرؓ کی سیرت وخصوصیت یہ تھی کہ آپؓ اکثر موقعوں پر صحابہؓ سے مشورہ کرلیا کرتے تھے ان سے بحث ومناظرہ کرتے تا آنکہ حقیقت امر پوری طرح واضح اور منکشف ہو جاتی اور مسئلہ کے متعلق کامل یقین اور تشفی ہو جاتی اور یہی وجہ ہے کہ مشرق ومغرب کے گوشہ گوشہ میں سے سب سے زیادہ آپؓ ہی کے قضایا (فیصلوں) یا فتاویٰ کی اتباع کی گئی کہ وہ آپؓ کے شخصی نہیں بلکہ اجتماعی فیصلے تھے۔)

3.6۔ حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب اور عوامی نمائندگی

انعقاد خلافت کا تیسرا طریقہ شورائی ہے۔ اس تیسرے طریقہ انتخاب کے بارے میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تحریر کرتے ہیں:

''طریق سوم شوریٰ است و آں آنست کہ خلیفہ شائع گرداند خلافت را درمیان جمعے از مستجمعین شروط و گوید از میان ایں جماعہ ہر کرا اختیار کنند خلیفہ او باشد پس بعد موت خلیفہ تشاور کنند و یکے را معین سازند و اگر برائے اختیار شخصے را با جمعے را معین کند اختیار ھماں شخص یا ہماں جمع معتبر باشد و انعقاد خلافت ذی النورینؓ بہمین طریق بود کہ حضرت فاروقؓ خلافت را درمیان شش کس شائع ساختند و آخرھا عبدالرحمٰن بن عوفؓ برائے تعیین خلیفہ مقرر شد دوے حضرت ذی النورینؓ را اختیار نمودند''۔[173]

(انعقاد خلافت کا تیسرا طریقہ شورائی ہے اور وہ یہ ہے کہ خلیفہ جامعین شرائط (خلافت) کی ایک جماعت میں خلافت کا دائرہ (متعین) کر دے اور کہہ دے کہ اس جماعت میں سے جس کو (اہل شوریٰ) منتخب کر لیں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس خلیفہ کی وفات کے بعد (اہل شوری) مشورہ کریں اور اس جماعت میں سے ایک شخص کو (خلیفہ) معین کر لیں اور اگر (خلیفہ سابق) اس انتخاب کے لیے کسی (خاص) شخص کو یا کسی (خاص) جماعت کو مقرر کر دے تو اس شخص یا اس جماعت کا انتخاب کرنا معتبر ہوگا۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا انعقاد اسی طریقہ سے ہوا تھا کہ عمر فاروقؓ نے خلافت کو چھ آدمیوں کے درمیان دائر (متعین) کر دیا تھا۔ آخر پر حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ ان چھ میں سے ایک خلیفہ مقرر کرنے کے ذمے دار ٹھہرے جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو (خلافت) کے لیے منتخب کر لیا۔)

خلافت راشدہ کے دور میں انعقاد خلافت کے اس تیسرے طریقہ کار کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ، ابولؤلؤ فیروز کے حملے سے جب شدید گھائل ہو گئے تو اُن سے جانشین نامزد کرنے کا مطالبہ ہوا تو انھوں نے رد کر دیا۔ کسی نے ان کے بیٹے عبد اللہ بن عمرؓ کا نام پیش کیا تو اس پر امیر المومنین برہم ہوئے لیکن صحابہؓ کسی کی نامزدگی کی برابر درخواست کرتے رہے۔ آخر کار صحابہؓ کے اصرار پر حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے چناؤ کے لیے چھ رکنی کمیٹی بنا دی۔ ساتواں نام حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا تھا لیکن ان سے صرف مشورہ لیا جانا تھا۔ یہ اس کمیٹی میں شامل نہ تھے کہ جن میں سے خلیفہ کا چناؤ ہونا تھا۔ اس کمیٹی کے ممبران کے نام یہ تھے: عثمان بن

www.rahmia.org

عفان، علی بن ابی طالب، طلحہ بن عبیداللہ، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد ابن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ سب عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور اُمت محمدیہ ﷺ کے نہایت ممتاز افراد تھے۔

ابن کثیر ان الفاظ میں اس کمیٹی کا تذکرہ کرتے ہیں:

''کان عمرؓ قد جعل الأمر بعده شوریٰ بین ستّته نفر و قال لأهل الشّوریٰ یحضر کم عبداللّٰه یعنی ابنه و لیس إلیه من الأمر شئ یعنی بل یحضر الشّوریٰ و یشیر بالنّصح و لا یولی شیئًا''. [174]

(حضرت عمرؓ نے انتخاب خلیفہ کا معاملہ چھ افراد کی شوریٰ کے حوالے کر دیا اور شوریٰ کے شرکا سے کہا! تمھارے ساتھ مشاورت میں عبداللہ بن عمرؓ بھی شریک ہوں گے لیکن اَمر خلافت (کے چھ لوگوں) میں وہ شریک نہیں ہیں یعنی وہ صرف مشاورت کے لیے مجلس میں شریک ہوں گے، مشورہ دیں گے مگر اَمر خلافت ان کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔)

گویا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ محض مشاورت کے لیے شامل کیے گئے تھے، جن لوگوں کا چناؤ ہونا تھا ان میں شامل نہ تھے۔ چناں چہ ابن ہشام (م:۲۱۳ھ) کہتے ہیں:

''فإنّ الخلافة شوریٰ فی هؤلآء الرّهط السّتّته الّذی توفّی رسول ﷺ و هو عنهم راض''. [175]

(خلافت کا فیصلہ ان چھ افراد کی مجلسِ شوریٰ کرے گی جن سے زندگی بھر آں حضرت ﷺ خوش رہے۔)

اس ضمن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وہ اقوال قابل توجہ ہیں جو اس موقع پر آپؓ نے فرمائے۔ آپؓ نے مجلسِ شوریٰ کے منتخب ارکان سے فرمایا! کہ تم کو صرف اس لیے رکن قرار دیا گیا ہے کیوں کہ تم عوام الناس کی نظر میں ان کے قائد اور سردار ہو۔ اسی لیے منصب خلافت کو تمھارے درمیان محدود کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں:

''إنّی نظرت فوجدتکم رؤساء النّاس ووقاء تهم''. [176]

(میں نے غور و فکر کیا تو تم میں سے جن لوگوں کو میں نے سربراہی کے قابل اور اہل پایا ان کا نام لیا۔)

اس کے بعد فرمایا: جب مجوزہ ضابطہ کے مطابق اُمت کے عام افراد ایک فیصلہ پر جمع ہو جائیں اس کے باوجود اس کے بعد کوئی جماعت نافرمانی کرے تو اس کو موت کے گھاٹ اُتار دو۔

''اقتلوا الباقین ان رغبوا عمّا اجتمع علیه النّاس''. [177]

(ان لوگوں کو قتل کر دینا جو لوگوں کے متفقہ فیصلہ سے انحراف کرتے ہیں۔)

''یہ بھی ہدایت کی کہ ہونے والے جانشین کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عوام پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ اس کو مہاجرین و انصار، اہل عرب، فوج کے عام سپاہیوں اور مسلمانوں کے شہریوں کے حق کو محسوس کرنا چاہیے۔ اسے سرمایہ داروں سے زائد مال لے کر عام غریبوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہیے''۔ [178]

جب اس کمیٹی نے مشاورت شروع کی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت علیؓ کے حق میں، حضرت طلحہؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت علیؓ و عثمانؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے صرف حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے دستبرداری اختیار نہیں کی۔ [179]

بعدازاں ان سب نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اختیار دیا کہ وہ رائے معلوم کر کے ان میں سے ایک خلیفہ کا تقرر کریں۔اس کمیٹی نے باہمی مشاورت کے بعد عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے مدینہ منورہ کے پچاس ذی شعور ارکان کو نامزد کیا جن کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ سات رکنی کمیٹی کو جمہور کی رائے معلوم کر کے بتائیں گے۔حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے تمام مشاورت کے بعد استصواب رائے عامہ کی صورت تجویز کی۔سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علیؓ کی جدا گانہ رائے لی گئی۔اس کے بعد تین دن تک استصواب رائے عامہ ہوا۔عورتوں، بچوں، مردوں اور باہر سے آنے والے مسافروں اور راہ چلتے ہوئے لوگوں سے آرا حاصل کی گئیں کہ عثمانؓ و علیؓ میں سے آپ کس کو خلیفہ پسند کرو گے۔مسجد نبوی میں بھی اجتماع ہوا جب کثرت رائے سے ایک نام تجویز ہوگیا تو ایک رائے کے اختلاف سے حضرت عثمانؓ کو منتخب کر لیا گیا۔اس طریق انتخاب کے بارے میں ابن کثیر کے الفاظ ہیں:

''و ینخلع عبدالرّحمن منها لینظر الأفضل لیجتهدن فی أفضل الرّجلین فیو لیه ثم نهض عبدالرّحمٰن بن عوفؓ یستشیر النّاس فیهما و یجمع رأی المسلمین برأی رؤوس النّاس و اقیاد هم جمیعا، و اشتاتا مثنٰی و فرادی و مجتمعین، سرّاً و جهراً، حتّٰی خلص إلٰی النّساء المخدرات فی حجابهن فسعٰی فی ذٰلک عبدالرّحمٰنؓ ثلاثه أیّام بلیالیهنّ لا یغتمض بکثیر نوم إلّا صلاۃ و دعاء و استخارۃ و سوالا من ذوی الرّأی عنهم، فلم یجد أحدًا یعدل بعثمان بن عفان رضی اللّٰه عنه''. [180]

(اور حضرت عبدالرحمٰنؓ یک سُو ہو کر مشغول ہو گئے تا کہ معلوم کریں کہ ان دونوں میں سے بہتر کون ہے تا کہ وہ اسے خلیفہ نامزد کریں۔پھر حضرت عبدالرحمٰنؓ کمر بستہ ہو گئے ان دونوں (حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ) کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرنے کے لیے۔اور انھوں نے سربرآوردہ لوگوں کی رائے اجتماعی اور انفرادی طور پر معلوم کی، دودو، ایک ایک اور مجمعوں سے بھی پوچھا۔اعلانیہ اور خفیہ معلومات جمع کیں۔یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے تنہائی میں ملے اور ان کی رائے معلوم کی۔حضرت عبدالرحمٰنؓ نے تین دن اور تین راتیں سخت محنت کی۔زیادہ سونے کی بجائے صرف نمازوں، دعا، استخارہ اور اہل الرائے سے سوالات کے لیے ہر وقت مصروف رہے تو آپؓ نے کثرت کی بنا پر حضرت عثمانؓ کو منتخب قرار دے دیا۔)

یوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چناؤ اس دور کی تمدنی روایات کے مطابق مسلمانوں کی مرضی اور تائید سے مکمل ہوا۔

''حضرت عمرؓ کے تجویز کردہ نام شخصی رائے کا نتیجہ نہ تھے اگر ایسا ہوتا تو پھر شوریٰ کیوں ہوتا اور انصار کے پچاس نمائندے شوریٰ کے مشیر کیوں مقرر کیے جاتے اور استصواب رائے عامہ کیوں ظہور میں آتا''۔ [181]

حضرت عمرؓ نے چند لوگوں کو انتخاب کے لیے نامزد کیا یعنی ایک کمیشن برائے انتخاب مقرر کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند لوگوں کو امیر یا جماعت (شوریٰ) امیدواری کے لیے نامزد کر سکتی ہے اور یہ اس لیے حجت ہے کہ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع سکوتی ہے۔

حضرت عمرؓ نے چھ افراد میں سے چناؤ کی صورت کیوں اختیار کی اور کسی ایک کو متعین کیوں نہ کیا؟ دراصل یہ اس لیے ہوا کہ

عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں یہ تمام (چھ) افراد ایک ہی صلاحیت اور معیار کے تھے اور ان کا مقام قریب قریب تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مناسب سمجھا کہ جن لوگوں نے ان کی اقتدا کرنی ہے وہ ان چھ میں سے کسی ایک کا اگر خود چناؤ کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ اس سے ایک تو ان پر پسند ناپسند کا الزام نہ آئے گا جو سیاسی نظام میں جھگڑوں کی بنیاد ہے اور دوسرا کسی غلطی کا الزام ان پر نہ ہوگا۔

اس انتخاب کے وقت خلافت کی استعداد رکھنے والے متعدد تھے اور مسجد نبوی میں مسلمانوں کی اجتماعی مجلس کا اس انتخاب میں بڑا دخل تھا۔ اگر غور کیا جائے تو یہ طریقہ انتخاب بہت اچھا ہے۔ اس میں حضور ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کی اقتدا کے ساتھ مشاورت بھی ہے۔ حضور ﷺ کا طریقہ تو یوں کہ آپؐ نے تعین خلیفہ نہ کیا' بس رہنمائی فرما دی۔ اور ابو بکرؓ کا طریقہ یوں کہ اہل الرائے کو چھ نامزد اشخاص کے بارے میں رائے دینے کا اختیار دے دیا۔ جیسے ابو بکرؓ نے اہل الرائے سے مشاورت کے بعد ایک شخص کو متعین کیا تھا اور بعد میں جس طرز پر مشاورت ہوئی اس نے اس طریقہ کار کو اور قوت بخش دی جو آج کے دور سے مناسبت بھی رکھتا ہے۔ گو کہ اس انتخاب کے طریقہ کار پر اس دور کے تمدن کا اثر تھا لیکن روح عوام الناس کی رائے سے نظام حکومت کی تشکیل ہے جس کو آج کے نظام انتخاب کی اساس مانا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو آج کے بیلٹ پیپر سسٹم اور اس طریق انتخاب میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

خلافت راشدہ کے دور میں انتخاب خلیفہ کے مختلف طریقے اختیار کیے گئے جو اس امر کا غماز ہے کہ اسلام ہر دور اور ضروریات کا لحاظ رکھ کے سیاسی نظام تشکیل دینے کی اجازت دیتا ہے لیکن انتخاب عثمانؓ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دورِ حاضر کا انتخابی اور جمہوری نظام اسی سے مأخوذ ہے۔ تفصیل کی بجائے انتخاب عثمانؓ کے عمل کو مذکورہ نکات کی روشنی میں دیکھا جائے تو صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔ چناں چہ انتخاب عثمانؓ میں یہ اُمور اساسی ہیں:

i۔ ایک سے زائد امیدوار۔ ii۔ الیکشن کمشنر کا تقرر۔
iii۔ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق۔ iv۔ عوام الناس کا حق رائے دہی اور رائے شماری میں حصہ۔
v۔ کثرت رائے کے مطابق خلیفہ کا چناؤ۔

3.7۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب اور عوامی نمائندگی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی جمہوری طریقہ سے قائم ہوئی تھی کیوں کہ چھ رکنی کمیٹی میں ان کا نام تھا۔ ان میں سے چار دستبردار ہو گئے تھے اور بقیہ دو میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ رہ گئے تھے۔ رائے عامہ کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ منتخب ہو گئے اور شہادت کے بعد جب منتخب خلیفہ نہ رہا تو دوسرا اس کی جگہ آ گیا۔ یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی جمہوری نظام پر مبنی تھی۔ ان سے اہل مدینہ نے بیعت کر لی تھی، جسے اس زمانے میں عوام الناس کی مرضی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یوں ان کا انتخاب بھی اکثریت کی مرضی سے ہوا تھا اور اس انتخاب میں بھی پہلے اہل حل وعقد پر عوام الناس کی رائے (بیعت) کا عمل دخل تھا۔ چناں چہ ایک روایت ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد چند اصحاب حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور منصب خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لیس ذٰلک إلیکم إنّما هو لأهل الشّوریٰ و أهل بدر فمن رضی به أهل الشّوریٰ و أهل

بدر فهو الخليفة فنجتمع و ننظر فی هٰذا الأمر''. (182)

(یہ معاملہ تمھارے فیصلہ کرنے کا نھیں ہے۔ یہ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا کام ہے جس کو اہل شوریٰ اور اہل بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔)

چوں کہ اہل بدر ہر نشیب وفراز میں رسالتمآب ﷺ کے ساتھ رہے ہیں وہ اس ذمے داری کی اہلیت کو خوب سمجھتے ہیں اس لیے اس اہم منصب پر جس کو وہ چاہیں گے وہی درست فیصلہ ہوگا۔ غور کیا جائے تو یہ طریقہ بھی پہلے طرق میں سے کسی نہ کسی طریقہ یا پہلے طریقہ کے ماتحت آتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ حضرت علیؓ کی خلافت ان چار طریقوں میں سے کس طریقہ پر ہوئی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپؓ کی خلافت جمہوری طریقہ سے ہوئی۔ ان سے اہل مدینہ نے بیعت کر لی تھی اور ان کا انتخاب اکثریت کی مرضی سے ہوا تھا۔

اس مقام پر یہ امر قابل غور ہے کہ انعقاد خلافت کا ایک ہی طریقہ کیوں نہ اپنایا گیا؟ ان میں سے کون سا طریقہ صحیح اور کون سا غلط ہے؟ کیا انعقاد خلافت کے مختلف طریقے ناتجربہ کاری کی وجہ سے رونما ہوئے یا یہ ایک مفید مختلف حکمت عملی کا مظہر ہے؟ خلفائے راشدین کسی ایک طریقہ پر کیوں متفق نہ ہوئے؟ یہ ہر خلیفہ کے فہم کا کمال اور درجہ کا فرق ہے یا اختلاف رائے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انعقادِ خلافت کے یہ مختلف طریقے ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ سماجی اور عمرانی علوم میں شغف رکھنے والوں اور قوموں کی سیاسی زندگی کے مدوجزر کا گہرائی سے مطالعہ کرنے والوں کو یہ آگہی ہے کہ زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ اس بنا پر سماج کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں تو اس کا اثر لازماً اندازِ فکر اور طرز زندگی پر بھی پڑے گا۔ دراصل انعقاد خلافت کے مختلف چار طریقے اسی حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہر طریقہ مختلف حالتوں، سماج کے ارتقائی مراحل اور صورتوں کی عکاسی کر رہا ہے۔ چناں چہ اب اُمت کو اس ضمن میں آزادی ہے کہ وہ کوئی بھی طریقہ اپنا لے۔ لیکن اس بات کو پیش نظر رکھ کر کہ کون سا طریقہ ان کے حالات زمانہ کی رعایت کر رہا ہے اور دوسرے طریقے کے برعکس نسبتاً عصری تقاضوں سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ گویا چار مختلف طریقے کوئی مستقل قانون نہیں ہیں بلکہ حالات وزمانہ کی رعایت رکھ کر اس مقصد کو بہتر طور پر سرانجام دینے کے لیے مختلف اسلوب ہیں۔ تو ہر علاقے کی قوم اپنے اپنے سیاسی، جغرافیائی اور دیگر سماجی حالات کی روشنی میں جو طریقہ قیام عدل اور حالات زمانہ کے زیادہ قریب محسوس کرے وہ اسے اپنا لے وہی طریقہ دینی ہوگا اور وہی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہوگی۔

3.8۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انعقاد خلافت کے وہ چار طریقے ذکر کیے ہیں جو خلفائے راشدین اور بعد کے زمانے میں اختیار کیے گئے۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک انعقادِ خلافت کے مذکورہ بالا چار طریقوں کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

''بالجملہ اگر شخصے متفرد باشد درزمان خود بشروط خلافت وایں شخص افضل ہمہ است منعقد نشود خلافت او بغیر یکے از طرق مذکورہ''۔ (183)

ترجمہ:۔ جس شخص میں خلافت و امامت کی خصوصیات اور شرائط پائی جاتی ہوں بلکہ اس سے افضل کوئی بھی موجود نہ ہو تو پھر بھی اس کی خلافت ان چار طریقوں کے علاوہ منعقد نہ ہوگی خلافت اسی کی معتبر ہوگی جس کو ان چار طریقوں میں سے کسی ایک ذریعہ سے غلبہ حاصل ہو جائے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے نماز کی امامت کے وقت ایک ہی صلاحیت کے بہت سے لوگ موجود ہوتے ہیں مگر امام وہی کہلاتا ہے جسے امامت کے لیے لوگ آگے کر دیں اور اس کی اقتدا اختیار کریں۔

ان طریقوں سے مراد ان کی کوئی خاص شکل نہیں بلکہ ان کی بنیادی روح ہے جیسا کہ خود امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس مقصد کے لیے ایک مجلس کا تصور دیتے ہیں۔ (184)

اس لیے اب اُمت کے لیے یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ان طریقہ ہائے انعقادِ خلافت کی روح کو اپنے نظریہ امامت کے لیے بنیاد بنائیں جو خلفائے راشدین کے زمانے میں اختیار کیے گئے۔ کیوں کہ اُمت مسلمہ کی یہ جماعت ایک طویل زمانے تک شارع علیہ السلام کے ساتھ رہی ہے۔ قرآن کے نزول، بیان اور اس کی عملی تعبیر کا مشاہدہ کرنے والی یہی جماعت ہے تو قرآن و حدیث میں جہاں کہیں نظریہ امامت کے حوالے سے ہدایات ہیں وہ انھیں کے سامنے عملی صورت میں رونما ہوئی ہیں تو وہ لازماً دیگر اُمور دینیہ کی طرح اس شعبہ دین (نظریہ امامت) کی حقیقت' مقاصد اور تعین کو بعد والوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتے ہوں گے۔ اسی بنیاد پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

''علیکم بسنّتی و سنّة الخلفاء الرّاشدین المهدیّین عضّوا علیها بالنّواجذ''. (185)

(تم پر میرے اور میرے خلفا کے طریقے پر چلنا واجب ہے اس طریقہ پر مضبوطی سے جمے رہو (اور نئی باتوں سے بچو)۔

دوسری جگہ ہے:

''اقتدوا بالّذین من بعدی أبی بکرؓ و عمرؓ''. (186) (میرے بعد ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اقتدا کرنا۔)

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انعقاد خلافت کے مختلف طریقوں کی تعلیم خود حضور ﷺ نے دی۔ چناں چہ اُمت نے انعقاد خلافت کے لیے ان چار طریقوں کو بنیادی حیثیت دی جو خلافت راشدہ کے زمانے میں تعین امام کے لیے ملتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے دور میں اہل الرائے کی ایک جماعت سے مشاورت ہوتی تھی اور ان کے اجتماعی فیصلوں میں خلیفہ وقت بھی شریک ہوتا تھا۔ جو فیصلہ ہو جاتا اس پر عمل درآمد ہو جاتا لیکن جس جماعت سے مشورہ لیا جاتا تھا اسے آج کی طرح منتخب نہ کیا جاتا تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اُمور مہمہ کے لیے قرآنی اصول (وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ) کے مطابق ذی رائے جماعت سے مشورہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپؓ نے پہلے سے موجود اس ادارے کی طرف توجہ کی جو زمانہ قدیم سے چلا آرہا تھا اور شریعت میں ایسی کوئی شہادت موجود نہ تھی جو اسے ناجائز قرار دیتی، وہ ادارہ قبائلی شیوخ اور خاندانی رؤسا کی مجلس کا تھا۔ چوں کہ عوامی نمائندگی کے لیے اصل ضرورت عوام کے پسندیدہ اور مقبول نمائندگان کا اس ذمے داری پر فائز ہونا ہے۔ ان کے چناؤ کا طریقہ خواہ کوئی بھی ہو' اس دور میں عوامی نمائندگان کا یہی طریقہ رائج تھا۔

www.rahimia.org

خلفائے راشدین کے دور تک اس ادارے کی ساخت اور اس کے وجود کے بارے میں عرب معاشرے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ اجتماعی معاملات میں جو آرا قریش یا انصار کے سردار دیتے تھے وہ سب کو قبول ہوتی تھیں۔ اس حالت میں اگر انتخاب کا طریقہ اپنایا بھی جاتا تو انھی لوگوں نے منتخب ہونا تھا۔ اس حقیقت سے اغماض ممکن نہیں کہ ہر دور کے سیاسی اور سماجی ادارے اس دور کے حالات کے مطابق تشکیل پاتے ہیں۔ بعد میں اگر حالات اور طریقہ کار بدل جائے تو اسے غلط قرار نہیں دیا جا سکتا۔ توجہ طلب امر صرف حقیقی نمائندگی کے وجود کا ہوتا ہے البتہ موجود اسلامی معاشرہ دوسرے مہذب و متمدن معاشروں کی طرح قبائلی زندگی کے طور طریقوں سے مدت ہوئی بہت آگے نکل چکا ہے اور اب قبائلی زندگی کی قیادت اپنی وہ اہمیت بھی کھو چکی ہے جو پہلے اسے حاصل تھی لہٰذا ہمارے پاس ملت کی رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے عوام کے ووٹ لیے بغیر کوئی اور ذریعہ نہیں رہا۔

حد درجہ اہم معاملات میں ووٹ لینے کا مسئلہ استصواب رائے عامہ کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ وضع قانون کے عام معاملات میں انتخابات سے بہتر کوئی طریقہ اب تک کسی نے تجویز نہیں کیا۔ انتخابات سے مراد یہ ہے کہ لوگ افراد کی ایک تعداد چن لیں جو نمائندگی کے فرائض انجام دیں۔ یہ ایسا بدیہی اَمر ہے کہ اس پر بحث کی ضرورت نہیں مگر بہت سے مسلمان اب تک موجودہ معاشرے اور اسلام کے صدرِاول کے معاشرے میں وضع و ساخت کے اختلاف (جو بہت دوررس اختلاف تھا) کو سمجھ نہیں سکے۔ اگر خلفائے راشدین کو اس قسم کے حالات سے سابقہ پڑتا جو ہمیں پیش آئے تو یقیناً وہ ان سیاسی نتائج پر پہنچتے جو چودہ سو سال پیش تر کے نتائج سے بہت مختلف ہوتے۔ بالفاظ دیگر ان کی مجلسِ شوریٰ رائے عامہ کی بنا پر منتخب ہوتی۔ (187)

اس مقام پر اس وضاحت کی ضرورت ہے کہ صدرِاول اور عصرِ حاضر کی وضع و ساخت کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دراصل معاشرہ ہمیشہ ارتقا پذیر رہتا ہے۔ ایک دور کے بعد دوسرے میں نمایاں معاشرتی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نئے مسائل اور نئے تقاضے جنم لیتے ہیں تو ان بدلے ہوئے حالات میں مسائل کا حل بھی نئی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ نئے حالات و تقاضوں کو نظرانداز کر کے پرانے دور کے قوانین نافذ کر دیئے جائیں۔ عصرِ حاضر بھی سابقہ دور کے حالات سے بہت مختلف ہے۔ مولانا تقی امینیؒ لکھتے ہیں:

''پہلے جو کام ایک گوشہ میں ہوا کرتا تھا اب اس کے لیے وسیع دنیا وجود میں آگئی ہے۔ پہلے ایک فرد کی صلاحیت کافی ہوتی تھی اب تقسیم کار کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ پہلے تجدید دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی اب اس کا تعلق ایک دور سے ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں جب تک ہمہ جہتی پروگرام نہ ہو کسی ایک گوشہ میں رہنمائی سے ملت کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتی ہیں۔ جس طرح کسی ایک تنظیم وتحریک سے ملت کے ہر گوشہ میں رہنمائی کا مدعی بننا خودفریبی ہے''۔ (188)

معاشرے کے حالات اور تقاضوں میں صدرِاول کے حوالے سے جو فرق آ گیا ہے اسے سمجھنے اور اس کی رعایت میں سیاسی نظام کے اداروں کی تشکیل کی ضرورت ہے۔ یہ معاملہ پورے سیاسی نظام کا ہے جس میں حالات زمانہ کے لحاظ کی ضرورت لازمی ہے۔ علامہ ابن عابدین الشامیؒ (م:۱۲۵۲ھ) فرماتے ہیں:

''انّ جمود المفتی و القاضی علٰی ظاهر المنقول مع ترک العرف و القرائن الواضحه و الجهل بأحوال النّاس یلزم منه تضییع حقوق کثیرة و ظلم خلق کثیرین''. (189)

(ظاہر نقول پر مفتی و قاضی کا جمود اور عرف و قرائن سے غفلت اور لوگوں کے احوال سے بے خبری کی وجہ سے بہت سے حقوق ضائع ہوتے ہیں اور خلق کثیر پر ظلم ہوتا ہے۔)

ماہر عمرانیات علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

''زمانوں میں اقوام عالم کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں اور ان کے اخلاق و عادات، طور طریقے اور تہذیب و تمدن ایک حالت پر اور ایک راہ پر باقی نہیں رہتے بلکہ زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں''۔[190]

عہدِ نبویؐ و خلافت راشدہ میں عوام کی رائے کا احترام اور عوامی حکمرانی کے تصور کا اصل سبب اسلامی نظام حکومت کا عوام دوست ہونا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ایک عمرانی اور تاریخی پس منظر بھی ہے اور وہ یہ کہ جزیرۃ العرب کی تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ وہاں قومی حمیت، عوامی مسائل کے حل کی سوچ اور اجتماعی مسائل کو اجتماعی دانش کی روشنی میں حل کیا جاتا تھا۔ چناں چہ قصی بن کلاب کی اجتماعیت پسند سوچ اور حلف الفضول جیسے واقعات اس کی شہادتیں ہیں کہ قدیم زمانے سے دنیا کے بادشاہوں کی جزیرۃ العرب پر قبضے کی سوچ کے خواب کو شرمندہ تعبیر عربوں کی اسی سوچ نے نہ ہونے دیا۔ اسی آزادی پسند سوچ نے ہی قرآنی دعوت کی قبولیت کی راہ ہموار کی تھی۔ ورنہ قرآن کا اتنا اونچا فکر ان کو سمجھ نہ آسکتا تھا۔ کیوں کہ تاریخ انسانیت ایسی شہادتیں پیش کرنے سے عاجز ہے کہ کوئی قوم بے سُدھ اور مردہ حالت میں صدیوں سے پڑی ہو اور یکا یک اس میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔[191]

3.9۔ خلافت راشدہ کے قیام میں عوامی نمائندگی کا کردار

دین اسلام کے گہرے شعور و ادراک کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان انتخابی طریقہ اپنانے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ قرآن و سنت کے ذریعے یہ معاملہ بالکل واضح ہے کہ اسلامی مملکت کا امام انتخاب سے مقرر کیا جائے، لیکن شریعت میں انتخاب کا کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا گیا۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حالات کے مطابق مختلف طریقے اپنائے جو عوامی نمائندگی کی حقیقی روح کو لیے ہوئے ہیں۔ پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب مہاجرین و انصار کے اہل حل و عقد نے اجتماعی دانش سے کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صاحب الرائے اصحاب سے مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جانشین نامزد کیا اور اکثریت نے اپنے نمائندگان کی رائے کو درست قرار دیتے ہوئے ان کی امامت تسلیم کر لی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آیا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے نہایت ممتاز اصحاب میں سے چھ کی ایک انتخابی جماعت نامزد کر دی اور انھیں یہ ذمے داری سونپ دی کہ اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ اس جماعت نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی سربراہی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جنھیں اُمت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح و جائز جانشین مان لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات (شہادت) پر اکابر صحابہ کی مشاورت اور اتفاق کے بعد مسجد نبوی کے ایک اجتماع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان ہو گیا اور اکثریت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کا حلف اٹھا لیا۔ اس بابت علامہ محمد اسد کہتے ہیں:

''غرض جن چار عہد ہائے حکومت کو ہم خلافت راشدہ کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں مملکت کے نہایت اہم مسئلے کے متعلق دستور مختلف رہا اور انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس طریقے سے رئیس مملکت کا انتخاب ہوتا وہ ایک نہایت اہم دستوری مسئلہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معاملے میں جس اختلاف پر اتفاق کیا اس اختلاف کا

تعلق حلقہ انتخاب سے بھی تھا اور طریق انتخاب سے بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں مملکت کا (سیاسی) دستور وقتاً فوقتاً تبدیل کیا جا سکتا تھا اور اس وجہ سے اس کی اسلامیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا تھا''۔ (192)

اصل بات تو دین کے اجتماعی تصور کا ادراک ہے جو صحابہ کو نہ صرف مکمل طور پر حاصل تھا بلکہ وہ اس پر مجتہدانہ بصیرت کے حامل تھے۔ البتہ کسی امر کی انتظامی اور عملی شکل کی تبدیلی حقیقی ادراک کو مشکوک نہیں کرتی۔ سب سے اہم بات یہاں یہ ہے کہ اجتماعیت، جمہور اور جمہوریت لوگوں کو محض ووٹ کا حق دے دینے کا نام نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، سماجی، قانونی، عدالتی اور مذہبی غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں جمہور کے حقوق کے تحفظ کا نام ہے جو دورِ صحابہؓ میں ہمہ جہتی لحاظ سے پوری توانائی کے ساتھ موجود تھا۔ جب کہ آج ظاہری تقاضے تو سب پورے ہوتے ہیں اور نمائشی طرزِ عمل پر بہت توجہ دی جاتی ہے مگر حقیقت بہت دور ہے۔ اس بابت علامہ محمد اقبال (م:1938ء) کی مغربی جمہوریت پر تنقید قابل مطالعہ ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

گرمی گفتار اعضائے مجالسؑ الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری (193)
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (194)

غور کیا جائے تو چاروں طریقہ ہائے خلافت عوامی نمائندگی کی حقیقی شکلیں ہیں اور مختلف حالات کی روشنی میں عوامی نمائندگی کے قیام کی بہترین شکل نکالی گئی ہے۔ اگر باہمی مشاورت کے ذریعے عوامی نمائندگان (ارباب حل وعقد) کی اکثریت کا اتفاق رائے بھی ہو تو یہ عوامی نمائندگی کی مثالی صورت کی نمائندگی کرتا ہے۔ چناں چہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اس امر کی نشان دہی کرتے ہیں کہ:

''لم ينتظم أمرها إلّا برجل اصطلح علىٰ طاعته جمهور أهل الحلّ و العقد''. (195)

(لوگوں کی تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب کہ جمہور کے اہل حل وعقد کسی ایک آدمی پر متفق ہو جائیں۔)

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں عوامی نمائندگی کا تصور دراصل قرآن کے تصور خلافت کی تعبیر ہے۔ عوامی نمائندگی کا حقیقی تصور قرآن وسنت اور دورِ خلفائے راشدین کے طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ:

(i) مشاورت کی آیات واحادیث کی جامع تعبیر کا یہی تقاضا ہے۔

(ii) آیات واحادیث میں مطلق العنان اور جابر حکومتوں پر تنقید اس بنا پر کی گئی ہے کہ وہ عوامی امنگوں اور حقوق کا احترام نہ کرتی تھیں۔

(iii) آثار صحابہؓ عوامی پسند ناپسند کے خیال اور ان کی رائے کے احترام پر مبنی ہیں۔

(iv) محققین اور مسلم مفکرین عوامی رائے کی روشنی میں قیام خلافت کے قائل ہیں۔

(v) اسلام کا مفاد عامہ کا نظریہ اس کا مؤید ہے کہ عوام کی رائے کا احساس نظامِ حکومت کو قبولیت عطا کرتا ہے۔

جمہور کے حقوق کے تحفظ کے نظام کے لیے ضروری نہیں کہ اس کی شکل وصورت مغرب کے ماڈل جیسی ہو۔ بنیادی ہدف تو

اجتماعیت کی روح کو قائم کرنا ہے۔ اس کی ظاہری صورت کوئی بھی ہوسکتی ہے۔

اب یہ اَمر قابلِ فہم ہوگیا کہ ان تمام طریقہ ہائے انعقادِ خلافت میں شورائیت اور جمہوریت کی روح موجود ہے۔ اس پر اگر عربی رنگ غالب ہے تو یہ ایک معروضی ضرورت تھی۔ کون سا ایسا نظام ہے جس کی جڑیں اس دور کے سیاسی، سماجی رجحانات میں موجود نہیں ہوتیں۔ اور ان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ قابل غور اَمر یہ ہے کہ ان تمام طریقوں میں عدل اجتماعی اور انسانی فطری تقاضوں کے احترام کو نہ صرف ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ اجتماعی دانش و بصیرت کے لحاظ سے مکمل اہتمام موجود ہے۔ اس لیے ان طریقوں کی ظاہری حالت قابل اعتنا نہیں ہے۔

حاصلِ بحث

مذکورالصدر گفتگو سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں چند باتیں اصل الاصول کی حیثیت رکھتی ہیں:

۱۔ سیاسی نظام کی تشکیل کے لیے مشاورت ضروری ہے۔

۲۔ مشاورت محض چند مخصوص لوگوں سے نہیں ہونی چاہیے بلکہ ضرورت پڑنے پر اس کا دائرہ عمومی و عوامی بھی ہونا چاہیے۔

۳۔ نمائندگان عوام کے چناؤ اور عوامی مسائل کے حل دونوں کے لیے مشاورت ضروری ہے۔

۴۔ مشاورت ان اُمور میں ہوگی جو انتظامی اور عصری ضرورتوں کے تحت ہیں۔ اسلام کے قطعی احکامات میں نمائندگان قوم اور عوام کو قیل و قال کی اجازت نہیں ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ 42- شوریٰ: 38۔

2۔ محمد اسد، علامہ (م:1992ء) اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول (ترجمہ اردو: مولانا غلام رسول مہر) جمعیت پبلیکیشنز۔ وحدت روڈ لاہور۔ 2006ء، ص88۔

3۔ ابن قیم، الجوزیة، محمد بن ابی بکر (م:۷۵۱ھ) الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة. دارالباز للنشر والتوزیع، مکة المکرمة۔س۔ن، 14۔

4۔ 27- النمل: 34۔

5۔ محمد حمید اللہ، ڈاکٹر (م:2002ء) خطبات بہاولپور۔ ادارہ تحقیقات اسلامی۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد۔ 1995ء۔ 93

6۔ ایضاً: 98، 99

7۔ 5- المائدہ: 12۔

8۔ تفسیر ابن عباس، مجدالدین محمد بن یعقوب (م:۸۱۷ھ) قدیمی کتب خانہ کراچی۔ تفسیر آیة۔ 109:5

9۔ پانی پتی، ثناء اللہ، قاضی، تفسیر مظہری۔ ایچ ایم سعید اینڈ کمپنی، کراچی۔س۔ن۔ 419:3

10۔ شاہ ولی اللہ (م:1763ء)، حجة اللہ البالغہ (عربی)، دار ابن کثیر، بیروت۔ لبنان، طبع ثانی 2017ء، ص، 1-161

11۔ اسے آج کل حلقہ بندیوں کی شکل میں اپنایا گیا ہے۔

12۔ شبلی، نعمانی، مولانا (م: 1914ء) سیرت النبی۔ دارالاشاعت، اردو بازار۔ ایم اے جناح روڈ، کراچی۔ 1975ء۔ 1:159، 160

13۔ ابن کثیر، عماد الدین، حافظ (م:۷۷۴ھ) البدایہ و النهایة. مکتبة المعارف بیروت، لبنان. ط: ثالثہ 1979ء۔ 1:159؛ ابن هشام، ابو محمد، عبد الملک، المعافری (م:۲۱۳ھ) السیرة النبویة (تحقیق: المصطفیٰ السقاء ابراهیم الابیاری و عبد الحفیظ شلبی) مکتبه و مطبعة مصطفی البابی الحلبی مصر. ط: ثانیه ۱۳۷۵ھ. 2:454۔ 460

14۔ ابوداؤد، سجستانی، سلیمان بن اشعث(م: ۲۷۵ھ) السنن، ک؛ الخراج والإمارة والفيء، ب؛ فی العرافة، حدیث نمبر 2934)

15۔ ابن منظور، الافریقی، مصری (م:۷۱۱ھ) لسان العرب. طبع دارصادر بیروت. س.ن. 8:238

16۔ معالم السنن. 3:347

17۔ 60- الممتحنۃ: 12۔

18۔ المسلم، الجامع الصحیح، ک: الامارة، ب: وجوب طاعة الامرفی غیرمعصیة وتحریمها فی المعصیة، حدیث نمبر 1839

19۔ دیکھئے، ابن الاثیر، عزالدین، ابوالحسن علی (م:۶۲۱ھ) الکامل لابن اثیر، 2:35 تا 37، 418۔ ابن کثیر، البدایه والنهایة. 7:147

20۔ زیبا افتخار، مقالات حمید اللہ۔ قرطاس، پوسٹ بکس نمبر 8453 کراچی یونیورسٹی کراچی۔ 2004ء۔ 27

21۔ ابن منظور، الافریقی، مصری (م:۷۱۱ھ) لسان العرب. طبع دارصادر بیروت. س.ن. 8:160۔159

22۔ عبد الرحمن، عبدالخالق، الشوریٰ فی ظل نظام الحکم الاسلامی، الدار السلفیه و دار القلم، 1975ء. 14

23۔ ابوحیان، محمد بن یوسف (م:۷۵۴ھ) البحر المحیط. دارالفکر للطباعة والنشر والتوزیع. ط: ثانیه 1978ء. 3:98

24۔ حامد الانصاری، غازی، مولانا، اسلام کا نظام حکومت۔ الفیصل ناشران و تاجران کتب، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔ 299

25۔ 42- شوریٰ: 38.

26۔ 3- آلِ عمران: 159.

27۔ 3- آلِ عمران: 159.

28۔ الجصاص، احمد بن علی (م:۳۷۰ھ) احکام القرآن (تحقیق: محمد صادق قمحاوی) دارالمصحف قاهره. ط: ثانیه س۔ن۔ 2:50

29۔ ابن کثیر، عماد الدین (م:۷۷۴ھ) تفسیر القرآن العظیم، دار ابن حزم للطباعة واللنشر والتوزیع، بیروت. لبنان، اشاعت اول 2000ء، ص 414

30۔ 47- محمّد: 21.

31۔ احکام القرآن: 2:49

32۔ ابن تیمیه، احمد بن عبدالحلیم (م:۷۲۸ھ) السیاسة الشرعیة، دار عالم الفوائد، للنشر والتوزیع، مکة المکرمه، طبع اول ۱۴۲۹ھ، ص 227

33۔ ابوحیان، البحر المحیط. 3:98

34۔ ابوالکلام، آزاد، مولانا (م: 1958ء) اسلام اور جمہوریت۔ طیب پبلشر، یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، حاجی حنیف اینڈ سنز لاہور، سن 2008ء، ص 80

35۔ ابوحیان، البحر المحیط. 3:99

36۔ حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت۔ 339
37۔ زیبا افتخار، مقالات حمید اللہ۔ قرطاس، پوسٹ بکس نمبر 8453 کراچی یونیورسٹی، کراچی۔ طبع اول 2004ء، ص 26
38۔ ایضاً، ص 33
39۔ 3- آلِ عمران: 159.
40۔ 94- الم نشرح: 3-2.
41۔ 9- التوبه: 33.
42۔ الجصاص، احکام القرآن. 49:2
43۔ نفس المکان
44۔ الترمذی، ابوعیسی (م:۲۷۹ھ)السنن، ک: ابواب الجهاد، ب: ماجاء فی المشورة، حدیث نمبر 1714. قال ابوعیسی هذا حدیث حسن و ابوعبیده لم یسمع من ابیه ویروی عن ابی هریرة.)
45۔ 42- شوریٰ: 38.
46۔ الدارمی، عبدالرحمن (م:۲۲۵ھ)السنن، ابواب فی المقدمه، ب: التورع عن الجواب فیما لیس فی کتاب ول اسنة، حدیث نمبر 117
47۔ رواه الطبرانی فی الاوسط
48۔ ابن کثیر، البدایة و النهایة. 159:1۔ دیکھئے ابن ہشام، السیرة النبویة. 2:454۔ 460
49۔ البخاری، محمد بن اسماعیل، ابو عبدالله (م:۲۵۶ھ) الجامع الصحیح، ک: التفسیر، ب؛ ان الذین یحبون ان تشیع، حدیث نمبر 4757
50۔ دیکھئے، ابن کثیر، البدایة و النهایة. 297:3
51۔ الترمذی، السنن، ب: ماجاء فی المشورة، حدیث نمبر 1714
52۔ ابن هشام، السیرة النبویة. 63:3
53۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الاعتصام بالکتاب و السنة، ب: قول الله و امرهم شوریٰ بینهم، حدیث نمبر 7370
54۔ ابن کثیر، البدایة و النهایة. 106:4
55۔ ابن کثیر، البدایه و النهایة. 164:4
56۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک؛ الوکالة، ب؛ إذا وهب شیئا لوکیل أو شفیع قوم جاز، حدیث نمبر 2307-2308
57۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: المغازی، ب: غزوة الطائف
58۔ الترمذی، السنن، ب: ماجاء فی المشورة، حدیث نمبر 1714
59۔ مبارک پوری، تحفة الاحوذی. 215:13
60۔ الترمذی، السنن، ابواب الفتن، ب: حدثنا موسی بن عبدالرحمن، حدیث 2264 قال ابوعیسی هذا حدیث غریب.
61۔ الدارمی، السنن، ابواب المقدمه، ب: التورع عن الجواب فیها لیس فیه کتاب ولاسنة
62۔ 4- النساء: 83.
63۔ الزمخشری، محمود بن عمر (م:۵۳۸ھ) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوه التاویل. ن: شرکة مکتبه مصطفی البابی الجلبی، مصر. ط:۱۳۹۲ھ۔ 216:1

64۔ الدارمی، السنن، ابواب فی المقدمہ، ب: الفتیا وما فیہ من الشدہ. حدیث نمبر 167
65۔ ابن قیم، الجوزیہ، ابوعبداللہ، محمد بن ابی بکر (م:۷۵۱ھ)اعلام الموقعین عن رب العالمین. مطبعة السعادة، مصر. ط: اولیٰ ۱۳۷۴ھ/ 1955ء. 84:1
66۔ شبلی، نعمانی، مولانا، الفاروق۔ اسلام بک ڈپو اردو بازار لاہور۔ ط: اولیٰ 1997ء۔ ۴۱،۴۲
67۔ ابو یوسف، قاضی، یعقوب بن ابراھیم (م:۱۸۲ھ) کتاب الخراج. ادارة القرآن للطباعة و النشر للتوزیع کراچی۔ 1987ء۔ 27
68۔ ابن ابی شیبة، ابوبکر عبداللہ (م:۲۳۵ھ) مصنف ابن ابی شیبة، ادارة القرآن، کراچی۔ 1985ء۔ 319:3
69۔ ابویوسف، کتاب الخراج. 64
70۔ شاہ ولی اللہ، حجة اللہ البالغہ. 132:1
71۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الاعتصام بالکتاب و السنة، ب:الاقتدا بسنن رسول اللہﷺ، حدیث نمبر 7286
72۔ شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، مقصد اول، نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔ س۔ ن۔ ص ۱۳۰
73۔ ابوالکلام، اسلام اور جمہوریت۔ 86
74۔ پانی پتی، تفسیر مظہری۔ 161:6
75۔ المسلم، نیشاپوری، ابو الحسین، مسلم بن حجاج (م:۲۶۱ھ)الجامع الصحیح، ک: الجهاد والسیر، ب: غزوہ بدر، حدیث نمبر 4621
76۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: المغازی، ب: قول اللہ تعالیٰ و یوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم، حدیث نمبر 4318-4319
77۔ ابن ہشام، السیرة النبویة. 51:2
78۔ الترمذی، السنن، ابواب الفتن، ب: حدثنا موسی بن عبدالرحمن، حدیث نمبر 2264قال ابوعیسی ھذا حدیث غریب.
79۔ حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت۔ 260
80۔ ایضاً: 258
81۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الحدود، ب: الاعتراف بالزنی، حدیث نمبر6829
82۔ ابن ہشام، السیرة النبویة. 60:4
83۔ ابن کثیر، البدایہ و النهایة. 145:7
84۔ 4- النساء: 5.
85۔ الاصفهانی، راغب (م:۵۰۲ھ)الذریعه الی مکارم الشریعه. دارصادر. س.ن. ص،19
86۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: العلم، ب: کیف یقبض العلم؛ مسلم، ک: العلم، ب: رفع العلم فی آخر الزمان، حدیث نمبر 100
87۔ نفس المکان
88۔ حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت۔ 302
89۔ ایضاً: ۳۰۴؛ الشوکانی، محمد بن علی (م۱۲۵۰ھ) فتح القدیر الجامع بین فنی الروایة والدرایة من علم التفسیر.

مطبع مصطفی البابی الحلبی. ۱۳۴۹ھ۔۴:۵۲۶

90۔ اصلاحی، امین احسن، مولانا (م:۱۹۹۷ء)، جدید اسلامی ریاست میں قانون سازی اور مسائل۔ دارالتذکیر، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور۔ 2005ء۔ 131

91۔ انصاری کمیشن، آرٹیکل 9 (3) 13

92۔ القلقشندی، احمد بن علی (م:۸۲۰ھ) ماثر الانافه فی معالم الخلافة (تحقیق: عبدالستار احمد فراج) ن: عالم المکتب بیروت، لبنان. ۱۳۸۰ھ۔ 32:1

نوٹ:۔ اصل عبارت ہے: لان العقل آلة التدبیر فاذا ذهب العقل ذهب التدبیر

93۔ 4- النساء: 5.

94۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الحدود، ب: الاعتراف بالزنی، حدیث نمبر 6829

95۔ شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء. 1:18، 19

96۔ 2- البقرہ: 247.

97۔ پانی پتی، تفسیر مظہری۔ 2:14

98۔ انصاری کمیشن، آرٹیکل 9

99۔ شیزری، عبدالرحمن (م:۵۸۹ھ) المنهج المسلوک فی سیاسة الملوک. مکتبة المنار، اردن. 486

100۔ 46- الاحقاف: 15.

101۔ زیبا افتخار، مقالات حمید اللہ۔ 28

102۔ کتانی، عبدالحی، علامہ (ترجمہ مولانا معظم الحق) دورنبوی کا نظام حکومت۔ ادارۃ القرآن و العلوم الاسلامیہ۔ 437 ڈی گارڈن ایسٹ، لسبیلہ چوک کراچی۔ 2003ء۔ 135

103۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه، 1:46؛ شاہ اسماعیل، شہید، مولانا (م:۱۸۳۱ء) منصب امامت۔ گوشۂ ادب چوک انارکلی، لاہور۔ 1955ء۔ 46

نوٹ:۔ حجة الله البالغه کی عبارت ہے: ولابد للملک من فراسة یتعرف بها ماضمرت نفوسهم و یکون ألمعیا یظن بک الظن کأن قد رأی و قد سمع

104۔ 38- صٓ: 20.

105۔ 12- یوسف: 55.

106۔ 2- البقرہ: 247.

107۔ امین احسن، جدید اسلامی ریاست۔ 182

108۔ الماوردی، علی بن محمد (م:۴۵۰ھ) الاحکام السلطانیه والولایات الدینیة. ن: شرکه مکتبه و مطبعة مصطفی البابی الحلبی، القاهرة. ط: الثالثة ۱۳۹۳ھ۔ 4

109۔ الاصفهانی، الذریعه الی مکارم الشریعه. 19

110۔ شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء. 1:101

111۔ شیزری، عبدالرحمن (م:۵۸۹ھ) المنهج المسلوک فی سیاسة الملوک. مکتبة المنار، اردن. 486

112۔ ابن الحزم، علی بن احمد، الظاهری (م:۱۰۶۴ھ) الفصل فی الملل و النحل. ن: دارالمعرفة للطباعة والنشر،

www.rahimia.org

بیروت. ط: ثانیه ۱۳۹۵ھ۔ 160:1

113۔ انصاری کمیشن، آرٹیکل 9 (3) الف، 12

114۔ 2- البقرہ: 124.

115۔ الجصاص، احکام القرآن. 69:1

116۔ الدوری، قحطان، عبدالرحمن، الشوریٰ بین النظریه والتطبیق. مطبع الامة بغداد. ط: اولیٰ 1974ء۔ ب:3۔ 11(6)45

117۔ الماوردی، ابوالحسن علی (م:۴۵۰ھ)ادب الدنیا والدین. مصر طبعه المشهد الحسینی، ط: اول ۱۳۷۱ھ۔ 1198 شوری

118۔ شیزری، المنهج المسلوک فی سیاسة الملوک. 486

119۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الرقاق، حدیث نمبر 9605

120۔ انصاری کمیشن۔ 43، 44

121۔ وفاقی کونسل مجلسِ شوریٰ سیکرٹریٹ رپورٹ پیرا نمبر ۳۸، ص ۹ (رپورٹ کا نام؟ تاریخ؟)

122۔ الدوری، الشوریٰ بین النظریه والتطبیق. ب:۳۔۱۱(۶)۴۴

123۔ شیزری، المنهج المسلوک فی سیاسة الملوک. ۴۸۶

124۔ نفس المکان

125۔ مشکوۃ شریف (مترجم) ب؛ حفظ اللسان والغیبة والشتم، حدیث نمبر 4646

126. Constitution of Pakistan,p-2

127۔ شاہ ولی اللہ، حجة الله البالغه. 45:1

128۔ نفس المکان

نوٹ:۔ حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت ہے: وقید المحبة او ثق من قید الحدید

129۔ احمد، مسند احمد، ک: باقی مسند المکثرین، ب: مسند انس بن مالک، حدیث نمبر 12489

130۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: المناقب: فی قول الله یاایها الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی. حدیث: 3495

131۔ حفظ الرحمٰن، سیوہاروی، نورالبصر فی سیرت خیرالبشر۔ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی۔ 1986ء۔ 82

132۔ ابن قتیبه، الامامة والسیاسة. مطبع الفتوح، مصر. 41

133۔ الطبری، محمد بن جریر (م:۳۱۰ھ)تاریخ الرسل والملوک (تحقیق: محمد ابو الفضل ابراهیم) ط: الرابعه دارالمعرفه، القاهره. سن ندارد. 450:3

134۔ الدارمی، السنن، ک: مقدمه، ب: الفتیا وما فیه من الشدة.

135۔ 4- النساء: 83.

136۔ الزمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوه التاویل. 216:1

137۔ البخاری، الجامع الصحیح، ک: الاعتصام بالکتاب و السنة، ب:الاقتدا بسنن رسول اللهﷺ، حدیث: 7286

138۔ نفس المکان

139۔ امین احسن، اسلامی ریاست۔ 133

140۔ 24- النور: 55.

141۔ 3- آلِ عمران: 159.

142۔ ابن ابی شیبة، ابوبکر عبدالله (م:۲۳۵ھ) مصنف ابن ابی شیبة، ادارۃ القرآن، کراچی۔ 1985ء۔ 319:3

143۔ *حسن ابراہیم حسن، مسلمانوں کا نظم مملکت۔ ترجمہ: مولوی علیم اللہ، دارالاشاعت، کراچی۔* 1975ء۔ 172

144۔ *حسن ابراہیم، نظم مملکت۔* 173۔

145۔ *نفس المکان*

146۔ 8- الانفال: 63-62.

147۔ *حسن ابراہیم، نظم مملکت۔* 173

148۔ 42- الشوریٰ: 13.

149۔ البخاری، ک: الحدود، ب: الاعتراف بالزنی، حدیث نمبر6829

150۔ الطبری، تاریخ الرسل والملوک. 34:5؛ ابن کثیر، البدایه والنهایة. 145:7، 146

151۔ المسلم، الجامع الصحیح، ک: الامارة، ب: حکم من فرق امر المسلمین و هو مجتمع، حدیث نمبر1852

152۔ ابو یعلی، قاضی، محمد بن الحسین، الفراء (م:۴۵۸ھ) الاحکام السلطانیه (تحقیق محمد حامد) ن: شرکة مکتبه و مطبعة مصطفیٰ البابی الحلبی القاهره، مصر. ط: ثانیہ۱۳۸۶ھ۔ 23

153۔ دیکھئے، ابن هشام، السیرة النبویه (امر سقیفه بنی ساعده) ابن اثیر، تاریخ الکامل. 123:2، 126؛ ابن کثیر، البدایة والنهایة. 245:5

154۔ ابن هشام، السیرة النبویة. 660:4

155۔ *نفس المکان*

156۔ *شاہ اسماعیل، منصب امامت۔* 58

157۔ *شاہ ولی اللہ، ازالة الخفاء.* 23

158۔ ابن هشام، السیرة النبویة. 660:4

159۔ *نفس المکان*

160۔ ابن کثیر، البدایة والنهایة. 301:6؛ ابن هشام، السیرة النبویة. 661:4

161۔ ابن سعد، الطبقات الکبری. 199:3؛ الطبری، ابن جریر، تاریخ الرسل. 352:2

162۔ ابن اثیر، اسد الغابة. 68:4، 69؛ الطبری، تاریخ الرسل. 352:2، 355

163۔ الجوزی، ابوالفرج، عبدالرحمن (م:۵۹۷ھ) مناقب عمرؓ (تحقیق و ترتیب ابراهیم) ن: دارالباز للنشر و التوزیع بمکة المکرمة، ط: سوالی، ۱۴۰۰ھ. مناقب عمرؓ

164۔ قاضی ابویوسف، کتاب الخراج. 122

165۔ الطبری، تاریخ الرسل. 462:3

166۔ *عبدالحق، شیخ، محدث، مدارج النبوۃ (فارسی) مطبع نول کشور کان پور۔ دیکھئے،* 727:2 تا 737

167۔ الدارمی، السنن، مجموعه ابواب فی المقدمه، ب: الفتیا وما فیه من الشده. حدیث نمبر 167

168۔ قاضی ابویوسف، کتاب الخراج. 25

169۔ ابن قیم، الجوزیه، ابوعبدالله، محمد بن ابی بکر (م:۷۵۱ھ) اعلام الموقعین عن رب العالمین. مطبعة السعادة،

مصر. ط: اولیٰ ۱۳۷۴ھ/ 1955ء. 84:1

170۔ ایسا جملہ کسی کو تنبیہ اور غلطی درست کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

171۔ عبدالحق، مدارج النبوۃ، 67:2

172۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ. 132:1

173۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃالخفاء. 24:1

174۔ ابن کثیر، البدایۃ و النھایۃ. 145:7

175۔ ابن ھشام، ابو محمد، عبد الملک، المعافری (م:۲۱۳ھ) السیرۃ النبویۃ (تحقیق: المصطفیٰ السقاء ابراھیم الابیاری و عبد الحفیظ شلبی) مکتبہ و مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی مصر. ط: ثانیہ ۱۳۷۵ھ، 373:2؛ ابن اثیر

176۔ ابن جریر، تاریخ الرسل. 35:5

177۔ ایضاً۔

178۔ ابن اثیر، اسد الغابہ. 381:3

179۔ ابن کثیر، البدایۃ و النھایۃ. 213:7

180۔ ابن کثیر، البدایۃ و النھایۃ. 145:7

181۔ حامد الانصاری، نظام حکومت۔ 254

182۔ ابن قتیبہ، الامامہ و السیاسۃ. مطبعۃ الفتوح. مصر. 41

183۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃالخفاء. 26:1

184۔ شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ. 94

185۔ سنن دارمی، مقدمہ، ب: اتباع النسۃ، حدیث نمبر95

186۔ الترمذی، السنن، ابواب المناقب، مناقب ابوبکر صدیقؓ، حدیث نمبر 3663ھذاحدیث حسن صحیح

187۔ ابن تیمیہ، احمد بن عبد الحلیم (م:۷۲۸ھ) مجموع فتاوٰی (جمع عبد الرحمن ابن قاسم وابنہ) الریاض. ط: اولیٰ ۱۳۸۶ھ. 400:4. 99:4

188۔ تقی امینی، مولانا، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت۔الفیصل ناشران، غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور۔2007۔ 18

189۔ الشامی، ابن عابدین، محمد امین (م:۱۲۵۲ھ) عقود رسم المفتی. مکتبہ رحمانیہ، اقراسنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ س۔ن۔ 40

190۔ مقدمہ ابن خلدون۔ 197:1

191۔ زیبا افتخار، مقالات حمید اللہ۔ 17، 18

192۔ محمد اسد، اسلامی مملکت۔ 70، 71

193۔ اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو (بانگ درا)، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طیب اقبال پرنٹرز لاہور، س 1997ء، ص 291

194۔ اقبال، علامہ، کلیات اقبال اردو (ارمغانِ حجاز)، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طیب اقبال پرنٹرز لاہور، س 1997ء، ص 704

195۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ۔ 114:1

☆

www.rahimia.org

منظومات

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ
کے وصال پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا عربی مرثیہ

(سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے بانی حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ کا وصال ۲۵/ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ / 28/ جنوری 1919ء کو ہوا۔ اس موقع پر دارالعلوم دیوبند میں ۱۰/ جمادی الثانی ۱۳۳۷ھ / 13/ مارچ 1919ء بروز جمعرات کو ایک تعزیتی جلسہ ہوا، جس میں شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت علامہ مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیریؒ (1875ء - 1934ء) نے حضرت اقدس عالی رائے پوریؒ کے لیے یہ منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند (بابت ماہ رجب ۱۳۳۷ھ/ اپریل 1919ء) میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی دیوبندیؒ (1882ء - 1955ء) ''یادِ رفتگان'' کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:

''ٹھیک ساڑھے سات بجے ... جلسہ کی کارروائی کا افتتاح یوں ہوا کہ:

اوّلاً: حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب (عثمانی) مدظلہٗ (مددگار مہتمم) نے جلسے کی غرض بیان کی اور مولانا رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر اوصاف بیان کیے۔ اور اس کے بعد نوحۂ جاہلیت اور ''ثناء علی الأموات'' (مرنے والوں کی تعریف) میں لطیف فرق بیان فرما کر فرمایا کہ: ''آج ہم جو کچھ بیان کریں گے، وہ اس ارشادِ نبویؐ کی تعمیل ہوگی، جس میں مسلمانوں کے مرکر جدا ہوجانے والوں کا ذکرِ خیر کے ساتھ کرنے کا مامور (حکم) کیا گیا ہے۔ یہ نوحۂ جاہلیت یا نعیٔ حرام (جاہلیت کا رونا پیٹنا) نہیں ہے۔'' اس کے بعد آپ نے بعض شواہد پیش فرمائے اور اپنی تقریر کو ختم کیا۔

مددگار مہتمم (حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ) صاحب کے بعد مولانا العلّام حضرت مولوی سیّد انور شاہ صاحب قائم مقام مدرّس اوّل دارالعلوم دیوبند نے ایک مختصر مگر جامع تقریر کی۔ مولانا (شاہ عبدالرحیم) رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ان اوصاف کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو روزِ روشن سے زیادہ عیاں تھے، آپ نے ان خواص و خصائص کا ذکر بھی فرمایا کہ جن میں مولانا (رائے پوریؒ) اپنے دوسرے اقران (ہم عصروں) سے بالکل ہی ممتاز تھے۔ انھی خواص میں فراست، ذکاوت، اصابتِ رائے، مناقشات ومجادلات سے تحرُّز (لڑائی جھگڑوں سے پرہیز)، مردم شناسی، ہر شخص کی اس کے مرتبہ کے موافق قدر دانی بھی تھی۔

(حضرت علامہ انور) شاہ صاحب مدظلہٗ کی اس تقریر پر حاضرین کو اس اجمالی حزن وغم کی تفصیل معلوم ہوئی، جس کا اثر ان کے دلوں پر ہو چکا تھا۔ اور جس ناقابلِ تلافی نقصان کا اذعان (یقین) وہ کر چکے تھے، اس کو اس وقت اچھی طرح سمجھے۔ اور سچ یہ ہے کہ آنسوؤں کے چشمے اسی وقت سے آنکھوں سے نکلنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ اس

کے بعد آپ نے بھی نعی (موت پر رونے دھونے) اور اموات کے ذکرِ خیر میں فرق بیان کیا۔ اکابرِ اُمت کے اشعار پڑھے کہ جن میں مرنے والوں پر حزن و ملال کا اظہار کیا گیا تھا اور ان کے اوصاف بیان کیے گئے تھے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: ''اگر کسی کے مرنے پر اس کے واقعی اوصاف ذکر کیے جاویں تو یہ ہرگز ممنوع نہیں ہے، لیکن مبالغاتِ شعریہ اور حدودِ شرع سے متجاوز الفاظ بے شک لائق احتراز ہیں۔'' اس کے بعد آپ نے اپنی عربی نظم سنائی، جو کہ صرف ایک ہی رات میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں لکھی گئی تھی''۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کو عربی ادب پر جس قدر عبور حاصل تھا، یہ مرثیہ حضرتؒ کے ادبی ذوق کو بڑی خوب صورتی سے واضح کرتا ہے۔ صرف ایک رات میں ہی حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ مرثیہ تحریر فرمایا ہے۔

علمِ عروض کے نقطہ نظر سے اس مرثیے کی بحر طویل ہے۔ اس کا وزن ہے:

فَعُوْلُنْ ، مَفَاعِيْلُنْ ، فَعُوْلُنْ ، مَفَاعِيْلُنْ فَعُوْلُنْ ، مَفَاعِيْلُنْ ، فَعُوْلُنْ ، مَفَاعِيْلُنْ

اس مرثیے کے اکثر شعروں کے وزن میں ''زحافات'' میں سے ''قبض'' ہوا ہے۔ یعنی فَعُوْلُنْ کے پانچویں ساکن کو حذف کر کے ''فَعُوْلُ'' کے وزن پر لایا گیا ہے۔ اسی طرح مَفَاعِيْلُنْ میں بھی ''قبض'' کر کے ''مَفَاعِلُنْ'' لایا گیا ہے۔ یہ ''قبض''، ''عروض'' (پہلے مصرعے کا آخری وزن) اور ''ضرب'' (دوسرے مصرعے کا آخری وزن) میں زیادہ تر ہے اور ''حشو'' (مصرعوں کے بقیہ اوزان) میں اکثر ہوا ہے۔

اس مرثیے کا قافیہ ''عینیہ'' ہے، یعنی اس کا ''حرفِ روی'' عین ہے۔ اس میں ''حرفِ خروج'' اور ''حرفِ ردیف'' نہیں ہے۔ صرف ''حرفِ وصل'' ہے۔ قافیہ ''مطلقہ'' (حرفِ روی متحرک) ہے۔ اور ''متدارک'' ہے، یعنی دو ساکنوں کے درمیان دو حرف متحرک ہے۔ پہلے شعر کی تقطیع درجِ ذیل ہے:

أَ مِـــم مـــا دَهَـــاکَ الأم رُ تَـــذْرِیُ وَ تَـــدْمَــعُ

فُعُوْلُنْ مَفَاعِيْلُن فُعُوْلُنْ مَفَاعِلُن

وَ هَـــلْ فِـــیُ بُـــکَـــیً مِّـــنْ مَفْ زَعٍ لَ کَ مَـــفْـــزَعُ

فُعُوْلُنْ مَفَاعِيْلُن فُعُوْلُ مَفَاعِلُن

یہ مرثیہ کل 39 اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ادب پارہ حضرت شاہ صاحبؒ نے صرف ایک رات میں موزون کیا ہے۔ اس مرثیے کا ترجمہ دارالعلوم دیوبند کے ادبِ عربی کے استاذ اور شیخ حضرت مولانا محمد اعزاز علیؒ نے کیا تھا، جنھیں ''شیخ الادب'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مولاناؒ نے اسے ترجمہ کر کے ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند کے دو شماروں: بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ مطابق ماہ اگست 1920ء اور بابت ماہ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق ماہ ستمبر 1920ء میں طبع کیا تھا۔ ٹھیک تقریباً سو سال بعد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا یہ تعزیتی منظوم کلام اور عربی ادب کا شاہکار مرثیہ قارئینِ مجلّہ ''شعور و آگہی'' کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ مدیرِ اعلیٰ)

مرثیه

لسبّاق الغايات فى العلوم النّقلية و العقليّة العلامة اللّوذعى اليلمعى

المولىٰ السّيّد محمّد أنور شاه الكشميرىؒ

لا زالت شموسُ فيوضه بازغةً و نجومُ علومه طالعةً

(١)

أَ مِمّا دَهَاکَ الأمرُ تُذْرِیْ وَ تَدْمَعُ
وَ هَلْ فِیْ بُکیً مِّنْ مَفْزَعٍ لَکَ مَفْزَعُ

کیا اس حادثۂ جان کاہ کے پیش آ جانے کی وجہ سے تیرے آنسو بہہ رہے ہیں؟ اور کیا ملجا و ماویٰ کے ہاتھ سے نکل جانے پر، رونے سے کوئی ٹھکانا مل سکتا ہے؟

(٢)

وَ قَدْ عِیْلَ صَبْرِیْ کَیْفَ وَ الْجِذْعُ مَیِّتًا
إِذَا فَاتَهُ ذِکْرٌ یَحِنُّ و یَجْزَعُ

میں صبر کے اختیار سے بالکل باہر ہوگیا ہوں۔ اور جب کہ خشک کھجور کا ایک تنا سرورِ عالمؐ کے ذکر سے محروم ہو کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے تو پھر میں کس طرح صبر کرسکتا ہوں

(٣)

وَ شَطَّ مَزَارٌ بَعْدَ مَا کُنْتُ اَحْتَظِیْ
فَصَبْرًا وَ إنَّ الْأَمْرَ أَدْهٰی و أَفْظَعُ

حضرت شیخ رحمہ اللہ کی زیارت سے اکثر شرف حاصل ہوتا رہتا تھا، لیکن اب یہ شرف کوسوں دور ہے تو

www.rahmia.org

اب کسی نہ کسی طرح صبر کرنا ہی چاہیے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حادثہ نہایت جان کاہ حادثہ ہے۔

(٤)

تُکَلِّفُنِیْ مَا لایَدانِ لِحَمْلِہٖ

وَ لَیْسَ مَرَدٌّ لِلْقَضَاءِ و مَدْفَعُ

میں ناقابلِ برداشت صبر کا بوجھ اٹھانے پر مجبور ہوں۔

اور خداوندِ عالَم کے حکم کو کوئی شخص بھی ردّ نہیں کرسکتا ہے۔

(٥)

أَ تَجْھَلُ خَطْبِیْ لَا أبًا لَکَ أَوْ تَرٰی

خَلِیًّا رَخِیَّ الْبَالِ لَا یَتَوَجَّعُ

خدا کے بندے! کیا اس مصیبتِ عظیمہ سے، جو مجھ پر پڑی ہے، تو غافل ہے؟ اور کیا تو نے کوئی ایسا شخص بھی دیکھا ہے، جو کہ محبت سے خالی اور نرم دل ہو، مگر کبھی غمگین نہ ہوا ہو۔

(٦)

وَ مَنْ ثَمَّ مِثْلُ الشّیخ یَھْدِیْ وَ یَھْتَدِیْ

وَ مَوْلٰی الْوَرٰی عَبْدِ الرَّحِیْمِ فَأَقْنَعُ

اب دنیا میں آقائے عالم حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم (رائے پوری) رحمہ اللہ کی طرح ہدایت کرنے والا اور ہدایت یافتہ کون ہے کہ جس پر میں قناعت کرسکوں۔

(٧)

اَعِدْ ذِکْرَ نُعْمَانٍ لَّنَا أنَّ ذِکْرَہٗ

ھُوَ الْمِسْکُ مَا کَرَّرْتَہٗ یَتَضَوَّعُ

نعمان (یعنی حضرت شیخ رائے پوری قدس سرہٗ) کا ذکر بار بار کرو۔ کیوں کہ ان کا ذکر مشک کی طرح ہے۔ جس قدر اس کو پیسو گے ، اسی قدر زیادہ خوشبو دے گا۔

www.rahimia.org

(۸)

وَلِيٌّ رَضِيٌّ سِيْرَةً أَوْ سَرِيْرَةً
صَفِيٌّ وَفِيٌّ ثُمَّ أَرْضٰى وَ أَطْوَعُ

آپؒ خدا کے دوست تھے۔ پسندیدہ اَخلاق والے تھے۔ آپؒ کے اَخلاق و عادات سبھی عمدہ تھے۔ آپؒ صاف باطن، وفادار، احکامِ خداوندی پر بالکل راضی اور خوشی سے اُن کی اطاعت کرنے والے تھے۔

(۹)

مَنَارِ الْهُدٰى مَعْرُوْفُهٗ و جُنَيْدُهٗ
مَقَامًا وَ حَالاً صَادِقُ الْوَعْدِ اَنْصَعُ

آپؒ نشانِ ہدایت تھے ، مقام اور حال کے اعتبار سے ہدایت میں آپؒ حضرت معروف کرخیؒ اور حضرت جنید بغدادیؒ کے ہم پلہ تھے۔ وعدے کے سچے اور بااخلاص تھے۔

(۱۰)

لَهٗ خُطْوَةٌ اَفْضَتْ إِلٰى غَايَةِ الْعُلٰى
و أُخْرٰى علٰى الإِرْشَادِ أَمْضٰى و أَسْرَعُ

آپؒ کا ایک قدم تو مدارجِ علیا کے منتہیٰ پر پہنچ چکا تھا اور دوسرا قدم مخلوق کی ہدایت کے لیے نہایت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔

(۱۱)

جِنَاحٌ لَهٗ بَسْطٌ إِلٰى طَيِّ مَنْزِلٍ
وَ آخَرُ مَخْفُوْضٌ لَدَى النَّاسِ يَخْشَعُ

آپؒ کا ایک بازو (باطن) مقاماتِ عالیہ کو طے کرنے میں مصروف تھا اور دوسرا بازو (ظاہر) مخلوق کے سامنے انکسار اور تواضع کے طور پر جھکا ہوا تھا۔

www.rahimia.org

(۱۲)

وَ مِنُ کَوُثَرٍ یَرُوِیُکَ ذَوُقًا وَ مَشُرَبًا
وَ مِنُ سُنَّةٍ یَّهُدِیُکَ وَ الصُّبحُ یَصُدَعُ

آپؐ کے کلماتِ مبارک نہرِ کوثر کے پانی کی طرح مزہ اور پینے میں تھے اور تشنگانِ ہدایت کو سیراب کرتے تھے۔ اور سنتِ نبویہ کے طریقوں کی تعلیم کر کے ہدایت کرتے تھے اور صبح صادق کی طرح سے جہل کی ظلمت دور کرتے تھے۔

(۱۳)

وَ أَنُفَاسُهُ کَالنَّشُرِ تَشُفِیُ و تَشُتَفِیُ
وَ أَخُلاقُهُ کَالصُّبُحِ أَوُ تِلُکَ أَوُسَعُ

آپؐ کے انفاسِ مبارک خوشبو کی طرح مہکتے تھے اور مریضانِ ضلالت کو کامل شفا عطا کرتے تھے اور آپؐ کے اَخلاق صبح کی طرح مُنوّر تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ روشن تھے۔

(۱٤)

یُوَاسِیُ کَسِیُرَ الُبَالِ یَشُفِیُ کَلِیُمَهُ
وَ بَائِسَ قَلُبٍ مَا دَرٰی کَیُفَ یَصُنَعُ

آپؐ شکستہ دلوں کی غم خواری اور زخمی دلوں کا علاج کرتے تھے اور اُس مصیبت زدہ کی امداد کرتے تھے، جس کو شدتِ اندوہ (غم) کی وجہ سے یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ اس مصیبت سے رہائی کا کیا طریقہ اختیار کرے۔

(۱۵)

وَ دَعُوَتُهُ فِیُ أزُمَةِ الُمَحُلِ وَ الرَّدٰی
وَ قَلُبِ رِدَاءٍ اِنَّ حَالاً سَیَرُجِعُ

سخت قحط اور وبا کے زمانے میں آپؐ کی دعائیں یا ''قلبِ ردا'' (چادر بدلنے)

کا مسنون طریقہ حالات کے بدل جانے کا ایک یقینی نشان تھا۔

(١٦)

فَسُبْحَانَ مَنْ أَعْلٰی مَقَامًا عِبَادَهُ
قَوَادِمُهُمْ فِی النُّوْرِ أَوْ تِلْکَ أَرْفَعُ

وہ خدا بزرگ و برتر ہے ، جس نے اپنے بندوں کو مراتبِ عالیہ عطا فرمائے۔ ان پر نورِ خداوندی محیط ہے ، بلکہ وہ اس سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں۔

(١٧)

أقَامَهُمْ فِیْ مَقْعَدِ الصِّدْقِ مَرَّةً
وَ أُخْرٰی بِجَوْفِ اللَّیْلِ وَ اللَّیْلُ أسْمَعُ

خداوندِ عالم نے ان کو توفیق عطا فرمائی کہ وہ دن کو مجالسِ خیر میں تشریف فرما ہوں۔ اور کبھی اس امر کی توفیق دی کہ وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں مانگیں اور فی الحقیقت رات کی دعائیں زیادہ قبول ہوا کرتی ہیں۔

(١٨)

تَرٰی هَدْیَهم فی الحُبّ وَ الاُنسِ ثَابِتًا
وَ وَقْتُهُمْ لِلْفَرْقِ وَ الْجَمْعِ یَجْمَعُ

تم دیکھو گے کہ محبتِ خداوندی میں ان کو ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا ہے اور اُن کا وقت ، ''فرق'' اور ''جمع'' کا جامع ہے۔

(١٩)

وَ ثَمَّ عِبَادٌ فِی الْفَنَاءِ بَقَاءُهُمْ
حَیَاتُهُمْ فِی الْمَوْتِ وَ الشَّیْخُ أَجْمَعُ

خداوندِ عالم کے کچھ مقرب بندے ایسے بھی ہیں، جن کی بقا فنا میں ہے

اور ان کی حیات موت میں، مگر حضرت رائے پوریؒ ان تمام اوصاف کے جامع تھے۔

(۲۰)

أَقَامَ عَلٰی مَرمٰی أَبِیُ ذَرٍّؓ دَهْرَهٗ
وَ کَانَ أبَا وَقْتٍ مُطَاعٌ و مِطْوَعٌ

(مولانا رائے پوری رحمہ اللہ) نے اپنی تمام عمر حضرت ابوذر غفاریؓ کے طریقے کے موافق گزاری اُن کے اوقات بے کار ضائع نہ ہوتے تھے، تمام مخلوق اُن کی مطیع تھی اور وہ خداوندِ عالم کے مطیع تھے۔

(۲۱)

مَعَارِفُ مَعْرُوْفٍؒ وَ آدَابُ حَاتِمٍ
سَلامَةُ سَلْمَانٍؓ فَهَلُ تِلْکَ تَرْجِعُ

مولانا رائے پوریؒ میں حضرت معروف کرخیؒ کے سے اوصاف تھے اور حاتم طائی کی سی سخاوت، اور سلمان فارسیؓ کی سی سلامت روی۔ تو کیا اس قسم کے جامع صفاتِ حمیدہ حضرات ہم کو اس کے بعد بھی دیکھنے کو مل سکیں گے؟

(۲۲)

وَ هَلُ تَسْمَحُ الدُّنْیَا بِهَدْیٍ کَهَدْیِهٖ
وَ مَا أَنُ أَرٰی دَهْرًا یُوَاتِیُ و یَنْصَعُ

اور کیا زمانہ ایسے شخص کو ہمارے سامنے لا سکے گا، جس کی عادات مولانا رائے پوری رحمہ اللہ کی سی ہوں۔ میرے خیال میں تو یہ زمانے سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔

(۲۳)

خَلِیْفَةُ حَقٍّ نَوْلٍ صِدْقٍ لِشَیْخِنَا
رَشِیْدِ الْبَرَایَا فَائت شَأوًا تُرَفِّعُ

حضرت قطب العالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرہٗ

کے آپؒ سچے خلیفہ اور بیش بہا عطا تھے۔

(٢٤)

مُقِيمٌ عَلٰى ذِكْرٍ وَ فِكْرٍ زَمَانَهُ
قَرِيْرًا بِقُرْاٰنٍ يُنَاجِیْ وَ يَسْمَعُ

مولانا رائے پوریؒ رات دن ذکرِ خداوندی اور فکر میں مصروف رہا کرتے تھے۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کے ذریعے سے خداوندِ عالم سے باتیں کرتے اور سنتے اور خوش دل رہا کرتے تھے۔

(٢٥)

فَيَا عَجَبًا كَيْفَ اسْتَطَاعَ عُلُوْمَهُ
وَ إِنَّ جِبَالاً لَا تَزَالُ تَصَدَّعُ

بہت زیادہ قابلِ تعجب یہ امر ہے کہ انھوں نے قرآنی معارف کو باوجود یہ کہ ان سے پہاڑوں کے جگر بھی پارہ پارہ ہوجاتے ہیں، کیونکر حاصل کرلیا

(٢٦)

وَ يَا عَجَبًا مِنْ رَاسِخِ الْحَالِ ثَبْتِهٖ
عَلٰى قَدَمٍ كَالطَّوْدِ أَرْسٰى وَ أَوْقَعُ

آپؒ کے حالات راسخ تھے اور آپؒ کو درجۂ ثبات حاصل تھا۔ شریعت کے راستے میں آپؒ کے قدم بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔

(٢٧)

يُفَسِّرُ هَدَى الْوَاصِلِيْنَ طَرِيْقُهُ
وَ يَشْرَحُ مَا مِنْ مَنْبَتِ الصِّدْقِ يَنْبَعُ

مولاناؒ کا طریقہ ان لوگوں کے طریقے کو بتاتا تھا، جو واصل الی اللہ ہوچکے ہیں اور خداوندی خزانے سے جو کچھ ملتا تھا، اسی کی شرح کرتے تھے۔

(۲۸)

حَظِیْرَۃُ قُدْسٍ هَمُّهٗ أَوْ أَهَمُّه
وَ مَا لِلتَّوَانِی إنْ تَرَ الرَّبَّ یَرْفَعُ

خداوندِ عالم کی بارگاہ تک پہنچنا ہی اُن کا مقصودِ اصلی تھا۔ یا یوں کہو کہ ان کے تمام مقاصد میں سے سب سے زیادہ ان کے نزدیک ضروری تھا۔ اور اگر دیکھو کہ خداوندِ عالم خود ہی کسی کو مراتبِ رفیعہ عطا فرماتا ہے تو پھر مراتب کے حاصل کرنے میں کاہلی (سستی) کرنا مناسب نہیں۔

(۲۹)

أَنِیْسٌ بِذِکْرِ اللّٰہِ فِیْ طُوْلِ عُمْرِہ
سَمِیْرٌ بِخَطْبِ الْقَوْمِ کَیْفَ یُرَقَّعُ

مولانا رحمہ اللہ کو تمام عمر ذکرِ خداوندی ہی سے دلچسپی رہی اور شب و روز مسلمانوں کے تذکرے اس غرض سے آپؒ کی خدمت میں کیے جاتے تھے کہ مسلمانوں کی اصلاح کا کوئی طریقہ تجویز ہو سکے۔

(۳۰)

مَتٰی تَأْتِہٖ تَعْشُوْ إلٰی نُوْرِ صَدْرِہٖ
تَجِدْ نُوْرَہٗ کَالصُّبْحِ أَوْ ذَاکَ أَصْدَعُ

جب تم ان کے پاس ان کے انوارِ سینہ سے مستفیض ہونے کی غرض سے جاؤ تو تم کو معلوم ہوگا کہ ان کا نور صبح صادق کی طرح روشن، بلکہ اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔

(۳۱)

یَقُوْمُ بِأَمْرِ اللّٰہِ فی کلِّ حَالَۃٍ
وَ فِیْ رَوْضَۃِ الْجَنّاتِ یَرْعٰی و یرتَعُ

احکامِ خداوندی کی مراعات آپ ہر حالت میں کرتے تھے۔ اور اب جنت کے باغوں میں آرام فرما رہے ہیں۔

(۳۲)

تَحُلُّ صِعَابَ الأَمْرِ أَنُفَاث رُوُعِهٖ

وَ خَفُضُ جِنَاحٍ كَيُفَ مَا جِئُتَ يَخُضَعُ

ان کے انفاسِ قلب بڑے بڑے لا ینحل (نہ حل ہونے والے) اُمور کی گرہ کھول دیا کرتے تھے۔ وہ اس قدر منکسر المزاج تھے کہ تم کسی شان سے ان کے پاس جاؤ، اُن کے انکسار میں فرق نہ آتا تھا۔

(۳۳)

أَمِيُرُهُمُ فِيُمَا أَتٰى وَ سَمِيُرُهُمُ

وَ غُرَّتُهٗ تَجُلُوُ الظَّلَامَ وَ تَدُفَعُ

مسلمانوں کے تمام حوائج میں وہ ان کے سالارِ قافلہ ہوتے تھے اور ان کی چمکتی ہوئی پیشانی کا نور معاصی (گناہوں) کی تاریکی کو بالکل دور کردیتا تھا۔

(۳٤)

فَمَنُ بَعُدَهٗ لِلنَّاسِ وَ الُهَدُيِ وَ الُهُدٰى

وَ مَنُ ذَا يُرَبِّى الُخَلُق وَ الُأَمُرُ أَسُرَعُ

اب مولاناؒ کے بعد لوگوں اور احکامِ شرعیہ کا کون حامی رہے گا اور اب ایسا کون ہے، جو کہ مخلوق کی تربیت کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ امرِ خداوندی بہت ہی جلد پورا ہوکر رہتا ہے۔

(۳۵)

فَلِلّٰهِ دَرُّ الُحُبِّ حَتّٰى أَقَامَنِىُ

عَلٰى غُصَصِ الأَيَّامِ أَرثٰى وَ أَدُمَعُ

پروردگارِ عالم اس محبت کا بھلا کرے، جو مجھ کو مولاناؒ سے ہے کہ مولاناؒ کی وفات کے مصائب کے باوجود میں اس وقت کھڑے ہوکر ان کے مرثیہ پڑھنے اور ان پر آنسو بہانے کے قابل ہوں۔

(۳۶)

وَ أَرْثِی جَمَالاً أَوْ كَمَالاً وَ سِيْرَةً
وَ زُهْدًا وَ حِلْمًا ثُمَّ عِلْمًا فَشِيّعُوْا

اور میں مولاناؒ کا مرثیہ تو کیا پڑھ رہا ہوں، بلکہ فی الحقیقت جمال، کمال، عادات، زہد، حلم اور علم پر رو رہا ہوں۔ اب ان سب کو اپنے سے جدا ہونے والا سمجھو۔

(۳۷)

وَ مَاثَمَّ إِلَّا عِبْرَةٌ بَعْدَ عِبْرَةٍ
كَذَاكَ اللَّيَالِیُ لَا تَوَانٰی وَ تَصْنَعُ

اور اب اس دنیا میں تو عبرت پر عبرت کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔ کیوں کہ زمانہ تو کسی وقت اپنے کاموں سے غافل رہتا ہی نہیں ہے۔

(۳۸)

وَ لَمَّا حَسِبْتُ الْعَامَ عِنْدَ رَحِيْلِهٖ
فَجَاءَ دُعَاءٌ يُّسْتَجَابُ وَ يُسْمَعُ

مولاناؒ کے وصال کے وقت جب میں نے سنِ تاریخ کا خیال کیا تو اسی وقت میرے قلب میں یہ دعائیہ کلام پڑے، جو کہ یقیناً مقبول ہوچکے ہیں۔

(۳۹)

''سَقٰی اللّٰهُ مَثْوَاهُ بِأَرْعٰی كَرَامَه''
ے ۳ ۳ ا ھ
فَسَقْیٌ وَ رَعْیٌ مِنْهُ أولٰی وَ أَنْفَعُ

خداوندِ عالم ان کی جائے اقامت پر اپنی رحمت کی بارشیں نازل فرماتا رہے۔ کیوں کہ مخلوقِ خداوندی نے مولاناؒ کی ذات سے بہت زیادہ منافع حاصل کیے ہیں۔

☆

www.rahima.org

قرآن حکیم کے علوم ؛ آپ ﷺ کی سیرتِ مقدسہ کے بنیادی اَخلاق ہیں

''یاد رکھیے! نبی اکرمؐ کی سیرت کیا ہے؟ یہ سوال حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحابہؓ نے کیا۔ عائشہ صدیقہؓ اُمت کی معلّمہ ہیں۔ اپنے حجرہ مبارکہ میں حضوؐر کے بعد پچاس سال انھوں نے تعلیم و تربیت کی ہے۔ پردے کے پیچھے حضرت عائشہ صدیقہؓ بیٹھ جاتیں۔ اور مسجدِ نبویؐ صحابہؓ سے بھری ہوتی۔ صحابہؓ نے سوال کیا ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کہ حضوؐر کی سیرت کیا ہے؟ اَخلاق کیا تھے؟ تو عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ''**کان خُلُقه القرآن**''، ان کا خُلق اور اُن کا اَخلاق اور اُن کی سیرت قرآن ہے۔ قرآن اگر چلتا پھرتا دیکھنا ہو تو وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اس سے بڑھ کر سیرت بیان کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں کہ قرآن کی عملی تصویر حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پچاس سال تعلیم دی ہے۔ وہ فقیہہ ہیں۔ مجتہد ہیں۔ صحابہؓ کی بہت ساری غلطیوں کی اصلاح کی۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک حدیث بیان کردی، حضرت عائشہؓ کو پتہ چلا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابن عمرؓ نے بات نہیں سمجھی۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے۔ اور پھر ایک دوسری حدیث حضور کی بیان کر کے مسئلے کو حل کردیا۔ علما جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے مسئلہ ہیں، جن میں عائشہ صدیقہؓ نے اصلاح کی ہے۔ علم اور تعلیم کی وہ اعلیٰ ترین حالت جو نبی اکرمؐ نے صحابہؓ اور صحابیات کو منتقل کی، اُس کا عملی نمونہ مردوں میں چار صحابہ اور عورتوں میں عائشہ صدیقہؓ اور اُم سلمہؓ ہیں کہ جن کی فقاہت، جن کی تعلیم و تربیت سے سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ کی تربیت ہوئی ہے۔ اگلے دور میں تابعینؒ کی تربیت ہوئی ہے''۔

(سماجی تشکیلِ نو کے اصول اسوہ حسنہ کی روشنی میں، ص: 161-162)

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

January - June,2020 Vol.12 Issue,1-2 Regd.370-S

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org

info@rahimia.org /rahimiainstitute